خلافت و جمہوریت

مع جوابات

سوالنامہ وفاقی شرعی عدالت ۱۹۸۹ء

سوالنامہ اسلامی نظریاتی کونسل ۱۹۸۱ء

مولانا عبدالرحمٰن کیلانیؒ

مکتبۃ السلام۔ سٹریٹ ۲۰ وسن پورہ لاہور

نام کتاب: خلافت و جمہوریت

مصنف: مولانا عبدالرحمان کیلانی ؒ

طبع ششم: فروری 2002

تعداد: 2200

زیر سرپرستی: ڈاکٹر حبیب الرحمان کیلانی

زیر اہتمام: پروفیسر نجیب الرحمان کیلانی فون: 7844157

ناشر: ڈاکٹر حافظ شفیق الرحمان کیلانی۔ انجینئر حافظ عتیق الرحمان کیلانی

مطبع: اُحد پرنٹنگ پریس 50 لوئر مال لاہور

قیمت: 120 روپے

ڈسٹری بیوٹر
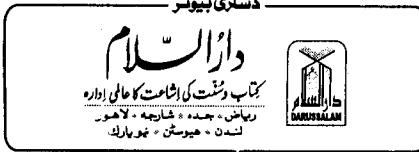
دارالسلام

کتاب و سنت کی اشاعت کا عالمی ادارہ

ریاض ۔ جدہ ۔ شارجہ ۔ لاہور

لندن ۔ ہیوسٹن ۔ نیویارک

لوئر مال: 50 لوئر مال نزد ایم ۔ اے ۔ او کالج لاہور فون: 7232400 - 7240024 042

فیکس: 7354072 ای میل: darussalampk@hotmail.com

اردو بازار: غزنی سٹریٹ' اردو بازار' لاہور فون: 7120054 042

فیکس: 7320703

خلافت و جمہوریت

مع جوابات

سوالنامہ وفاقی شرعی عدالت ۱۹۸۹ء

سوالنامہ اسلامی نظریاتی کونسل ۱۹۸۱ء

مولانا عبدالرحمن کیلانی رحمہ اللہ

مکتبۃ السلام۔ سٹریٹ ۲۰ وسن پورہ لاہور

دیباچہ طبع اوّل

سببِ تالیف

۱۹۷۰ئہ میں ہمارے ملک پاکستان میں یحییٰ خان کے دورِ حکومت میں جو انتخابات ہوئے اس میں پیپلز پارٹی نے بھرپور حصہ لیا تھا۔ اس پارٹی کے مقبول ترین نعرہ کے اجزاء درج ذیل تھے :۔

۱۔ اسلام ہمارا دین ہے۔ ۲۔ سوشلزم ہماری معیشت ہے۔
۳۔ جمہوریت ہماری سیاست ہے۔ ۴۔ طاقت کا سرچشمہ عوام ہیں۔

عوام میں دینی تعلیم کے فقدان کی وجہ سے یہ نعرہ خاصا مقبول ہوگیا۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ اس نعرہ کے تمام اجزاء ایک دوسرے سے متصادم ہیں اور ہر ایک جزو دوسرے جزو کو باطل قرار دیتا ہے۔

اس بات پر تو سب مسلمان متفق ہیں کہ اسلام ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے لہٰذا اسے سیاست اور معیشت کے لیے دوسرے نظاموں سے کچھ مستعار لینے کی ضرورت نہیں ہے۔ بالفاظِ دیگر اگر ہمارا دین فی الواقعہ سوشلزم اور مغربی جمہوریت کا محتاج ہے تو پھر ہمیں یہ کھلے دل سے اعتراف کر لینا چاہیئے کہ ہمارا دین نامکمل ہے۔

پھر جس طرح اسلام ایک دین یعنی مکمل ضابطۂ حیات ہے اسی طرح سوشلزم کا دائرہ بھی معیشت تک محدود نہیں رہتا بلکہ وہ بنیادی عقائد اور سیاست کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے۔ گویا سوشلزم بھی بذاتِ خود ایک دین ہے۔ ان دونوں میں بنیادی فرق یہ ہے کہ اول الذکر کی بنیاد خدا کی حاکمیت اور آخرت میں اعمال کے جزا و سزا کے عقیدہ پر اٹھتی ہے۔ جب کہ ثانی الذکر ان عقائد کا یکسر منکر ہے۔ اخلاقیات نام کی کوئی چیز یہاں نہیں ملتی۔ مصلحتِ وقت اور حالات سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اُٹھانا ہی ان کے نزدیک اعلیٰ ترین اخلاقی قدر ہے۔

اس نعرہ کا چوتھا جزو دراصل تیسرے جزو ہی کی شرح ہے کیونکہ یہاں موجودہ دَور کی مغربی

طرز کی جمہوریت اور طرزِ انتخاب ہوگا۔ وہاں لامحالہ حاکمیت عوام ہی کی ہوگی۔ خواہ اس ملک کے آئین کے دیباچہ میں واضح الفاظ میں درج کر دیا جائے کہ "اقتدارِ اعلیٰ" کا مالک اللہ تعالیٰ ہے۔" کیونکہ حق بالغ رائے دہی، کثرت رائے کا اُصول اور پھر ایک مقررہ مدت کے بعد انتخاب، ان سب باتوں کے امتزاج سے منطقی نتیجہ یہی برآمد ہوتا ہے کہ حاکمیت عوام کی ہو۔ جیسا کہ جمہوریت کی تعریف بذاتِ خود اس حقیقت کی پوری وضاحت کر رہی ہے۔ اب اگر کوئی صاحب یہ سمجھتے ہیں یا اس بات پر ایمان رکھتے ہیں کہ ہمارا طرزِ انتخاب تو موجودہ مغربی جمہوریت کا سا ہو اور اس کے نتیجہ میں حاکمیت اللہ تعالیٰ کی تسلیم کی جاسکے گی' اس طرح سے اسلام سربلند ہو سکے گا، تو ہم اس کی سادہ لوحی یا خوش فہمی کی داد دیے بغیر نہیں رہ سکتے۔

پھر جس طرح سوشلزم کے امام خدا ناشناس اور اس کے منکر تھے اسی طرح جمہوریت کے علمبرداروں نے پہلے مذہب سے بغاوت کی راہ اختیار کی۔ پھر جمہوریت کی بنیاد ڈالی۔ جمہوریت کی ابتداء ۵۰۰ ق م میں یونان کی بعض ریاستوں میں رائج رہی لیکن اپنے گوناگوں مفاسد کی وجہ سے ناکام ہوگئی۔ چنانچہ ارسطو نے بھی اس نظام سلطنت کو بھی ناپسندیدہ نگاہوں سے دیکھا بعد ازاں یہ نظامِ سیاست دو ہزار سال سے زائد عرصہ تک اس خطۂ زمین سے معدوم رہا۔ پھر اٹھارویں صدی کے اواخر میں انقلابِ فرانس کے بعد اس کا دوبارہ احیا ہوا۔ اس تفصیل سے ہماری مُراد فقط یہ بتلانا ہے کہ سوشلزم تو خیر موجودہ زمانہ کی پیداوار ہے ہی لیکن جمہوریت کا اسلام سے کئی صدیاں پیشتر دنیا میں تجربہ ہوا اور یہ ناکام ثابت ہوئی۔ اس کے موجد اُس دور میں بھی خدا ناآشنا تھے اور آج بھی دین بیزار طبقہ ہے۔

جس طرح سوشلزم سرمایہ داری کی دوسری انتہا ہے بعینہٖ اسی طرح موجودہ جمہوریت شخصی اور استبدادی حکومت کی دوسری انتہا ہے اور ظاہر ہے کہ جب کوئی چیز اپنی انتہا کو پہنچ جاتی ہے تو فوائد کے بجائے اس کے مضر اثرات زیادہ نمایاں ہونے لگتے ہیں۔

اسلام ہر معاملہ میں اعتدال کی راہ اختیار کرتا ہے۔ جیسا کہ اس کا اپنا دعویٰ ہے:۔

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ۔ (۲/۱۴۳)

اسی طرح ہم نے تمہیں ایک متوسط اُمت بنایا تاکہ تم لوگوں پر گواہ بن سکو۔

اور حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اس کی وضاحت یوں فرمائی:۔

خَیْرُ الْاُمُوْرِ اَوْسَاطُھَا۔

یعنی ہر معاملہ میں اعتدال کی راہ ہی بہتر ہے۔
بات پیپلز پارٹی کے نعرہ کی ہو رہی تھی۔ ہاں تو جب اس نے یہ متضاد قسم کا نعرہ بلند کیا اور کہا کہ سوشلزم ہماری معیشت ہے۔ تو دین پسند سیاسی جماعتوں اور دوسرے دینی حلقوں سے ایک شور بلند ہوا کہ سوشلزم تو ایک خالص کافرانہ نظام ہے۔ اس کی "اسلامی سوشلزم"، یا "محمدی مساوات" سے تعبیر کر کے اسے مشرف باسلام کیونکر کیا جا سکتا ہے؟ اور اللہ کا شکر ہے کہ اس موضوع پر ایسا کافی لٹریچر منصۂ شہود پر آ گیا جس میں سوشلزم کو اسلام کے عین برعکس قرار دیا گیا تھا اور اس کے ابطال کے نقلی و عقلی دلائل دیے گئے تھے لہٰذا نعرہ کا یہ جزو قبولیتِ عام سے بے بہرہ ہی رہا۔ تاہم پیپلز پارٹی کے دانشوروں کی طرف سے یہ جواب ضرور دیا جاتا رہا کہ اگر محض "شورائیت" کی بنا پر (جو جمہوریت اور خلافت میں قدرِ مشترک ہے) موجودہ جمہوریت کو مشرف باسلام کیا جا سکتا ہے تو کیا وجہ ہے کہ "عفود انفاق" کی بنیاد پر (جو اسلام، سوشلزم میں قدرِ مشترک ہے) سوشلزم کو سندِ جواز عطا نہیں کی جا سکتی"۔
اب مشکل یہ تھی کہ ۱۹۴۹ء میں قرار دادِ مقاصد کی منظوری کے بعد خوش فہمی کی بناء پر اکثر دین پسند سیاسی جماعتوں نے مغربی طرزِ انتخاب کو اپنانے میں خیریت سمجھ لی۔ اس اُمید پر کہ شاید اللہ کی حاکمیت واقعی تسلیم کر لی جائے گی اور فی الواقعہ آئین سے قرآن و سنت کے منافی دفعات خارج کر دی جائیں گی۔ یہ کام تو نہ ہو سکے۔ البتہ ان دینی رہنماؤں کے ذہن مغربی طرزِ انتخاب کے سانچے میں ڈھل گئے۔ پہلے جو بات ناخوب تھی بتدریج وہی خوب نظر آنے لگی۔ لہٰذا انھوں نے خلافت وجمہوریت کے فرق کو اُجاگر کرنے کی بجائے مغربی طرزِ انتخاب کو عین اسلامی نظام ثابت کرنے کی کوششیں شروع کر دیں۔ ایسے وقت میں بعض علمائے حق نے حق کی آواز بلند کی۔ جس کا ثبوت اس دَور یا اس سے پہلے کا اُردو لٹریچر ہے۔ لیکن چونکہ بالائی سطح پر محض ایسے علماء کی آواز ہی پہنچ پاتی تھی جو سیاسی جماعتوں کے قائد بھی تھے۔ لہٰذا حقیقت خرافات میں دب کر رہ گئی۔ بھلا اس نقار خانے میں طوطی کی آواز سنتا بھی کون تھا؟
۱۹۷۰ء کے الیکشن کے بعد پیپلز پارٹی برسرِ اقتدار آ گئی۔ اس کے دورِ حکومت میں پاکستان کا نیا آئین بنا۔ پیپلز پارٹی کا اپنا مزاج سوشلزم کی طرف مائل تھا۔ تاہم عوام ــ جو اسلام سے والہانہ عقیدت رکھتے تھے ــ کو مطمئن کرنے کے لیے دستور کی ابتداء میں تبرکاً یہ فقرہ بھی بحال رہنے دیا گیا کہ اقتدارِ اعلیٰ کا مالک اللہ تعالیٰ ہے" اور ایسے قوانین کو جو قرآن وسنت

سے ٹکراتے تھے۔ خارج کرنے یا ان میں ترمیم کرنے کے لیے ایک اسلامی نظریاتی کونسل بھی تشکیل دی گئی۔ لیکن عملاً حاکمیت بھی عوام کی بدستور قائم رہی اور اسلامی نظریاتی کونسل کی سفارشات' اگر کچھ تھیں' تو وہ بھی کسی سرد خانے ہی کی نذر ہوگئیں۔

۱۹۷۷ء کے انتخابات اور پھر انتخابات کی بدعنوانیوں کے نتیجہ میں تحریکِ نظامِ مصطفیٰؐ اور پھر فوجی حکومت برسرِ اقتدار آئی۔ اس کے سربراہ جنرل ضیاء الحق چونکہ خالص اسلامی ذہن رکھتے تھے۔ لہٰذا اسلامی نظام کے نفاذ کے اعلان کے علاوہ عملاً بھی بہت سے معاملات میں پیش رفت شروع کردی۔ تو یہ بحث نئے سرے سے چھڑ گئی کہ آیا موجودہ جمہوری طرزِ انتخاب اسلامی نظامِ انتخاب کے مطابق ہے یا اس سے متصادم ؟ اسلامی نظریاتی کونسل کی تشکیل اور شریعت بنچوں کا قیام اس بات کی واضح دلیل تھی کہ ہمارا آئین اسلامی نقطہ نظر سے بہت سی ترامیم کا محتاج ہے۔ اسی سلسلہ میں جمہوری طرزِ انتخاب کا مسئلہ پھر زیرِ بحث آیا۔ دریں اثنا ایک سابق جج سپریم کورٹ جناب بدیع الزمان کیکاؤس نے شریعت بنچ کے سامنے درخواست پیش کردی کہ موجودہ طرزِ انتخاب سراسر غیر اسلامی ہے۔

اِدھر سیاسی جماعتوں کے رہنما حرکت میں آئے۔ انھوں نے شریعت بنچ میں ایسے دلائل اور بیانات پیش کیے جو اس طرزِ انتخاب کو محض اسلام سے سندِ جواز ہی عطا نہیں کرتے تھے بلکہ اسے عین اسلام یا اس کی بہتر صورت قرار دیتے تھے۔ کسی نے کہا :۔

"مغربی نظامِ سیاست میں جو چیز سب سے زیادہ خوبصورت اور دلکش ہے۔ وہ یہی جمہوریت ہے۔ نیز یہ کہ موجودہ جمہوریت کے علمبرداروں نے جمہوریت کے تمام تر اُصول اسلامی تعلیمات سے ہی مستعار لیے ہیں اور ہم مسلمان ہیں کہ اپنے اس پوشیدہ خزانہ سے بیگانہ ہیں۔"

اور کسی نے کہا :۔

"موجودہ دوَر کی اسمبلیاں (پارلیمنٹ) اسلامی مجلسِ شوریٰ کا نعم البدل ہے اور تعاونوا علی البرّ والتقویٰ کی صحیح تعبیر ہے۔"

اور کسی نے یوں کہا :۔

"یہ طرزِ انتخاب ہمارے ہاں تقریباً ایک صدی سے رائج ہے۔ علماء نے اس کے آئین میں شرکت کی اور انتخابات میں حصہ لیا کسی طرف سے ایسی آواز بلند نہیں ہوئی، جس نے جمہوریت کو شرعاً ناجائز قرار دیا ہو۔ لہٰذا اس پر اجماع سکوتی رہا جو کہ شرعاً قابلِ حجت ہے۔ اب جو لوگ

اس کو ناجائز قرار دے رہے ہیں وہ اسلام کی خدمت کرنے کی بجائے اُمت میں انتشار پھیلا رہے ہیں۔"

اور کسی کو یہ فکر لاحق ہوئی کہ :۔

اگر یہ طرزِ انتخاب غیر شرعی ہے تو پاکستان کے وجود کے متعلق کیا خیال ہے جو اسی طرزِ انتخاب کے تحت وجود میں آیا تھا ؟ یا ۱۹۷۳ء کے آئین کا کیا بنے گا ؟

نیز یہ بھی شریعت بنچ کو جب آئین میں ترمیم و تنسیخ کا اختیار نہیں ہے تو ایسی بحث چھیڑنے کی ضرورت ہی کیا تھی ؟

عدالت میں تو یہ سلسلہ چل ہی رہا تھا کہ صدرِ محترم نے ایک اعلان کیا کہ نظامِ حکومت کے متعلق بحث کا خیر مقدم کیا جائے گا۔ چنانچہ چند دن پیشتر روزنامہ نوائے وقت نے نظامِ حکومت سے متعلق مندرجہ ذیل سوال نامہ تیار کیا۔ پھر مختلف سیاسی لیڈروں سے انٹرویو لیے، بعض کو یہ سوالنامہ بذریعہ ڈاک بھیجا گیا اور آج کل ان لیڈروں کے جوابات باری باری اخبارِ مذکور میں شائع ہو رہے ہیں۔ اصل سوال نامہ یہ تھا :۔

(۱) مغربی نظامِ سیاست اور مغربی جمہوریت میں آپ کیا فرق محسوس کرتے ہیں ؟

(۲) اسلامی نظامِ سیاست اور مغربی نظامِ سیاست یا جمہوریت میں آپ کیا بُعد محسوس کرتے ہیں ؟

(۳) مغربی یا اسلامی نظام میں حزبِ اقتدار اور حزبِ اختلاف کا کیا مقام ہے ؟

(۴) اسلامی نظامِ سیاست میں آپ مقننہ، انتظامیہ اور عدلیہ کے لیے کیا کردار متعین کرتے ہیں ؟

(۵) پاکستان کے حالات کے لیے آپ کس نظام کو موزوں سمجھتے ہیں ؟ اسلامی نظامِ سیاست یا مغربی جمہوریت ؟

(۶) اسلامی نظامِ سیاست میں سربراہِ مملکت کا انتخاب براہِ راست ہو یا بالواسطہ ؟

ان سوالات کے جواب میں اکثر سیاسی لیڈروں کے جوابات صرف مغربی جمہوری نظام کی ہی مدح سرائی پر ختم ہو جاتے ہیں۔ کوئی کہتا ہے :۔ پارلیمانی نظام ہی اسلام سے قریب تر ہے۔ دوسرا فرماتا ہے۔ پاکستان کے لیے پارلیمانی نظام ہی مناسب ہے۔ تیسرا فرماتا ہے : مغربی جمہوری نظام اسلامی نظام سے متصادم نہیں۔ بس گول مول سے جوابات پر ہی اکتفا کر لیا جاتا ہے۔ اِلاماشاءاللہ۔ سوال نمبر ۳، نمبر ۴ اور نمبر ۶ سے کوئی تعرض نہیں فرماتا اور ہمارا خیال ہے کہ عوامی جذبات سے کھیلنے والا یہ شعبدہ باز طبقہ ایسے سوالات کو پوری طرح سمجھ بھی نہیں سکتا۔ چہ جائیکہ

ان کا معقول جواب دے سکے۔ اور جو کوئی سمجھتا ہے تو وہ تجاہلِ عارفانہ سے کام لے کر ایسے سوالات سے آنکھیں بند کر کے نکل جاتا ہے اور یہ بات پورے وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ ان لیڈروں میں سے اکثر ایسے ہیں جو اسلام کی بنیادی تعلیمات تک سے ناآشنا ہیں اور جن کا ماحصل دوسرے لوگوں کی اُردو کتابوں اور انھیں مصنّفین کے ذہن کا مرہونِ منت ہے۔ بہرحال ایک بات پر سب متفق اور دست بدعا ہیں کہ اللہ کرے جمہوری طرزِ انتخاب بحال اور سلامت رہے تاکہ ان اقتدار کے بھوکے طالع آزماؤں کو قسمت آزمائی کے مواقع میسّر آتے رہیں۔

ایسے حالات میں ضروری معلوم ہوا کہ اس بحث میں دورِ نبوی یا خلافتِ راشدہ کے جن واقعات سے نتائج کا استنباط کیا جاتا ہے وہ اولین اور صحیح ترین ماخذوں سے پیش کیے جائیں۔ میرے خیال میں اس بحث کا انحصار صرف دو طرح کے واقعات پر مبنی ہے :۔

(۱) خلفائے راشدین کا انتخاب کس طرح عمل میں آیا ؟ اس سے رئیس مملکت کے طرزِ انتخاب پر پوری روشنی پڑتی ہے۔

(۲) عہدِ نبوی اور خلافتِ راشدہ میں مجلسِ شوریٰ کس قسم کی تھی۔ کس قسم کے معاملات مشورہ طلب ہوتے تھے اور ان کا فیصلہ کس طرح ہوتا تھا ؟ اس سے اسلامی مجلسِ مشاورت اور موجودہ دَور کی مقنّنہ کا فرق واضح ہوگا۔

اصل میں تو یہ دونوں قسم کے واقعات ایک ہی سلسلہ" وامرھم شوریٰ بینھم" کی کڑیاں ہیں۔ کیونکہ امیر کا انتخاب بھی مجلسِ شوریٰ ہی کرتی ہے جو اس کا ایک ضمنی کام ہے۔ مگر آج کے جمہوری دَور میں چونکہ اسمبلیاں اپنے انتخاب کے بعد سب سے پہلے صدرِ مملکت کا انتخاب کرتی ہیں اور باقی کام بعد میں، لہٰذا اسی ترتیب کو ملحوظ رکھ کر ہم نے پہلے خلفائے راشدین کے انتخاب ہی کو سپردِ قلم کیا ہے۔

مَیں نے حتیّ الامکان یہ کوشش کی ہے کہ ایسے واقعات بخاری اور مسلم جیسی مستند احادیث کے متون، اُردو ترجمہ اور حوالے سے پیش کر دی جائیں اور بحمداللہ اس میں بہت حد تک کامیابی بھی ہوئی ہے پھر جہاں کوئی واقعہ ان کتابوں میں نہیں مل سکا تو دوسری کتبِ صحاح کا سہارا لیا ہے اور ایسے واقعات جہاں احادیث خاموش ہیں وہاں کسی مستند تاریخ[1] کی کتاب کا سہارا لیا گیا

---

[1] تاریخ میں مَیں نے زیادہ تر دو کتابوں پر انحصار کیا ہے (۱) تاریخ الرسل والملوک از علامہ حافظ ابن جریر طبری (باقی اگلے صفحہ پر)

ہے۔ اور ساتھ ساتھ حوالے بھی پیش کر دیے گئے ہیں۔

اس کاوش کا فائدہ یہ ہوگا کہ جو شخص بھی خالی الذہن ہو کر خلفاء کے طرزِ انتخاب اور مشورہ کی حقیقت کا صحیح ترین ماخذوں سے مطالعہ کرے گا وہ بہت حد تک اصل حقیقت کو سمجھ لے گا۔ اور اسے یہ اندازہ لگانا بھی چنداں مشکل نہ ہوگا کہ جو لوگ بہ تکلف جمہوریت کی قبا کو اسلام کے بدن پر فٹ کرنا چاہتے ہیں انہیں تاویلات کا سہارا لینے اور واقعات کو توڑ موڑ کر پیش کر کے حسبِ خواہش نتائج برآمد کرنے کے لیے کس قدر دماغ سوزی کرنا پڑتی ہے۔

یہ کتاب مقدمہ کے بعد تین حصّوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصّہ میں خلفائے راشدین کا انتخاب اور اس کے ضمنی مباحث درج ہیں۔ دوسرے میں دورِ نبوی اور خلفائے راشدین میں مشہور مجالس مشاورت اور ضمنی مباحث ہیں۔ ان مباحث میں ان تمام اعتراضات اور اشکالات کا حل پیش کیا گیا ہے جو جمہوریت نوازوں کی طرف سے آج تک کیے گئے ہیں۔ تیسرا حصّہ ان مباحث پر مشتمل ہے جو آج کل بالخصوص زیرِ بحث آتے رہتے ہیں۔ آخری بحث "ربطِ ملّت کے تقاضے اور اسلامی نظام کی طرف پیش رفت" میں ایک مجمل سا خاکہ پیش کیا گیا ہے کہ موجودہ وقت میں اسلامی نظامِ حیات کی طرف کیسے پیش رفت ہو سکتی ہے۔ دُعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہم مسلمانوں کو حقائق کی تاویلات ڈھونڈنے کی بجائے خود اپنا ذہن بدلنے کی توفیق عطا فرمائے۔

عبدالرحمٰن کیلانی

رمضان المبارک ۱۴۰۰ھ

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)

(۲) البدایۃ والنہایۃ از علامہ حافظ ابن کثیر۔

اہلِ علم جانتے ہیں کہ یہ دونوں حضرات مفسّر بھی ہیں، محدّث بھی فقیہ بھی اور مؤرخ بھی۔ طبری کا مقام اس لیے بلند ہے کہ ابتدائی دوَر کی مرتب شدہ تاریخ ہے (تیسری صدی ہجری کی) اور واقعات کو اسناد سے پیش کیا گیا ہے۔ اور بدایہ والنہایہ کا اس لیے کہ ابنِ کثیر نے پہلے کی تمام مرتب شدہ تاریخوں کو سامنے رکھ کر تحقیق کے بعد واقعات قلمبند کیے ہیں۔

دیباچہ طبع دوم

زیرِ نظر کتاب "خلافت وجمہوریت" کو علمی حلقوں میں جس قدر پذیرائی ہوئی میں اس وقت اس کا گمان بھی نہ کرسکتا تھا، جب میں نے یہ کتاب لکھی تھی۔ اس کتاب کی تعریف میں مجھے جس قدر خطوط موصول ہوئے یا جن دوستوں نے زبانی طور پر اس کتاب کی تصنیف میں مجھے ہدیۂ تبریک پیش کرکے میری حوصلہ افزائی فرمائی میں اگر ان سب کا ذکر کروں تو یہ "ثنائے خود بخود گفتن" کا مصداق ہی ہوگا۔ تاہم میں ان حضرات کا فرداً فرداً شکریہ ادا کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ اور اللہ تعالیٰ کے حضور بھی اس پذیرائی کے لیے سجدہ ریز ہوں۔

اور اس سے بھی بڑھ کر جس بات سے مجھے خوشی حاصل ہوئی وہ یہ ہے کہ موجودہ دَور میں بھی جبکہ مغربی جمہوریت کا بھوت معاشرہ کے قلوب واذہان پر پوری طرح مسلط ہے اور ہر کس وناکس کو سیاسی حقوق کی چاٹ لگادی گئی ہے۔ ایسے لوگ بھی موجود ہیں جن کے سامنے اگر دلیل سے بات کی جائے تو وہ حق بات کو تسلیم کرنے کے لیے آمادہ نظر آتے ہیں۔ فالحمد للہ علیٰ ذالک۔

اس کتاب کا پہلا ایڈیشن تقریباً سات آٹھ ماہ قبل ختم ہوچکا تھا۔ اس کی دوبارہ اشاعت کے تقاضے بھی ہورہے تھے۔ مگر نظرثانی کی فرصت نہ مل سکی۔ اور اب یہ تقاضے اس لیے شدید نوعیت اختیار کرگئے ہیں کہ اب پھر انتخابات کی آمد آمد ہے۔ اب اس کی نظرثانی کے نتیجہ میں کچھ اضافے بھی کئے گئے ہیں۔ علاوہ ازیں اس میں اسلامی نظریاتی کونسل کے اس سوال نامہ معہ جوابات کو بھی بطور ضمیمہ شامل کیا جارہا ہے جو میں نے ۸۲ء میں لکھے اور پھر یہ محدث اپریل ۱۹۸۲ء کی اشاعت میں شائع ہوئے تھے۔

دیباچہ طبع سوم

اللہ کا شکر ہے کہ موجودہ مغربی نظام جمہوریت کے خلاف جو آواز میں نے آج سے دس بارہ سال قبل اُٹھائی تھی۔ اسے اہلِ علم کے ایک کثیر طبقہ میں خاص پذیرائی حاصل ہوئی ہے اور وہ اسے فی الواقعہ ایک غیر شرعی نظام سمجھنے لگے ہیں اور اس کے بجائے نظامِ خلافت کے لیے اپنی کوششیں صرف کررہے ہیں۔

اس تیسرے ایڈیشن میں میں نے چند جزوی ترمیمات کے علاوہ دو جگہ اضافے کئے ہیں۔ ایک اضافہ تو "مغربی جمہوریت کے مفاسد" کے آخر میں جناب قدرت قدرت اللہ شہاب کا ایک طویل اقتباس ہے جس میں انہوں نے جمہوریت کے بالخصوص ان مفاسد کا ذکر کیا ہے جن کا تعلق حکومتِ وقت سے ہوتا ہے اور دوسرا اضافہ کتاب کے آخر میں ہے جو اس سوالنامہ کا جواب ہے جو مجھے وفاقی شرعی عدالت کی طرف سے موصول ہوا تھا۔

عبدالرحمٰن کیلانی ۱۵/ مارچ ۱۹۹۲ء

فہرست مضامین

مقدّمہ

ملّتِ اسلامیہ

سب سے پہلے ہمیں یہ دیکھنا چاہیئے کہ جو جماعت اسلامی نظامِ خلافت کا دعویٰ لے کر اُٹھتی ہے وہ خود کن صفات سے متصف ہونی چاہیئے ؟ اس کی وضاحت سورۂ شوریٰ کی مندرجہ ذیل آیات میں ملتی ہے جو مکی دَور کے آخر میں نازل ہوئیں ۔ ارشادِ باری ہے :۔

وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ۝ وَ الَّذِيْنَ يَجْتَنِبُوْنَ كَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ وَاِذَا مَا غَضِبُوْا هُمْ يَغْفِرُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِرَبِّهِمْ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَ اَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَهُمُ الْبَغْيُ هُمْ يَنْتَصِرُوْنَ ۝ (۴۲ / ۳۶-۳۹)

اور جو خدا کے ہاں ہے وہ بہتر اور قائم رہنے والا ہے ان لوگوں کے لیے جو :۔

(۱) ایمان لائے (یعنی اللہ، اس کے رسولؐ اور یومِ حساب پر)

(۲) اپنے پروردگار پر بھروسہ رکھتے ہیں ۔

(۳) بڑے گناہوں اور بے حیائی کے کاموں سے پرہیز کرتے ہیں ۔

(۴) جب غصہ آتا ہے تو معاف کر دیتے ہیں (آپس میں ایک دوسرے کو)

(۵) اپنے رب کا فرمان قبول کرتے ہیں ۔

(۶) نماز قائم کرتے ہیں ۔

(۷) اپنے معاملات باہمی مشورہ سے[۱] طے کرتے ہیں (جس میں امیر کا انتخاب بھی شامل ہے)

---

[۱] مندرجہ بالا آیات میں باہمی مشورت کی اہمیت تو اس بات سے ہی واضح ہو جاتی ہے کہ اس سورت کا نام ہی "شوریٰ" رکھا گیا ہے لیکن غور طلب بات یہ ہے کہ "امرھم شوریٰ بینھم" کے الفاظ اقاموا الصلوٰۃ اور ومما رزقنٰھم ینفقون کے درمیان ہیں ۔ تو کیا جس طرح آجکل "مشاورت" کے پہلوؤں پر غور کیا جا رہا ہے ہمارے سیاسی رہنماؤں کو کبھی یہ توفیق بھی نصیب ہوئی کہ وہ نماز اور زکوٰۃ کے جملہ پہلوؤں پر غور فرما کر ان پر عمل پیرا ہونے کی بھی تلقین فرمائیں ۔

(۸) جو مال ہم نے انھیں دیا اس میں سے خرچ کرتے ہیں (زکوٰۃ اور اس کے علاوہ بھی)
(۹) جب ان پر ظلم و تعدی ہو تو (مناسب طریقے سے) بدلہ لیتے ہیں (اغیار سے)
جب تک کسی امیر کو ایسی صفات کی حامل جماعت میسر نہ آئے، اسلامی انقلاب نہیں لایا جاسکتا۔ حتیٰ کہ ایک نبیؑ جو اسلامی انقلاب لانے کے لیے اللہ کی طرف سے مأمور ہوتا ہے ایسی جماعت کے بغیر اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہوسکتا۔ لہٰذا نبیؑ ایسے اوصاف کی حامل جماعت خود تیار کرتا ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ کی مہربانی سے ایسی جماعت میسر آگئی تو ایسا انقلاب برپا کرنے میں کامیاب ہوگئے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام جیسے اولوالعزم پیغمبر کو جب ایسے اوصاف کی حامل جماعت مہیا نہ ہو سکی تو انقلاب بپا نہ ہوسکا۔ اور ان کی قوم مدتوں بھٹکتی پھری۔

اس کے بعد اس جماعت میں وہ لوگ بھی شامل ہوسکتے ہیں جو بعد میں اسلام قبول کریں۔ مگر شرط یہ ہے کہ وہ اپنے ایمان میں مضبوط ہوں، نماز قائم کرتے ہوں اور زکوٰۃ ادا کرتے ہوں بموجب ارشاد باری تعالیٰ :۔

فَإِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَاِخْوَانُكُمْ فِي الدِّيْنِ (۹/۱۱)
پھر اگر توبہ کریں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں تو تمہارے دینی بھائی ہیں۔

یعنی تین باتیں (ایمان، نماز اور زکوٰۃ کی ادائیگی) ہیں جو کسی فرد کو ایک اسلامی مملکت میں شہریت کے حقوق عطا کرتی ہیں۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :۔

امرت ان اقاتل الناس حتی یشهدوا ان لا اله الا الله و ان محمدًا رسول الله[1] و یقیموا الصلوٰة و یؤتوا الزکوٰة فاذا فعلوا ذلك عصموا منی دماءهم الا بحق الاسلام وحسابهم علی الله۔ (مسلم۔ کتاب الایمان باب الامر لقتال الناس)

ترجمہ :۔ مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں لوگوں سے جنگ کروں۔ یہاں تک کہ وہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کی شہادت دیں۔ نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں اگر وہ یہ شرائط تسلیم کرلیں تو ان کی جانیں محفوظ ہوجائیں گی اِلّا یہ کہ وہ اسلام کے کسی حق کے تحت وہ اس حفاظت سے محروم کردیے جائیں رہا ان کے باطن کا حساب تو وہ اللہ کے ذمہ ہے۔

وجہ یہ ہے کہ ایک مسلمان شہری پر اللہ کا سب سے پہلا حق نماز ہے اور دوسرے مسلمانوں کا حق زکوٰۃ ہے نماز کے متعلق تو واضح الفاظ میں حضور اکرمؐ نے فرمایا :۔

---

[1] بخاری میں "وان محمد رسول اللہ" کے الفاظ موجود نہیں۔ (بخاری کتاب الجہاد والسیر۔ باب دعاء النبیؐ)

من ترك الصلوٰة متعمداً فقد كفر (متفق عليه)

جس نے عمداً نماز چھوڑی۔ اس نے کفر کیا۔

اور زکوٰۃ کی عدم ادائیگی بھی دائرۂ اسلام سے خارج کر دیتی ہے جس کی دلیل اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتی ہے کہ خلیفہ اول حضرت ابوبکر صدیقؓ نے نامساعد حالات کے باوجود مانعینِ زکوٰۃ کے خلاف لشکر کشی کی تھی۔

ملّی وحدت

ایسے اوصاف سے متصف جماعت بھی صرف اسی صورت میں مثبت نتائج پیدا کر سکتی ہے۔ جب کہ یہ خوب منظم ہو۔ اتحاد کو ہر قیمت پر برقرار رکھے اور انتشار سے محفوظ رہے۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے :۔

وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا۔ (۳/۱۰۴)

اور سب مل کر خدا کی (ہدایت کی) رسی کو مضبوط پکڑے رہنا اور متفرق نہ ہونا۔

ملّی وحدت تین عناصر سے عبارت ہے، جماعت۔ امیر اور فرد۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے :۔

لا اسلام الّا بالجماعة، ولا جماعة الّا بالامير، ولا امير الّا بالسمع والطاعة۔

ترجمہ: جماعت کے بغیر اسلام کی سربلندی ناممکن ہے اور امیر کے بغیر جماعت متحد نہیں رہ سکتی اور امیر کی امارت اس وقت تک بارآور نہیں ہو سکتی جب تک کہ ہر شخص اس کا حکم سُن کر اس کی بات نہ مانے۔

اب اس ملّی وحدت کو برقرار رکھنے کے لیے ارشاداتِ نبوی ملاحظہ فرمائیے :۔

ملّتِ اسلامیہ کا خلیفہ ایک ہی شخص ہو سکتا ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :۔

اذا بويع الخليفتين فاقتلوا الآخر منهما (مسلم، كتاب الامارة والقضاء)

ترجمہ: جب دو خلیفوں کی بیعت ہونے لگے تو بعد والے کو قتل کر دو۔

اور فقہائے اُمت کا یہ متفقہ فیصلہ ہے۔ کہ اگر ایک ہی وقت (بغیر تقدیم و تاخیر) دو خلیفوں کا انتخاب واقع ہو تو دونوں کا انتخاب کالعدم قرار پائے گا اور نئے سرے سے خلیفہ کا انتخاب ہوگا۔

امیر کی اطاعت اور جماعت سے وابستگی

ارشادِ باری ہے :-

اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ (۴/۵۹)

اللہ کی اور اُس کے رسول کی اطاعت کرو۔ پھر حاکموں کی جو تم میں سے ہوں۔

"اولی الامر" سے خلیفہ کے علاوہ وہ دوسرے تمام حکام بھی مراد ہیں جو شوریٰ انتظامیہ یا عدلیہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ ملی وحدت سے متعلق اب ارشاداتِ نبوی ملاحظہ فرمائیے :-

۱- عن ابی ھریرۃ انّ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال من اطاعنی فقد اطاع اللہ ومن عصانی فقد عصی اللہ ومن اطاع امیری فقد اطاعنی ومن عصی امیری فقد عصانی۔ (بخاری، کتاب الاحکام) (مسلم۔ کتاب الامارت۔ باب وجوب طاعۃ...)

ترجمہ : حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس نے میری اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی اور جس نے میری نافرمانی کی اس نے اللہ کی نافرمانی کی۔ اور جس نے میرے مقرر کیے ہوئے حاکم کی اطاعت کی اس نے میری اطاعت کی اور جس نے میرے امیر کی نافرمانی کی اس کے گویا میری نافرمانی کی۔

۲- عن عبداللہ بن عمر یقول کنا نبایع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم علی السمع والطاعۃ یقول لنا فیما استطعتم (مسلم۔ کتاب الامارۃ باب البیعۃ علی السمع والطاعۃ)

ترجمہ : عبداللہ بن عمرؓ کہتے ہیں ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے حکم سننے اور فرمانبرداری کرنے کی شرط پر بیعت کرتے تھے۔ آپ ہمیں کہتے : اپنی استطاعت کے مطابق (یا مقدور بھر تم پر سمع و طاعت لازم ہے)۔

۳- عن عرفجۃ قال سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول من اتاکم وامرکم جمیع علی رجل واحد یرید ان یشق عصاکم او یفرّق جماعتکم فاقتلوہ۔ (مسلم۔ کتاب الامارۃ والقضاء)

ترجمہ : عرفجہؓ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سُنا ہے اگر تمہارے معاملات کسی ایک شخص پر اکٹھے ہوں پھر کوئی شخص تمہاری قوت کو توڑنے یا تمہاری جماعت میں تفرقہ ڈالنے کی کوشش کرے تو اسے قتل کر دو۔

۴- عن ابی ھریرۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من خرج من الطاعۃ

وفارق الجماعة ثم مات، مات میتۃً جاھلیۃ (مسلم، کتاب الامارۃ)

ترجمہ: ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، جو کوئی امیر کی اطاعت سے نکلا اور جماعت سے الگ ہوا، پھر مرگیا تو وہ جاہلیت کی موت مرا۔

امیر اگر نسل کے لحاظ سے کہتر یا شکل کے لحاظ سے بدصورت ہو تو بھی اس کی اطاعت بدستور واجب ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

۵۔ اِن اُمِّرعلیکم عبد مجدّع یقودکم بکتٰب اللہ فاسمعوا لہٗ و اطیعوا (مسلم۔ایضا)

ترجمہ: اگر تم پر نکٹا غلام بھی امیر بنا دیا جائے تو جب تک وہ تمھیں اللہ کے احکام کے مطابق چلاتا ہے اس کی بات سُنو اور اس کی اطاعت کرو۔

ایسے امیر کے احکام کی ہر حال میں ۔۔ تنگی یا آسانی، وہ احکام رعایا کو پسند ہوں یا ناپسند ۔۔ اطاعت واجب ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

۶۔ السمع والطاعۃ علی المرءِ المسلم فیما احبّ وکرہٗ مالم یُؤمر بمعصیۃٍ واذا امر بمعصیۃ فلا سمعٌ ولا طاعۃٌ۔ (متفق علیہ) (بخاری کتاب الاحکام)

"ہر مسلمان پر سُننا اور طاعت کرنا لازم ہے خواہ وہ حکم اسے پسند ہو یا ناپسند جب تک کہ وہ گناہ کا حکم نہیں دیتا۔ اور اگر وہ گناہ کا حکم دے تو پھر نہ اس کی بات سُنو نہ اطاعت کرو۔

اور عبادہ بن صامتؓ کہتے ہیں کہ :۔

۷۔ بایعنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم علی السمع والطاعۃ فی العسر و الیسر والمنشط والمکرہ۔ (متفق علیہ) (بخاری کتاب الاحکام)

"ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سُننے اور اطاعت کرنے کی شرط پر بیعت کی خواہ اس میں تنگی ہو یا آسانی، خوشی کی صورت ہو یا ناخوشی کی (ہر حال میں اطاعتِ امیر فرض ہے)"

اگر امام بداعمال ہو جائے تو بھی اس کی اطاعت لازم ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

۸۔ یکون علیکم اُمَراءُ تعرفون وتنکرون فمن انکر فقد برئ ومن کرہ فقد سلم ولکن من رضی وتابع، قالوا افلا نقاتلھم؟ قال: "لا، ما صلّوا" ای من کرہ بقلبہٖ وانکر بقلبہٖ۔ (مسلم۔ایضا)

"تم پر ایسے امیر ہوں گے جو اچھے کام بھی کریں گے اور بُرے بھی تو جس نے انکار کیا (کھل کر ان کی برائی بیان کی) وہ بری ہوا اور جس نے (دل سے) بُرا جانا وہ محفوظ رہا مگر جو شخص راضی ہوگیا اور ان کے پیچھے چل پڑا (وہی قابلِ مواخذہ ہے) صحابہؓ نے عرض کیا" کیا ہم ایسے امیروں سے جنگ نہ کریں؟ فرمایا: نہیں جب تک وہ نماز پڑھتے رہیں" یعنی جس شخص نے دل سے مکروہ سمجھا اور انکار کیا۔

اگر امیر اپنے حقوق تو رعایا سے پورے وصول کرے لیکن رعایا کے حقوق پورے نہ کرے تو بھی اس کی اطاعت لازم ہے۔ وائل بن حجرؓ سے روایت ہے کہ سلمہ بن یزید جُعفی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پُوچھا:۔

۹۔ یا نبیّ اللہ! ارایت ان قامت علینا امراء یسئلونا حقھم و یمنعونا حقنا فما تامُرنا؟ قال اسمعوا واطیعوا وانّما علیھم ما حُمّلوُا وعلیکم ما حُمِّلتم (مسلم۔ ایضا)

"اے اللہ کے نبیؐ! اگر ہم پر ایسے امیر مسلّط ہوں جو ہم سے اپنا حق تو مانگیں لیکن ہمیں ہمارا حق نہ دیں تو ایسی صورت میں ہمارے لیے آپ کا کیا حکم ہے؟ فرمایا:

"ان کی بات سنو اور اطاعت کرو۔ ان کی ذمّہ داری کا وبال ان پر ہے اور تمہاری ذمّہ داری (سمع وطاعت) کا تم پر"

نیز فرمایا:۔

۱۰۔ من رایٰ من امیرہٖ شیئًا یکرھُہ فلیصبر فانہ لیس احدٌ یفارقُ الجماعۃ شبراً فیموت الامات میتۃً جاھلیۃ (متفق علیہ) (بخاری۔ کتاب الاحکام)

"جو شخص اپنے امیر میں ناپسندیدہ فعل دیکھے تو چاہیئے کہ صبر کرے کیونکہ جو کوئی جماعت سے بالشت بھر بھی جدا ہوا اور مرجائے تو وہ جاہلیت کی موت مرا"

نیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

۱۱۔ عن ابی ھریرۃ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال: من خرج من الطاعۃ وفارق الجماعۃ فمات مات میتۃً جاھلیۃ ومن قاتل تحت رایۃ عمیۃ یغضب العصبیۃ اویدعوا الی عصبیّۃٍ اوینصر عصبۃ فقتل فقتلۃٌ جاھلیۃ (مسلم کتاب الامارۃ باب ملازمۃ جماعۃ المسلمین)

"حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :- جو شخص امیر کی اطاعت سے اور مسلمانوں کی جماعت سے الگ ہوا۔ پھر مرگیا تو وہ جاہلیت کی موت مرا اور جو شخص کسی اندھے (نشان) کے تحت لڑائی کرے عصبیت کے لیے غصہ دلائے یا عصبیت کے لیے بلائے ۔ یا عصبیت کے لیے مدد کرے پھر قتل کیا جائے تو وہ بھی جاہلیت کی موت مرا۔"

امام چونکہ مقتدرِ اعلیٰ ہستی نہیں ہوتی بلکہ وہ صرف قرآن وسنت کے احکام کے نفاذ پر مامور ہوتا ہے لہٰذا اس کی اطاعت اسی حد تک واجب ہے جب تک کہ وہ قرآن وسنت کے مطابق ہو اور اگر مخالف ہو تو اس کی اطاعت قطعاً واجب نہیں ہے ۔ ارشادِ نبوی ہے :-

۱۲۔ لا طاعة فی معصیةٍ انّما الطاعة فی المعروفِ (متفق علیه)

"خدا تعالیٰ کی نافرمانی میں کوئی اطاعت نہیں ۔ اطاعت صرف بھلائی کے کاموں میں ہے۔"

اسی مضمون کی دوسری حدیث کے الفاظ اس طرح ہیں :-

۱۳ ۔ لاطاعة لمخلوق فی معصیة الخالق (شرح السنة)

"اللہ کی نافرمانی کا معاملہ ہو تو کسی مخلوق کی اطاعت نہیں ہے۔"

اس ایک بات کے علاوہ امیر کی اطاعت ہر حال میں واجب ہے ۔

ملی وحدت کی اہمیت

ماحصل یہ ہے کہ امیر کی اطاعت ہر حال میں واجب ہے ۔ وہ غلام ہو، بدصورت ہو، کہتر ذات کا ہو، خود فاسق ہو ۔ رعایا کے حقوق پورے نہ کرتا ہو، سب کچھ گوارا ہے مگر ملی وحدت میں تشتت و انتشار کسی قیمت پر گوارا نہیں ہے ۔ ہاں اگر لوگوں کو قرآن وسنت کے خلاف حکم دے تو گویا امارت کا مقصد ہی فوت ہوگیا اور ایسی حکومت اسلامی حکومت ہی نہیں رہتی اس صورت میں اس کی کوئی اطاعت نہیں ۔ اس صورت میں وہی شوریٰ جس نے اسے منتخب کیا اس کے معزول کرنے کا بھی حق رکھتی ہے ۔

ملت اسلامیہ کے لیے امام کے بغیر ایک لمحہ بھی گزارنا ناقابلِ برداشت ہے ۔ وفات النبیؐ کے بعد اسی دن جب انصار نے خلافت کا قصہ شروع کر دیا تو حضرت ابوبکرؓ اور دوسرے اکابر صحابہؓ کو فوری طور پر ادھر توجہ مبذول کرنا پڑی جب کہ ابھی تجہیز و تکفین کا کام باقی تھا ۔ حضرت ابوبکرؓ نے اپنی وفات سے پہلے ہی حضرت عمرؓ کو خلیفہ بنا دیا ۔ حضرت عمرؓ نے چھ رکنی کمیٹی بنائی اور ساتھ ہی یہ تاکید فرمائی کہ تین دن کے اندر اندر خلیفہ کا انتخاب لازمی ہوگا۔

دریں اثناء حضرت صہیبؓ نے آپ کی وصیت کے مطابق بحیثیت قائم مقام خلیفہ کے فرائض سرانجام دیے۔

امام کی اہمیت حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے بھی واضح ہوتی ہے:۔

عن مالك ابن حويرث قال انصرفتُ من عند النبی صلی الله علیه وسلم فقال لنا انا وصاحبٌ لی: آذنا واقیما ولیؤمکما اکبرکما۔

(بخاری، کتاب الجہاد والسیر باب سفر الاثنین)

"مالک بن حویرث کہتے ہیں میں جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس سے (اپنے وطن کو) لوٹا تو آپؐ نے مجھے اور میرے ایک ساتھی سے کہا۔ دونوں راستے میں اذان کہنا۔ اور نماز قائم کرنا اور تم دونوں میں سے جو بڑا ہو وہ امام بنے۔"

گویا دو مسلمان بھی کہیں علیحدہ ہوں تو نماز باجماعت ادا کرنا اور جماعتی تنظیم کا خیال رکھنا چاہیئے۔ اسی طرح آپؐ نے یہ بھی ارشاد فرمایا کہ اگر تین آدمی بھی سفر کریں تو اپنے میں سے ایک امیر بنالیں۔

اور یہ تو واضح ہے کہ اسلام میں جماعت کی امامت اور ملت کی امامت (امارت یا خلافت) فردِ واحد ہی انجام دیتا رہا ہے۔ نماز باجماعت، جمعہ کا اجتماع، حج کی فرضیت اور امیر کا تقرر یہ سب ملت کی اجتماعیت کے تدریجی مراحل ہیں۔

حصّہ اوّل

انتخابِ خُلفائے راشدین

خلافت ابوبکرؓ کا پس منظر

۱- امامت قریش میں ہوگی

حضور اکرمؐ نے اپنی زندگی میں ہی یہ خبر دے دی تھی کہ ان کے بعد ان کے جانشین (خلیفہ) قبیلہ قریش سے ہوں گے[1] اور ساتھ ہی اس کی وجہ بھی بیان فرما دی تھی۔ اس سلسلہ میں بہت سی احادیث وارد ہیں اور امام بخاریؒ نے تو "الامراء من قریش" (کتاب الاحکام) کے عنوان سے ایک مستقل باب بھی باندھا ہے۔ چند ایک احادیث ذیل میں درج کی جاتی ہیں۔

۱- الناس تبع لقریش فی ھذا الشان مسلمھم تبع لمسلمھم وکافرھم تبع کافرھم
(مسلم - کتاب الامارۃ باب الناس تبع لقریش والخلافۃ فی قریش)

"موجودہ (صورت حال یہ ہے کہ) لوگ قبیلہ قریش ہی کی پیروی کر سکتے ہیں۔ جو مسلمان ہیں وہ مسلمان قریش کی اور جو کافر ہیں وہ کافر قریش کی۔"

گویا امر خلافت کے قبیلہ قریش سے منسوب ہونے کی وجہ یہ تھی کہ عرب قبائل قریش کے علاوہ کسی دوسرے قبیلہ کی اطاعت گوارا ہی نہ کر سکتے تھے۔

آپ نے یہ بھی فرما دیا تھا کہ میرے بعد خلفاء قبیلہ قریش سے ہوں گے۔ اور ۱۲ خلفاء تک اسلام غالب رہے گا اور یہ سب قبیلہ قریش سے ہوں گے۔

۲- عن جابر بن سمرۃ یقول سمعت النبی صلی اللہ علیہ وسلم یقول: لایزال

---

[1] یہ کوئی حکم نہیں تھا بلکہ اس کی حیثیت بھی من ابناء الغیب کی سی تھی۔ جیسے آپؐ نے جنگ بدر کے شروع ہونے سے قبل یہ خبر دی تھی کہ ابوجہل اس جگہ مارا جائے گا۔ یا رحلت کے وقت یہ خبر دی تھی کہ میرے اقرباء میں سے سب سے پہلے فاطمہ مجھے آملے گی۔

الاسلام عزیزا الی اثنی عشر خلیفۃً ثم قال کلمۃ لم افہمہا - فقلت لابی ما قال ؟ فقال کلہم من قریش - (مسلم - ایضاً) (بخاری کتاب الاحکام - باب الاستخلاف)

" جابر بن سمرۃ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے سنا کہ " اسلام بارہ خلفاء تک غالب رہے گا " پھر ایک فقرہ کہا جو میں سمجھ نہ سکا - میں نے اپنے باپ سے کہا کہ آپ نے کیا فرمایا ہے ؟ میرے باپ نے کہا کہ آپؐ نے فرمایا ہے - یہ سب قریش سے ہونگے "

علاوہ ازیں ایسے واضح اشارات بھی ملتے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ خلافت انصار میں نہیں ہوگی. مثلاً حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی مرض الموت میں جو آخری خطبہ دیا اس میں مہاجرین کو یہ وصیت فرمائی کہ انصار سے نیک سلوک کرنا - آپؐ نے فرمایا :-

۳ - اقبلوا عن محسنہم و تجاوزوا عن مسیئہم - (بخاری - کتاب المناقب باب ایضاً)

" انصار میں سے جو کوئی نیک ہو اس کی قدر کرنا اور جو برا ہو اس کے قصور سے درگزر کرنا "

مہاجرین سے اس طرح کی سفارش کرنا اس بات کی واضح دلیل ہے کہ آپ کو علم ہو چکا تھا کہ میرے بعد خلافت انصار کو نہیں بلکہ مہاجرین کو ملنے والی ہے -

اسی طرح آپؐ نے انصار کو فرمایا :-

۴ - انکم ستلقون بعدی اثرۃً فاصبروا حتیٰ تلقونی و موعدکم الحوض -

(بخاری - حوالہ ایضاً)

" تم کو میرے بعد ناخوش گواری پیش آئے گی - تو تم صبر کرنا - یہاں تک کہ تم مجھ سے حوضِ کوثر پر آکر ملاقات کرو "

اس صبر کی تلقین سے بھی یہ واضح ہے کہ امارت انصار میں نہیں ہوگی - اور اس تلقین کا پس منظر یہ ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ انصار کو بحرین کا ملک بطور جاگیر دینا چاہا تھا تو انصار نے یوں جواب دیا تھا :-

۵ - عن انس بن مالکؓ قال دعا النبی صلی اللہ علیہ وسلم الانصار الی ان یقطع لہم البحرین فقالوا : لا الّا ان تقطع الاخوان من المہاجرین مثلہا - قال : امّا لا فاصبروا حتی تلقونی فانہ سیصیبکم بعدی اثرۃٌ -

(بخاری - کتاب المناقب - باب قول النبی للانصار اصبرونی حتیٰ تلقونی علی الحوض)

انس بن مالکؓ کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انصار کو بلایا اور ان کو بحرین کا ملک بطور جاگیر کے دینا چاہا۔ انھوں نے کہا "ہم تو اس وقت تک نہیں لیں گے جب تک کہ ہمارے مہاجرین بھائیوں کو بھی ایسا ہی ملک نہ ملے"۔ آپؐ نے فرمایا۔ "اگر اب تم قبول نہیں کرتے (امارت وحکومت) تو پھر مجھ سے ملاقات تک (زندگی بھر) صبر کیے رہنا۔ میرے بعد تمھیں (امارت سے محرومی) کی ناخوشگواری پیش آنے والی ہے"۔

۲۔ حضرت ابوبکرؓ کی خلافت کے متعلق واضح ارشادات

آپؐ نے قریش ہیں سے حضرت ابوبکرؓ کو خلیفہ نامزد کرنے کا خیال بھی فرمایا تھا لیکن بعد میں یہ ارادہ ترک کر دیا۔ کیونکہ مشیتِ خداوندی یہی تھی کہ آپؐ کے بعد حضرت ابوبکرؓ ہی خلیفہ منتخب ہوں گے۔ جیسا کہ آپؐ کے درجِ ذیل ارشاد سے واضح ہے۔

۱۔ لقد هممت اواردت ان ارسل الی ابی بکر وابنه واعهد ان یقول القائلون ویتمنی المتمنون ثم قلت: یأبی الله ویدفع المؤمنون اویدفع الله ویأبی المؤمنون۔ (بخاری-کتاب المرضیٰ)

مَیں نے یہ قصد کیا کہ کسی کو بھیج کر ابوبکرؓ اور ان کے بیٹے عبدالرحمان کو بلا بھیجوں اور ابوبکرؓ کو اپنا جانشین کر جاؤں تاکہ میرے بعد کہنے والے کچھ اور کہیں اور آرزو کرنے والے (خلافت کی) آرزو کرنے لگیں۔ پھر مَیں نے (دل میں) کہا۔ خود اللہ کسی اور کو خلیفہ نہ ہونے دے گا۔ نہ مسلمان اور کسی کی اطاعت قبول کریں گے۔

اسی مضمون کی متعدد روایات مسلم (بابِ فضائلِ ابوبکرؓ) میں اس طرح وارد ہیں:۔

۲۔ عن عائشة قالت: قال لی رسول الله صلی الله علیه وسلم فی مرضه ادعی لی ابا بکر اباكِ واخاكِ حتی اكتب كتابا فانی اخاف ان یتمنی متمنٍ ویقول قائل انا اولی ویأبی الله والمؤمنون الا ابا بکر۔

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں۔ مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی مرض موت کے دوران فرمایا:۔ اپنے باپ ابوبکرؓ اور اپنے بھائی (عبدالرحمان) کو بلا بھیجو تاکہ میں وصیّت لکھ دوں۔ مجھے ڈر ہے کہ حریص اس کی آرزو کریں گے اور کچھ کہنے والے یہ بھی کہیں گے کہ خلافت کا حقدار مَیں زیادہ ہوں۔ مگر ابوبکرؓ کی خلافت کے سوا نہ ہی اللہ کسی دوسرے

کی خلافت کو تسلیم کرے گا اور نہ مسلمان"۔

۳۔ عن ابی ملیکۃ قال سمعت عائشۃ وسئلت من کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مستخلفاً لو استخلفہٗ؟ قالت: ابوبکر" قیل لھا" ثم من بعد ابی بکر"؟ قالت: "عمر" ثم قیل لھا: "من بعد عمر"؟ قالت ابو عبیدۃ بن الجراح۔ ثم انتھت الی ھذا۔ (مسلم۔کتاب الفضائل۔باب فضائل ابوبکر)

"ابوملیکہؓ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت عائشہؓ سے سُنا اور پھر ان سے پُوچھا کہ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کسی کو خلیفہ بناتے تو کسے بناتے"۔ فرمانے لگیں: "ابوبکرؓ کو"۔ پُوچھا گیا۔ "حضرت ابوبکرؓ کے بعد پھر کس کو"؟ فرمانے لگیں۔ "عمرؓ کو"۔ پھر پُوچھا گیا۔ "عمرؓ کے بعد پھر کس کو"؟ فرمایا: ابوعبیدہ بن الجراح کو"۔ اور یہاں بات ختم کر دی"۔

۴۔ حضرت ابوبکرؓ کی خلافت سے متعلق واضح اشارات

علاوہ ازیں بہت سے ایسے واقعات بھی ملتے ہیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد حضرت ابوبکرؓ کی خلافت پر صریح دلالت کرتے ہیں۔ مثلاً:۔

۱۔ عن الجبیر ابن مطعم عن ابیہ قال اتت النبی صلی اللہ علیہ وسلم امرأۃ فکلمتہ فی شیءٍ فامرھا ان ترجع الیہ: قالت ان جئت ولم اجدك کانھا ترید الموت قال فان لم تجدنی فأتی ابا بکر"۔

(بخاری کتاب الاحکام باب الاستخلاف) (مسلم باب فضائل ابوبکر)

"جبیر بن مطعم اپنے والد سے روایت کرتے ہیں! ایک عورت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئی اور آپؐ سے ایک امر میں کچھ عرض کیا۔ آپ نے فرمایا: "پھر کسی وقت آنا"۔ اس نے کہا: "یارسول اللہ! اگر میں پھر آؤں اور آپ کو نہ پاؤں، یعنی آپ کی وفات ہوگئی ہو تو کیا کروں"۔ فرمایا: اگر مجھے نہ پائے تو حضرت ابوبکرؓ کے پاس آئیو"۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں (مرض الموت میں) مسجد نبوی میں جماعت کی امامت حضرت ابوبکرؓ کراتے تھے جس کا حکم خود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دیا تھا:۔

۲۔ عن عائشۃ ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال لھا مری ابوبکر یصلّ بالناس قالت انہ رجل اسیف متیٰ تقم مقامك۔ رق، غ ا د،

فعادت۔ قال شعبۃ : فقال فی الثالثۃ اوالرابعۃ : ان کن صواحب یوسف مروا ابا بکر (بخاری۔ کتاب بدا الخلق۔ باب قول اللہ تعالیٰ لقد کان فی یوسف واخوتہ .....)

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مرض الموت میں فرمایا "ابوبکرؓ سے کہو وہ لوگوں کو نماز پڑھائیں"۔ حضرت عائشہؓ نے عرض کیا۔ وہ تو نرم دل انسان ہیں۔ آپ کی جگہ کھڑے ہوں گے تو ان پر رقت طاری ہوجائے گی۔ آپ نے دوبارہ وہی بات دہرائی۔ حضرت عائشہؓ نے پھر وہی جواب دیا۔ حضرت شعبہؓ (اس حدیث کے راوی) کہتے ہیں آپؐ نے تیسری یا چوتھی بار بھی یہی فرمایا اور کہا "تم تو حضرت یوسفؑ والی عورتیں ہو (ظاہر کچھ باطن کچھ) ابوبکر سے کہو نماز پڑھائیں"۔

۳۔ عن ابی بردۃ ابی موسیٰ عن ابیہ قال مرض النبی صلی اللہ علیہ وسلم فقال مروا ابا بکر فلیصل بالناس فقالت ان ابا بکر رجل رقیق القلب فقال مثلہ فقالت مثلہ فقال مروہ فان کن صواحب یوسف فامّ ابوبکر فی حیاۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم فقال حسین عن زائدۃ رجل رقیق (بخاری حوالہ ایضا)

"ابوبردہ اپنے والد موسیٰ اشعریؓ سے روایت کرتے ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بیمار ہوئے تو فرمایا ابوبکرؓ سے کہو وہ نماز پڑھائیں۔ حضرت عائشہؓ نے کہا وہ تو (نرم دل) انسان ہیں۔ آپ نے پھر وہی حکم دیا۔ حضرت عائشہؓ نے پھر وہی کچھ عرض کیا۔ آپؐ نے فرمایا "ابوبکرؓ سے کہو نماز پڑھائیں تم تو حضرت یوسفؑ کی ساتھ والیاں ہو"۔ پھر آپ کی زندگی بھر (وفات تک) حضرت ابوبکرؓ لوگوں کی امامت کراتے رہے حسین بن علی جعفی نے اس حدیث کو زائدہ سے روایت کیا۔ یعنی "ابوبکرؓ نرم دل انسان ہیں"۔

۴۔ عن انس بن مالک ان المسلمین بیناھم فی صلوٰۃ الفجر من یوم الاثنین وابوبکر یصلی لھم لم یفجاھم الا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قد کشف ستر حجرۃ عائشۃ فنظر الیھم وھو فی صفوف الصلوٰۃ ثم تبسّم یضحک فنکص ابوبکر علیٰ عقبیہ لیصل الصف وظن ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یرید ان یخرج الی الصلوٰۃ۔ قال انس : وھمّ

المسلمون ان یفتتنوا فی صلاتھم فرحًا برسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔
فاشار الیھم بیدہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان اتمّوا صلاتکم۔ ثم
دخل الحجرۃ و ارخی الستر۔ (بخاری۔ کتاب المغازی باب مرض النبیؐ)

"حضرت انس بن مالکؓ کہتے ہیں کہ مسلمان پیر کے دن صبح کی نماز حضرت ابوبکر صدیقؓ کے پیچھے پڑھ رہے تھے۔ اتنے میں وہ چونک گئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہؓ کا پردہ اٹھایا۔ مسلمانوں کو دیکھا کہ وہ نماز میں صفیں باندھے کھڑے ہیں۔ آپؐ مسکرا کر ہنس دیے۔ یہ دیکھ کر حضرت ابوبکرؓ ایڑیوں کے بل پیچھے سرکے تاکہ صف میں شامل ہو جائیں۔ وہ سمجھے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نماز کے لیے برآمد ہوا چاہتے ہیں۔ انسؓ کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھ کر مسلمانوں کو اتنی خوشی ہوئی کہ نماز توڑنے ہی کو تھے کہ آپؐ نے ہاتھ سے اشارہ فرمایا کہ اپنی نماز پوری کرو۔ پھر حجرے کے اندر داخل ہو گئے اور پردہ ڈال لیا۔

اور یہ تو ظاہر ہے کہ اسلامی نقطۂ نظر سے نماز کی امامت اور ملک کی امامت فردِ واحد کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔

۵۔ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ۹ھ میں حضرت ابوبکرؓ کو اپنے قائم مقام کی حیثیت سے امیر الحج بنا کر بھیجا۔

ان ابا ھریرۃ اخبرہٗ ان ابا بکر الصدیق بعثہٗ فی الحجۃ التی امر علیھا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قبل حجۃ الوداع یوم النحر فی رھط یوذن فی الناس ان لا یحج البیت بعد العام مشرک ولا یطوف بالبیت عریانٌ۔ (بخاری۔ کتاب المناسک۔ باب لا یطوف بالبیت عریان)

"انھیں حضرت ابوہریرہؓ نے بتلایا کہ ابوبکر صدیقؓ نے ان کو چند اور لوگوں کے ساتھ اس حج میں بھیجا جو حجۃ الوداع سے پہلے تھا جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکرؓ صدیق کو امیر مقرر کیا تھا تاکہ وہ ذی الحجہ کی دسویں تاریخ کو لوگوں میں منادی کر دیں کہ اس سال کے بعد کوئی مشرک بیت اللہ کا حج نہ کرے اور نہ ہی کوئی ننگا بیت اللہ کا طواف کرے۔"

حج کی امارت بھی اس کی طرف واضح اشارہ تھا کہ آپؐ کے بعد ملت کی امامت کی ذمہ داری حضرت ابوبکرؓ پر ہی ہوگی۔

اور درج ذیل حدیث میں حضرت ابوبکرؓ پھر اس کے بعد حضرت عمرؓ کی صرف خلافت کا ہی اشارہ نہیں، بلکہ ان کی مدّتِ خلافت اور انتظام مملکت پر بھی روشنی پڑتی ہے :-

۲۔ عن ابی ھریرۃ قال سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول : بینا انا نائمٌ۔ رایتنی علی قلیبٍ علیھا دلوٌ فنزعتُ منھا ماشاء اللہ، ثم اخذ ھا ابن ابی قحافۃ فنزع بھا ذنوبًا او ذنوبین وفی نزعہٖ ضعفٌ واللہ یغفر لہ ضعفہٗ۔ ثم استحالت غربًا فاخذھا ابن الخطاب فلم ارَ عبقریًا من الناس ینزع نزع عمر حتی ضرب الناس بعطنٍ۔

(بخاری۔ کتاب مناقب۔ باب فضائل ابوبکر)

حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سُنا۔ آپ فرماتے تھے:" ایک بار ایسا ہوا، میں سو رہا تھا۔ میں نے خود کو ایک کنوئیں پر دیکھا جس پر ایک ڈول رکھا تھا۔ میں نے اس کنوئیں سے چند ڈول نکالے جتنے اللہ کو منظور تھے۔ پھر ابوبکرؓ نے ڈول پکڑا اور ایک یا دو ڈول نکالے مگر کمزوری کے ساتھ۔ اللہ اس کی کمزوری معاف فرمائے۔ پھر وہ ڈول ایک بڑا چرسہ بن گیا۔ عمرؓ نے اسے پکڑا اور میں نے ایسا شہ زور پہلوان نہیں دیکھا جو اس کی طرح پانی کھینچتا ہو۔ اس نے اتنا پانی نکالا کہ لوگوں نے اپنے اُونٹوں کو حوض سے سیراب کر لیا۔

۴۔ افضلیتِ حضرت ابوبکرؓ

اُمتِ مسلمہ کا امیر یا خلیفہ بھی وہی شخص ہو سکتا ہے جو سب سے بہتر ہو۔ حضرت ابوبکرؓ کی دیگر تمام صحابہؓ پر افضلیت کی بہت سی روایات ملتی ہیں۔ مثلاً :-

۱۔ وعن ابی سعید الخدری ...... وکان ابوبکر اعلمنا فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم : ان اَمَنَّ الناس علیَّ فی صحبتہٖ ومالہ ابا بکر ولو کنت متخذًا خلیلاً غیر ربی لاتخذت ابا بکر ولٰکن اخوۃ الاسلام ومودّتہ۔ لایبقین بابٌ فی المسجد الا سدَّ الا باب ابی بکر۔

(بخاری۔ کتاب المناقب۔ فضائل ابوبکر)

حضرت ابوسعید خدریؓ کہتے ہیں ...... اور حضرت ابوبکرؓ سب صحابہؓ سے زیادہ

علم والے تھے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے (اسی خطبہ میں) یہ بھی فرمایا: "صحبت کے لحاظ سے بھی اور مال کے لحاظ سے بھی ابوبکرؓ کا مجھ پر احسان اور سب لوگوں سے زیادہ ہے۔ اور اگر میں اپنے پروردگار کے سوا کسی اور کو جانی دوست بناتا تو ابوبکرؓ کو بناتا۔ البتہ اسلام کا بھائی چارہ اور محبت ان سے ہے، دیکھو مسجد کی طرف ابوبکرؓ کے دروازہ کے سوا باقی سب کے دروازے بند کر دیئے جائیں۔"

۲۔ عن ابن عمر قال کنا نخیر من الناس فی زمن النبی صلی اللہ علیہ وسلم فنخیّر ابا بکر ثم عمر بن الخطاب ثم عثمان بن عفان (حوالہ مذکور)

(عبداللہ) بنؓ عمر کہتے ہیں کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں حضرت ابوبکرؓ کو سب سے افضل سمجھتے تھے پھر حضرت عمرؓ کو پھر حضرت عثمان بن عفانؓ کو۔

۳۔ ایک دفعہ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ میں کچھ تکرار ہوگئی۔ اسی حالت میں پہلے حضرت ابوبکرؓ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور واقعہ بیان کر کے اپنی غلطی کا اعتراف کر لیا۔ پھر حضرت عمرؓ حضرت ابوبکرؓ کا پیچھا کرتے ہوئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور انھوں نے بھی اپنی غلطی کا اعتراف کر لیا (یعنی دونوں نے اپنی اپنی غلطی کا اعتراف کیا) پھر بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یوں فرمایا:۔

ان اللہ بعثنی الیکم فقلتم کذبت وقال ابوبکر صدق وصانی بنفسہ ومالہ فھل انتم تارکوالی صاحبی مرّتین فما اوذی بعدھا۔ (حوالہ مذکور)

اللہ تعالیٰ نے مجھے تمہاری طرف مبعوث فرمایا تو تم نے مجھے جھوٹا کہا اور ابوبکرؓ نے مجھے سچا کہا۔ پھر اس نے مال اور جان سے میری خدمت کی۔ تو پھر کیا تم میرے دوست کو ستانا نہیں چھوڑتے"؟ (دوبارا ایسا کہا) اس کے بعد حضرت ابوبکرؓ کو کسی نے نہیں ستایا۔

۴۔ عن محمد بن الحنفیۃ قال: قلت لابی ایّ الناس خیرٌ بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال "ابوبکر" قلت ثم من؟ قال "عمر" وخشیت ان یقول عثمان قلت ثم انت؟ قال ما انا الّا رجلاً من المسلمین۔

(حوالہ مذکور)

محمد بن حنفیہؒ کہتے ہیں میں نے اپنے والد (حضرت علیؓ) سے پوچھا۔ آنحضرتؐ کے

بعد سب لوگوں سے بہتر کون ہے ؟ آپ نے فرمایا "ابوبکرؓ" میں نے پوچھا "پھر کون"؟
فرمایا "عمرؓ" اب میں ڈرا کہ اب کی مرتبہ عثمانؓ نہ کہہ دیں لہٰذا میں نے خود ہی کہہ دیا "پھر آپ"؟ فرمانے لگے۔ "میں تو عام مسلمانوں میں سے ایک شخص ہوں"

۵- عن ابن عباس قال انی لواقفٌ علی قوم یدعوا اللہ لعمر بن الخطاب وقد وضع علی سریرہ اذا رجل من خلفی قد وضع مرفقته علی منکبی یقول: رحمك اللہ ان کنت لارجوا ان یجعلك اللہ مع صاحبیك لانہ لانی کثیرا ماکنت اسمع رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم یقول کنت وابوبکر وعمرؓ وفعلت وابوبکر وعمر، وانطلقت وابوبکر وعمر، فاذا کنت لارجوا ان یجعلك اللہ معهما فالتفت فاذا هو علی ابن ابی طالب (حوالہ ایضاً)

"حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں میں ان لوگوں میں کھڑا تھا جو حضرت عمرؓ کے لیے مغفرت کی دُعا کر رہے تھے اور ان کا جنازہ تختہ پر رکھا ہوا تھا۔ اتنے میں ایک شخص نے اپنی کہنی میرے مونڈھے پر رکھی اور کہنے لگا: "اللہ تم پر رحم کرے مجھے یہی اُمید ہے کہ خدا تمھیں اپنے دونوں ساتھیوں کے ساتھ رکھے گا۔ کیونکہ میں اکثر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سُنا کرتا تھا، کہا کرتے تھے۔ فلاں جگہ میں تھا اور ابوبکرؓ اور عمرؓ۔ میں نے اور ابوبکرؓ اور عمرؓ نے یہ کام کیا۔ میں اور ابوبکرؓ اور عمرؓ چل پڑے۔ سو مجھے یہی اُمید ہے کہ اللہ آپؓ کو ان کے ساتھ رکھے گا۔ میں نے مڑ کر دیکھا تو یہ کہنے والے حضرت علیؓ ابن ابی طالب تھے۔"

۵- امتناع طلب امارت و مناصب

جیسا کہ ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں کہ خلیفہ ابوبکرؓ کو نامزد کرنے کا خیال حضورؐ کو صرف اس وجہ سے آیا تھا کہ مبادا امارت کے لیے کچھ لوگ آرزو کریں اور کچھ دوسرے یوں کہیں کہ وہ تو ہمارا حق تھا اور ہم سے ناانصافی ہوئی وغیرہ وغیرہ ۔۔۔۔۔ تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے کئی ارشادات میں بالعموم یہ وضاحت فرما دی کہ امارت یا منصب طلب کرنا یا اس کی خواہش کرنا ایک مذموم فعل ہے۔ چنانچہ درج ذیل ارشادات ملاحظہ ہوں۔

۱- عن عبدالرحمٰن بن سمرة قال: قال لی رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم یا عبدالرحمٰن بن سمرة! لا تسئل الامارة فان اعطیتها عن مسئلة

وكّلت اليها وان اعطيتها من غير مسئلة اعنت عليها - (بخاری - کتاب الاحکام - باب من سال الامارة) (مسلم - کتاب الامارة باب النهي عن طلب الامارة والحرص عليها)

حضرت عبدالرحمٰن بن سمرہ کہتے ہیں مجھ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے عبدالرحمٰن بن سمرة! حکومت اور سرداری کی درخواست نہ کیجیو۔ اگر درخواست پر تجھے ملے گی تو تمام تر ذمہ داری تمہی پر ہوگی اور تمھیں بغیر درخواست مل جائے تو اللہ تیری مدد کرے گا۔

۲ - عن ابی موسیٰ قال: دخلت على النبي صلى الله عليه وسلم انا ورجلان من بنی عمّی فقال احد الرجلين: يا رسول الله! امّرنا على بعض ولاك الله عزو جل وقال الأخر مثل ذٰلك فقال: "اما والله لا نولی علی هذا العمل احدا يسأله ولا احد حرص عليه - (مسلم کتاب الامارة، باب النهي عن طلب الامارة والحرص عليها) (بخاری - کتاب الاحکام - باب مایکره من الحرص على الامارة)

"حضرت ابوموسیٰؓ کہتے ہیں میں اور میرے دو چچا زاد بھائی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس گئے۔ ان میں سے ایک نے کہا" یارسولؐ اللہ! اللہ نے آپ کو حکومت بخشی ہے اس کے کچھ حصّہ پر ہمیں حاکم بنا دیجئے۔" پھر دوسرے نے بھی ایسی ہی بات کہی۔ آپؐ نے فرمایا "خدا کی قسم! ہم کسی ایسے آدمی کو حاکم نہیں بنایا کرتے جو اس کے لیے درخواست کرے اور نہ ہی کسی ایسے شخص کو حاکم بناتے ہیں جو اس کی حرص رکھتا ہو۔"

وفی روایة قال: لا نستعمل على عملنا من ارادهٗ (متفق علیه - حواله مذکور)

ایک دوسری روایت میں ہے۔ آپ نے فرمایا" ہم اپنے انتظامی اُمور میں کسی ایسے شخص کو شریک نہیں کرتے جو اس کا ارادہ رکھتا ہو۔

۳ - عن ابی ذرٍ قال: قلت: یارسول الله الا تستعملنی"؟ قال فضرب بيده على منكبي ثم قال: يا اباذر! انك ضعيف وانها امانة وانها يوم القيٰمة خزی وندامة الا من اخذها بحقها وادّى الذی عليه فيها -
(مسلم - حواله مذکور)

حضرت ابوذر غفاریؓ سے روایت ہے میں نے کہا" اے اللہ کے رسولؐ! کیا آپ مجھے حاکم نہیں بنا دیتے"؟ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا ہاتھ میرے مونڈھے

پر رکھا اور فرمایا: "اے ابوذرؓ! تو ضعیف آدمی ہے اور حکومت ایک امانت ہے جو قیامت کے دن رسوائی اور پشیمانی کا باعث بنے گی۔ مگر جس نے اس کی ذمہ داریوں کو نباہا اور اس کے پورے حقوق ادا کیے۔

۴۔ عن ابی ھریرۃ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال: انکم ستحرصون علی الامارۃ وستکون ندامۃ یوم القیمۃ فنعم المرضعۃ وبئست الفاطمۃ۔
(بخاری۔ کتاب الاحکام۔ باب ما یکرہ من الحرص .....)

حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ تم لوگ عنقریب حکومت اور سرداری کی حرص کرو گے اور قیامت کے دن اس کی وجہ سے شرمندگی ہوگی۔ سو حکومت ایک انا کی طرح ہے) دودھ پیتے وقت تو مزہ ہے مگر چھٹتے وقت سخت تکلیف۔

جاہ طلبی، دولت کی حرص دو ایسے جرائم ہیں جو ایک فلاحی مملکت کو بیخ و بن سے ہلا کر رکھ دیتے ہیں۔ آپ نے ان دونوں باتوں سے ان الفاظ میں منع فرمایا:۔

۵۔ عن کعب ابن مالک عن ابیہ قال: قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم:
"ما ذئبان جائعان اُرسلا فی غنمٍ بافسد لھا عن حرص المرء علی المال والشرف لدینہ۔ (ترمذی)

"حضرت کعب بن مالک اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بکریوں کے ریوڑ میں دو بھوکے بھیڑیے اتنی تباہی نہیں مچا سکتے جتنی انسان کی حرصِ جاہ و مال اس کے دین کے لیے تباہ کن ہو سکتی ہے"۔

آئندہ واقعات سے یہ ثابت ہو جائے گا کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اس معیار پر بھی پورے اُترتے ہیں۔

انتخاب حضرت ابوبکر صدیقؓ

۱۔ خلافت کے لیے بنی ہاشم کی تمنّا

پہلے ذکر کیا جا چکا ہے کہ جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو حضرت ابوبکرؓ کو خلیفہ نامزد کرنے کا خیال پیدا ہوا تو اس کی وجہ بھی بتلا دی کہ مبادا اس وقت بعض لوگ خلافت کی آرزو کرنے لگیں یا کچھ دوسرے باتیں بنانے لگیں کہ خلافت تو دراصل ہمارا حق تھا۔ پھر آپؐ نے جو استخلافِ ابوبکرؓ کا ارادہ ترک کر دیا تو اس کی وجہ بھی مذکور ہے کہ ابوبکرؓ کے علاوہ کسی دوسرے کا خلیفہ بننا نہ تو اللہ کی مشیت میں ہے اور نہ ہی مسلمان مجموعی طور پر ابوبکرؓ کے علاوہ کسی دوسرے پر اتفاق کریں گے۔ (اور آپؐ پیش از وقت کسی کی دل شکنی نہیں کرنا چاہتے تھے) چنانچہ یہ دونوں باتیں پوری ہو کر رہیں۔

سب سے پہلے خلافت کا خیال بنو ہاشم کو آیا۔ قبیلہ قریش کے اس وقت دس چھوٹے قبائل مشہور تھے۔ ان میں سے ایک بنو ہاشم تھے۔ یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے قرابت کی وجہ سے اپنے آپ کو خلافت کا حق[1] دار سمجھتے تھے۔ ان کے پیشوا حضرت علیؓ تھے اور حضرت عباسؓ، ابن عباسؓ اور حضرت زبیرؓ (جو عشرہ مبشرہ میں سے ہیں) ان کے رشتہ دار اور امرِ خلافت میں ان کے معاون تھے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی مرض الموت میں بقیدِ حیات تھے کہ حضرت عباسؓ کو یہ آرزو پیدا ہوئی کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنے حق میں فیصلہ لے لینا چاہیئے۔ درج ذیل حدیث اس بات پر پوری طرح روشنی ڈالتی ہے:۔

عن ابن عباسٍ انّ علی ابن ابی طالبٍ خرج من عند رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی وجعہ الذی توفی بہٖ فقال الناس : یا ابا حسنٍ ! کیف اصبح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم؟ فقال : "اصبح بحمد اللہ بارئًا" فاخذ بیدہٖ عباس بن عبد المطلب فقال لہٗ : "انت واللہ بعد ثلاثٍ

---

[1] اوقال قائل انا اولیٰ والی بات پوری ہوئی۔

عبد العصا، وانی واللہ لاریٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سوف یتوفی فی وجعہ ھذا انی لاعرف وجوہ بنی عبد المطلب عند الموت، اذھب بنا الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فلنسئلہ فیمن ھذا الامران کان فینا علمنا وان کان فی غیرنا علمناہ فاوصیٰ بنا۔" فقال علیؓ انا واللہ لئن سئلناھا فمنعناھا لایعطیناھا الناس بعدہ وانی واللہ لا اسئلھا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ (بخاری۔ باب مرض النبی)

حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بیماری کے دوران جس میں آپؐ کی وفات ہوئی۔ حضرت علیؓ آپ کے پاس سے باہر نکلے۔ لوگوں نے پوچھا: "اے ابوالحسن! آج آپؐ کا مزاج کیسا ہے"؟ حضرت علیؓ نے کہا: "بحمداللہ تندرست ہیں"۔ یہ سُن کر عباسؓ نے حضرت علیؓ کا ہاتھ پکڑا اور کہنے لگے: "خدا کی قسم۔ تین دن کے بعد تم غلام بن جاؤ گے۔ اور میں بخدا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرہ پر وہ آثار دیکھ رہا ہوں جو بنی عبد المطلب کے خاندان کے لوگوں کے منہ پر بوقت وفات ظاہر ہوتے ہیں۔ سو آؤ حضور اکرمؐ کے پاس چلیں اور امرِ خلافت کے متعلق پوچھ لیں۔ اگر ہمیں ملتی ہے تو بھی معلوم ہو جائے گا اور دوسروں کو ملتی ہے تو پتہ چل جائے گا۔ تاکہ حضورؐ ہمارے متعلق (حسن سلوک کی) وصیت ہی کر جائیں"۔ حضرت علیؓ نے کہا:

"خدا کی قسم! اگر ہم نے حضورؐ سے یہ سوال کیا اور انھوں نے انکار کر دیا تو پھر لوگ آئندہ کبھی خلافت نہ دیں گے۔ لہٰذا بخدا میں حضورِ اکرمؐ سے کبھی یہ سوال نہیں کروں گا"۔

اس واقعہ سے چند دن پہلے (وفات النبیؐ سے چار دن قبل) مشہور واقعہ قرطاس بھی پیش آیا تھا۔ اس کے راوی بھی عبداللہ بن عباس ہیں۔ اور یہ واقعہ بھی حدیث کی معتبر کتابوں یعنی بخاری مسلم وغیرہ میں مذکور ہے۔ اس واقعہ کے نکات یہ ہیں:۔

۱۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے قلم دوات طلب فرمائی تاکہ ایسا وصیت نامہ لکھوا دیں جس سے اُمت گمراہ نہ ہو۔

۲۔ حضرت عمرؓ نے یہ حالت دیکھ کر فرمایا۔ حسبنا کتاب اللہ یعنی ہمیں ہدایت کے لیے کتاب اللہ کافی ہے۔ لہٰذا اس حالت میں حضورؐ کو تکلیف نہ دینی چاہیئے۔

۳۔ حاضرین میں تکرار شروع ہو گئی کہ قلم دوات لائی جائے یا نہ لائی جائے۔

۴ ۔ حضور اکرمؐ نے ایسا شور سُن کر فرمایا۔ یہاں سے چلے جاؤ۔

۵ ۔ حضرت عبداللہ بن عباس کہا کرتے تھے۔ ہائے مصیبت! وائے مصیبت! ہائے جمعرات کا دن، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اختلاف اور بک بک نے یہ کتاب نہ لکھوانے دی۔ (اور وُہ اس سے حضرت علیؓ کی امامت کے لیے وصیّت لکھنا خیال کرتے تھے۔ (بخاری ۔ کتاب المغازی۔ باب مرض النبیؐ)

علامہ شبلی نعمانی نے اس واقعہ پر کئی پہلوؤں سے تنقید کی ہے۔ مثلاً :۔

۱ ۔ یہ حدیث کئی طریقوں سے مذکور ہے۔ لیکن ان سب کے راوی صرف عبداللہ بن عباس ہیں۔ جن کا موقع پر موجود ہونا بھی ثابت نہیں۔

۲ ۔ حاضرین میں سے کسی نے بھی ایسے اہم واقعہ کو روایت نہیں کیا۔

۳ ۔ حضرت عبداللہ بن عباس کی عمر اس وقت صرف ۱۳ ۔ ۱۴ سال تھی۔

۴ ۔ نبیؐ سے ہذیان اور خصوصاً تشریعی امور میں ناممکن ہے۔ نیز حدیث میں کہیں ہذیان کی بات کا کوئی ذکر تک نہیں۔

ان تمام باتوں سے وہ یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عباس کی عدالت میں شک نہیں۔ لیکن چونکہ وہ خود موقعہ پر موجود نہ تھے لہٰذا ممکن ہے انھیں صحیح کوائف نہ پہنچے ہوں۔ (الفاروق۔ واقعہ قرطاس)

پھر یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ یہ تو حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا محض ایک خیال تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم خلافت کے لیے وصیت نامہ لکھوانا چاہتے تھے۔ مگر حقیقتاً ایسا نہیں تھا۔ کیونکہ اس خیال کی کئی باتیں نفی کرتی ہیں۔ مثلاً :۔

۱ ۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا حضرت ابوبکرؓ کو خلیفہ بنانے کا ارادہ اور پھر اس سے رُک جانا (جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے)۔

۲ ۔ بخاری کے اس باب میں انہی حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے مروی ہے کہ لوگوں کے جانے کے بعد حضورؐ نے تین باتوں کی زبانی وصیّت فرمائی۔ ایک یہ کہ مشرکوں کو عرب کے جزیرے سے باہر کر دینا۔ دوسرے ایلچی لوگوں کی اسی طرح خاطر کرنا جس طرح مَیں کرتا تھا اور تیسری انھوں نے بیان نہیں کی اور کہا کہ مَیں بھول گیا۔

۳ ۔ بخاری کے اسی باب میں ایک روایت ہے جس کے الفاظ یُوں ہیں: جب آپ گھبراتے تو مُنہ

کھول دیتے۔ اسی حالت میں یوں فرماتے۔ یہود و نصاریٰ پر اللہ کی لعنت۔ انھوں نے اپنے پیغمبروں کی قبروں کو مسجدیں بنا لیا"

۴۔ واقعہ قرطاس سے چار دن بعد آپ کی وفات ہوئی اور آپ کی حالت بھی بہتر ہوگئی۔ آپ نے بہت سی باتیں بھی ارشاد فرمائیں لیکن اس قلم دوات کا ذکر تک نہیں کیا۔ نہ ہی آپ نے کسی کو خلیفہ نامزد فرمایا۔

۲۔ وفاتُ النبیؐ کے وقت حضرت ابوبکرؓ کی غیر موجودگی

پیر کے دن آپؐ کی وفات ہوئی۔ آپؐ کی وفات کے وقت حضرت ابوبکرؓ مدینہ میں موجود نہ تھے بلکہ ایک دن پہلے افاقہ کی خبر سُن کر مدینہ سے دو میل دُور مقام سُنح اپنے گھر چلے گئے تھے۔ وفات کی خبر سُن کر مدینہ تشریف لائے۔ حضرت عمرؓ کو تو یقین ہی نہیں آتا تھا کہ حضورؐ وفات پا چکے ہیں۔ آپ بازار میں تلوار سونت کر کھڑے ہو گئے اور کہنے لگے جو یہ کہے گا کہ حضورؐ فوت ہو چکے ہیں۔ میں اس کا سر قلم کر دوں گا۔[1]

حضرت ابو سلمہ (بن عبد الرحمٰن بن عوف) کہتے ہیں کہ مجھے عائشہؓ نے خبر دی کہ:

ان ابا بکر اقبل علی فرسٍ من مسکنہٖ بالسُنُح حتی نزل فدخل المسجد فلم یکلم الناس حتّٰی دخل علیٰ عائشۃ فتیمّم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وھو مغشی بثوب حبرۃ فکشف عن وجھہ ثم اکب علیہ وقبّلہٗ وبکیٰ ثم قال: بابی انت وامی واللہ لا یجمع اللہ علیہ موتتین انما الموتۃ التی کتبت علیك فقد متھا۔

حضرت ابوبکرؓ ایک گھوڑے پر سوار اپنے گھر سُنح سے آئے۔ گھوڑے سے اُتر کر مسجد میں داخل ہوئے۔ کسی سے کوئی بات نہیں کی۔ حتیٰ کہ حضرت عائشہؓ کے پاس آئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (کی نعش) کی طرف گئے۔ آپ کو ایک یمنی کپڑے میں ڈھانپا گیا تھا۔ پھر چہرے سے کپڑا ہٹایا۔ پھر اس پر جھکے، بوسہ دیا اور رونے لگے۔ پھر کہا: میرے ماں باپ آپؐ پر قربان! اللہ تعالیٰ آپ کو دوبارہ نہیں مارے گا۔ بس ایک موت جو اللہ

[1] شبلی نعمانی کہتے ہیں کہ حضرت عمرؓ کا یہ کہنا از راہِ مصلحت تھا۔ مدینہ میں اس وقت منافقین کی تعداد کافی تھی اور آپ اس خبر کی فوری تشہیر نہیں چاہتے تھے لیکن مذکورہ حدیث کے مطالعہ سے یہ خیال صحیح معلوم نہیں ہوتا۔ (بخاری۔ باب الاستخلاف)

نے لکھی ہوئی تھی وہ ہو چکی۔

قال الزهری وحدثنی ابوسلمة عن عبد الله ابن عباس ان ابا بکر خرج وعمر یکلم الناس فقال اجلس عمر فابی عمر ان یجلس فاقبل الناس الیه وترکوا عمر فقال ابوبکر" امابعد! من کان منکم یعبد محمدًا صلی الله علیه وسلم فان محمدًا قد مات ومن کان منکم یعبد الله فان الله حیٌّ لایموت - قال الله - ما محمد الارسول - قد خلت من قبله الرسل — (الی قوله) الشاکرین"

زہری کہتے ہیں کہ مجھ سے ابوسلمہ نے عبداللہ بن عباس سے یہ روایت بیان کی پھر حضرت ابوبکرؓ باہر نکلے تو حضرت عمرؓ لوگوں سے باتیں کر رہے تھے کہ (آنحضرتؐ نہیں مرے) ابوبکرؓ نے ان سے کہا۔ بیٹھ جاؤ۔ لیکن حضرت عمرؓ نہ بیٹھے۔ پھر لوگ حضرت ابوبکرؓ کی طرف متوجہ ہوئے اور عمرؓ کو چھوڑ دیا۔ حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا: امابعد تم میں سے جو شخص محمدؐ کو پوجتا تھا تو بے شک محمدؐ وفات پا چکے۔ اور جو کوئی اللہ کو پوجتا تھا تو اللہ ہمیشہ زندہ ہے اور کبھی مرنے والا نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے خود فرمایا ہے۔ محمدؐ بس اللہ کے رسول ہیں۔ ان سے پہلے بھی کئی رسول گزر چکے ..... اور یہ آیت آخر شاکرین تک پڑھی"

وقال: والله لکان الناس لم یعلموا ان الله انزل هذه الآیة حتی تلاها ابوبکر فتلقاها منه الناس کلهم فما اسمع بشرًا من الناس الایتلوها۔

ابن عباس کہتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا گویا لوگوں کو پتہ ہی نہیں کہ اللہ نے یہ آیت بھی اتاری ہے جب تک حضرت ابوبکرؓ نے یہ آیت نہ پڑھی پھر ابوبکرؓ سے لوگوں نے یہ آیت سیکھی پھر جسے دیکھو وہ یہی آیت پڑھ رہا تھا۔

فاخبرنی سعید بن المسیب ان عمر قال: والله ماهو الاان سمعت ابابکر تلاها فعقرت حتی ما تقلّنی رجلای وحتی اهویت الی الارض حین سمعته تلاها ان النبی صلی الله علیه وسلم قد مات (بخاری۔ کتاب المغازی۔ باب مرض النبی)

زہری نے کہا مجھ سے سعید بن مسیب نے بیان کیا حضرت عمرؓ کہتے تھے۔ بخدا! مجھے یوں معلوم ہوا کہ میں نے یہ آیت ابوبکرؓ کے تلاوت کرنے سے پہلے سنی ہی نہ تھی اور جب سنی تو میں سہم گیا۔ دہشت کے مارے میرے پاؤں نہیں اٹھتے تھے۔ میں زمین پر گر گیا۔ اور

جب میں نے ابوبکرؓ کو یہ آیت پڑھتے سُنا تب مجھے معلوم ہوا کہ واقعی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہو گئی۔

۳۔ خلافت کے لیے انصار کی کوشش اور بیعتِ ابوبکرؓ

ادھر صحابۂ کبار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تجہیز و تکفین میں مصروف تھے۔ ادھر انصار کے کچھ لوگ سقیفہ بنی ساعدہ میں جمع ہوئے۔ یہ انصار بھی خلافت کے اُمیدوار[1] تھے۔ بلحاظِ آبادی یہ مدینہ میں اکثریت میں تھے۔ اور دو قبیلوں اوس اور خزرج پر مشتمل تھے۔ ان کے سردار سعد بن عبادہ ـــــ جو خزرج سے تعلق رکھتے تھے ـــــ خلافت کے اُمیدوار تھے۔ انھوں نے ہی اپنے ساتھیوں کو یہاں امرِ خلافت طے کرنے کے لیے اکٹھا کیا تھا۔ انھیں حضورِ اکرمؐ کا یہ ارشاد اذا بویع للخلفتین فاقتلوا اخرھما (مسلم کتاب الامارۃ) (جب دو خلیفوں کی بیعت ہونے لگے تو پچھلے کو قتل کر دو) خوب یاد تھا۔ اس لیے وہ چاہتے تھے کہ اس موقع کو غنیمت جان کر فوری طور پر امیر کا انتخاب کر لیا جائے۔ انھیں یہ بھی علم تھا کہ اگر مہاجر بھی یہاں پہنچ گئے تو پھر ان کی دال نہیں گلے گی۔ لہٰذا وہ اس معاملہ کو جلد از جلد طے کرنے پر تلے ہوئے تھے اور یہ بات چیت شروع کر دی تھی۔ اس واقعہ کی اطلاع جس طرح مہاجرین کو ہوئی وہ حضرت عمرؓ کی زبانی سنیے[2]:۔

بینما نحن فی منزل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اذا رجل ینادی من وراء الجدار ان اخرج الی یا ابن الخطاب۔ فقلت: الیك عنی فانا عنك مشاغیل۔ یعنی بامر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فقال لہ: قد حدث امرٌ فان الانصار اجتمعوا فی سقیفۃ بنی ساعدۃ فادرکوھم ان یحدثوا امراً ان یکون فیہ حزبٌ۔ فقلت لابی بکر انطلق۔

ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خانہ مبارک میں بیٹھے ہوئے تھے کہ دفعتہً دیوار کے پیچھے سے ایک آدمی (مغیرہ بن شعبہ) نے آواز دی۔ اے ابن الخطاب ذرا باہر آؤ۔ مَیں نے کہا۔ چلو ہٹو! ہم لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بندوبست میں مشغول ہیں" اس نے کہا کہ ایک حادثہ پیش آیا ہے یعنی انصار سقیفہ بنی ساعدہ میں اکٹھے ہوئے

---

[1] اَوْ یَتَمَنَّ مُتَمَنٍّ والی بات پوری ہو گئی۔ [2] فتح الباری ج ۷، ص ۲۳ (بحوالہ الفاروق شبلی ص ۱۱۳-۱۱۴)

ہیں۔ اس لیے جلد پہنچ کر ان کی خبر لو۔ ایسا نہ ہو کہ انصار کچھ ایسی باتیں کر بیٹھیں جس سے لڑائی چھڑ جائے۔ اس وقت میں نے ابوبکرؓ سے کہا کہ چلو۔

سقیفہ بنی ساعدہ میں پہنچنے کے متعلق بخاری کی درج ذیل روایت ملاحظہ فرمایئے:۔

عن عمر قال حین توفی اللہ نبیہٗ صلی اللہ علیہ وسلم ان الانصار اجتمعوا فی سقیفۃ بنی ساعدۃ فقلت لابی بکر انطلق بنا فجئناھم فی سقیفۃ بنی ساعدۃ (بخاری کتاب المظالم باب ماجاء فی السقائف)

حضرت عمرؓ فرماتے ہیں۔ جب اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو اٹھا لیا تو انصار بنی ساعدہ کے منڈوے میں جمع ہوئے۔ میں نے ابوبکرؓ سے کہا۔ آپ ہمارے ساتھ چلیں۔ پھر ہم اس سقیفہ میں انصار کے پاس پہنچے۔

اس حدیث میں لفظ بنا (ہمارے ساتھ) سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سقیفہ جانے والے بزرگ قریش دو سے زیادہ تھے۔ آئندہ بخاری کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ ابوعبیدہ بن الجراح بھی ان کے ہمراہ تھے اور بعض دوسری روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ سقیفہ مذکور میں قریش سے کل چار یا زیادہ سے زیادہ پانچ آدمی پہنچے تھے۔ درج ذیل روایت حضرت عمرؓ کے اس طویل خطبہ کا آخری حصہ ہے جو انھوں نے اپنی خلافت کے آخری سال مسجدِ نبوی میں دیا تھا۔ یہ انتخاب ابوبکرؓ کے بہت سے پہلوؤں پر روشنی ڈالتا ہے۔

ثم انہ بلغنی ان قائلاً منکم یقول واللہ لومات عمر بایعتُ فلانا فلا یغترنّ المرءُ انما کانت بیعۃ ابوبکر فلتۃً وتمّت الا وانما کانت کذلک ولکن اللہ قد وقیٰ شرّھا ولیس فیکم من تقطع الاعناق الیہ مثل ابی بکر من بایع رجلا عن غیر مشورۃ من المسلمین فلایبایع ھو ولا والذی بایعہٗ تغرّۃً ان یُقتلا۔

وانہٗ قد کان من خبرنا حین توفی اللہ نبیہٗ صلی اللہ علیہ وسلم الاان الانصار خالفونا واجتمعوا باسرھم فی ثقیفۃ بنی ساعدۃ وخالف عنا علیؓ والزبیر ومن معھما واجتمع المھاجرون الی ابی بکر فقلت لابی بکر یا ابا بکر انطلق بنا الی اخواننا ھٰؤلاء من الانصار فانطلقنا نُرید ھم فلما دنونا منھم لقیَنا منھم رجلان صالحان فذکرا ماتما لأعلیہ

القوم فقالا این تریدون یا معشر المهاجرین؟ فقلنا نرید اخواننا هؤلاء
من الانصار۔ فقالا لا علیکم ان تقربوهم، اقضوا امرکم۔ فقلت واللہ
لناتینهم فانطلقنا حتیٰ اتینهم فی سقیفۃ بنی ساعدۃ فاذا رجل
مزمّلٌ بین ظهراینهم۔ فقلت من هذا؟ فقالوا هذا سعد بن عبادۃ
فقلت ماله؟ قالوا یُوعك۔ فلما جلسنا قلیلاً تشهد خطیبهم فاثنیٰ
علی اللہ بما هو اهله ثم قال اما بعد، نحن انصار اللہ کتیبۃ الاسلام
وانتم معشر المهاجرین رهطٌ وقد دفّت دافۃ من قومکم فاذا هم
یریدون ان یختزلونا من اصلنا وان تعصنونا من الامر۔ فلما سکت
اردتُ ان اتکلّم وکنت زوّرتُ مقالۃ اعجبتنی، ارید ان اقدّمها
بین یدی ابوبکر وکنت اُداری منه بعض الحدّ فلمّا اردت ان
اتکلّم، قال ابوبکر علیٰ رِسلِك۔ فکرهتُ ان اغضبَهُ فکلّم ابوبکر
فکان هو احکمَ مِنّی واوقرَ واللہ ما ترك من کلمۃٍ اعجبتنی فی
تزویری الا قال فی بدیهته مثلها او افضل منها حتیٰ سکت فقال
ما ذکرتم فیکم من خیر فانتم له اهل ولن یعرف هذا الامر
الا لهذا الحیّ من قریش هم اوسط العرب نسبًا ودارًا وقد
رضیت لکم احدا هٰذین الرجلین فبایعوا ایّهما شئتم فاخذ بیدی
وبید ابی عبیدۃ بن الجرّاح وهو جالسٌ بیننا۔ فلم اکره مما قال
غیرها واللہ ان اقدّم فیضرب عُنُقی لا یقربنی ذٰلك من اثم احبّ
الیّ من ان اتامّر علیٰ قوم فیهم ابوبکر۔ اللّٰهُمَّ اِلّا ان تسوّل علی نفسی
عند الموت شیئًا لا اجرهٗ الآن۔ فقال قائلٌ من الانصار: انا
جُذیلُها المحکّكُ وعذیقها المرجّبُ منا امیر ومنکم امیر یا معشر
قریش۔ فکثُر اللّغَطُ وارتفعت الاصوات حتیٰ فرقتُ من الاختلاف
فقلت اُبسُطَ یدك یا ابابکر۔ فبسط یده فبایعتهٗ وبایعه المهاجرون
ثم بایعته الانصار۔ ثم نزدنا علی سعد بن عبادۃ۔ فقال قائلٌ منهم
قتلتم سعد بن عبادۃ۔ فقلت قتل اللہ سعد ابن عبادۃ۔ قال عمر:

وانا واللہ ما وَجَدْنَا فیما حضرنا من امر اقویٰ من مبایعۃ ابی بکرٍ خشینا ان فارقنا القوم ولم تکن بیعۃٌ ان یبایعوا رجلا منھم بعدنا فاما بایعناھم علی مالا ترضٰی واما نخالفھم یکون فسادٌ فمن بایع رجلاً عن غیر مشورۃ من المسلمین فلا یتبایع ھو والذی بایعہ تغرّۃً ان یقتلا۔ (بخاری۔ کتاب المحاربین، باب رجم الحبلی)

پھر مجھے یہ خبر بھی ملی ہے۔ تم میں سے کسی نے یوں کہا: "اگر عمرؓ مر گیا تو فلاں شخص سے بیعت کر لوں گا۔" دیکھو! تم میں سے کسی کو یہ دھوکا نہ ہو کہ وہ ایسا کہنے لگے۔ حضرت ابوبکرؓ کی بیعت ہنگامی حالات میں ہوئی اور پایۂ تکمیل کو پہنچی۔ بے شک حضرت ابوبکرؓ کی بیعت ناگہانی ہوئی تھی تاہم اللہ تعالیٰ نے اس (طرح کی) بیعت کی برائی سے (اُمّت کو) بچا لیا۔ پھر تم میں سے (آج) حضرت ابوبکرؓ کی طرح (متقی اور پرہیزگار) کون ہے؟ جس سے ملنے کے لیے لوگ سفر کرتے ہوں۔ تو اب جس کسی نے مسلمانوں سے مشورے کے بغیر کسی کی بیعت کی تو بیعت کرنے والا اور جس کی بیعت کی گئی ہو دونوں اپنی جانیں گنوا بیٹھیں گے۔

پھر ہمیں یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اُٹھا لیا تو انصار نے ہماری مخالفت کی۔ اور اپنے حمائتیوں سمیت بنو ساعدہ کے منڈوے میں اکٹھے ہوئے۔ ادھر حضرت علیؓ، حضرت زبیرؓ اور ان کے ساتھی بھی ہمارے مخالف تھے۔ باقی مہاجرین حضرت ابوبکرؓ کے پاس جمع ہوئے۔ میں نے حضرت ابوبکرؓ سے کہا: "اے ابوبکرؓ! اپنے انصار بھائیوں کے پاس ہمارے ساتھ چلیے۔ سو ہم ان کے پاس آنے کے ارادہ سے روانہ ہوئے۔ جب ہم ان کے قریب پہنچے تو دو نیک بخت انصاری[1] آدمی (عویم بن ساعدہ اور عاصم بن عدی) ہم سے ملے انھوں نے وہ سب کچھ بتلایا جس پر (سقیفہ میں جمع انصار) تلے ہوئے تھے (یعنی سعد بن عبادہؓ کو خلیفہ بنانے پر) پھر انھوں نے کہا: "اے مہاجر بھائیو! تم کہاں جا رہے ہو؟" ہم نے کہا ان انصاری بھائیوں کے پاس جا رہے ہیں۔ انھوں نے کہا۔ وہاں مت جاؤ تمھیں جو

---

[1] معلوم ہوا کہ انصار بھی سارے حضرت سعد بن عبادہؓ کے تقررِ خلافت پر راضی یا متفق نہ تھے۔

کرنا ہے کر ڈالو (خلیفہ منتخب کر لو)" میں نے کہا۔ خدا کی قسم! ہم ان کے پاس ضرور جائیں گے۔ آخر ہم سقیفہ بنی ساعدہ پہنچ گئے۔ ہم نے دیکھا کہ ان میں سے ایک آدمی کپڑا اوڑھے بیٹھا ہے۔ میں نے پوچھا کون ہے؟ لوگوں نے کہا۔ "یہ سعد بن عبادہ ہیں"۔ میں نے پوچھا" اسے کیا تکلیف ہے؟" کہا گیا" انھیں بخار آ رہا ہے"۔ ہم تھوڑی دیر ہی بیٹھے تھے کہ ان کے خطیب (ثابت بن قیس یا اور کسی نے) تشہد پڑھا۔ پھر اللہ کی ثناء بیان کی۔ جیسی کہ اسے سزاوار ہے۔ پھر کہنے لگے۔ ہم اللہ (کے دین) کے مددگار اور اسلام کی فوج ہیں اور اے مہاجرین تم تھوڑی سی جماعت ہو۔ تم میں سے ایک چھوٹی سی جماعت اپنی قوم (قریش) سے نکل کر ہم میں آ رہی۔ تو اب تم یہ چاہتے ہو کہ ہماری بیخ کنی کرو اور ہمیں خلافت سے محروم کر دو"۔ خطیب جب چپ ہوا تو میں نے گفتگو کرنا چاہی۔ میں نے ایک عمدہ تقریر اپنے ذہن میں سوچ رکھی تھی اور چاہتا تھا کہ حضرت ابوبکرؓ کے بات کرنے سے پہلے شروع کر دوں اور میں اس تقریر سے وہ تلخی دور کرنا چاہتا تھا جو اس خطیب کی تقریر سے پیدا ہوئی۔ پھر جب میں نے بولنے کا ارادہ کیا تو حضرت ابوبکرؓ نے کہا۔ ذرا ٹھہر جاؤ۔ میں نے حضرت ابوبکرؓ کو خفا کرنا مناسب نہ سمجھا۔ سو حضرت ابوبکرؓ نے تقریر شروع کی۔ اور خدا کی قسم! وہ مجھ سے زیادہ عقلمند اور متین تھے۔ اور جو عمدہ تقریریں میں نے اپنے ذہن میں سوچ رکھی تھی اس میں سے کوئی بات نہ چھوڑی اور سب کچھ فی البدیہہ کہہ دیا۔ بلکہ میری سوچی ہوئی تقریر سے بہتر تقریر فرمائی۔ پھر خاموش ہو گئے (ان کی تقریر کا خلاصہ یہ تھا)۔ "انصاری بھائیو! تم نے جو اپنی فضیلت اور بزرگی بیان کی وہ سب درست ہے اور تم بے شک اس کے سزاوار ہو مگر خلافت قریش کے سوا کسی اور قبیلہ کے لیے نہیں ہو سکتی کیونکہ قریش از روئے نسب اور خاندان تمام عرب قبائل سے بڑھ کر ہیں اور میں یہ چاہتا ہوں کہ تم ان دو آدمیوں میں سے کسی ایک کی بیعت کر لو جسے تم چاہو۔ پھر میرا اور حضرت ابوعبیدہ بن الجراح — جو لوگوں میں بیٹھے ہوئے تھے کا ہاتھ تھاما۔

(حضرت عمرؓ کہتے ہیں) کہ مجھے حضرت ابوبکرؓ کی کوئی بات بھی اتنی پسندیدہ معلوم نہ ہوئی جتنی یہ بات۔ خدا کی قسم! اگر مجھے آگے لا کر میری گردن مار دیں درآنحالیکہ

میں کسی گناہ میں ملوث بھی نہ ہوں تو یہ مجھے اس سے زیادہ پسند تھا کہ میں ان لوگوں کی سرداری کروں جن میں ابوبکر موجود ہوں[1]۔ میرا اب تک بھی یہی خیال ہے ۔ یہ اور بات ہے کہ مرتے وقت میرا نفس مجھے بہکا دے اور میں کوئی دوسرا خیال کروں جو اَب نہیں کرتا۔

پھر انصار میں کا ایک خطیب (حباب بن منذر) کہنے لگے۔" میں وہ لکڑی ہوں جس سے اُونٹ رگڑ کر اپنی کھجلی کی تکلیف رفع کرتے ہیں اور وہ باڑ ہوں جو درخت کے گرد لگائی جاتی ہے (یعنی لوگوں کا معتمد علیہ، مدبر اور محافظ ہوں) میری تجویز یہ ہے کہ ایک امیر ہم میں سے ہو اور اے قریش! ایک امیر تم میں سے ہو"۔ اس تجویز پر غُل مچ گیا۔ اور کئی طرح کی آوازیں بلند ہونے لگیں (حضرت عمرؓ کہتے ہیں) کہ میں ڈر گیا کہ اُمت انتشار و اختلاف کا شکار نہ ہو جائے۔ سو میں نے حضرت ابوبکرؓ سے کہا۔ اپنا ہاتھ بڑھایئے۔ اُنھوں نے ہاتھ بڑھایا تو میں نے بیعت کی اور مہاجرین نے بیعت کی۔ پھر انصار نے بیعت کی۔ پھر ہم سعد بن عبادہ کی طرف بڑھے ۔کسی نے کہا۔ "تم نے سعد بن عبادہ کو ہلاک کر ڈالا"۔ تو میں نے کہا اسے اللہ نے ہلاک کیا ہے"۔

(راوی کہتا ہے) حضرت عمرؓ نے اس خطبہ میں یہ بھی فرمایا۔ اس وقت ہمیں حضرت ابوبکرؓ کی خلافت کے علاوہ کوئی چیز ضروری معلوم نہیں ہوئی۔ ہمیں یہ خطرہ تھا کہ اگر ہم لوگوں سے جدا رہے جب کہ ابھی تک بیعت نہ ہوئی تھی وہ کسی اور شخص کی بیعت کر بیٹھے۔ تو پھر دو ہی صورتیں تھیں) یا تو ہم اس شخص کی بیعت پر مجبور ہو جاتے یا مخالفت کرتے تو آپس میں فساد (پھوٹ) پڑ جاتا۔ دیکھو! میں پھر یہی کہتا ہوں کہ جو شخص بغیر مسلمانوں کے صلاح مشورہ کے کسی کی بیعت کرلے۔ تو دوسرے لوگ اس کی (بیعت کرنے میں) پیروی نہ کریں۔ نہ اس کی جس سے بیعت کی گئی۔ کیونکہ دونوں اپنی جانیں گنوا بیٹھیں گے"۔

حافظ ابن کثیر سیرۃ النبویہ ج ۴ صفحہ ۴۹۱ کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے حضرت سعد بن عبادہؓ کو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد سُنایا تو انھوں نے

---

[1] ایک دوسری روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابوعبیدۃ بن الجراح نے بھی اس قسم کے الفاظ کہہ کر حضرت ابوبکرؓ کی موجودگی میں خلافت قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ (طبری ج ۲۔ ص ۳۲۱)

اس کا اعتراف بھی کیا تھا۔

ولقد علمت یا سعد! انّ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال — وانت قاعدٌ — قریشٌ ولاۃُ ھذا الامر، فبرُّ الناس تبع لبرّھم وفاجرھم لفاجرھم۔ فقال لہ سعد: صدقت، نحن الوزراء وانتم الامراء۔"

"اے سعد! تم خوب جانتے ہو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا —— اس وقت تم موجود تھے۔ "قریش امرِ خلافت کے والی ہیں۔ ان کے نیک نیکوں کا اور فاجر فاجروں کا اتباع کرتے ہیں۔" تو سعدؓ نے جواب دیا: "آپ نے سچ کہا ہم وزیر ہوں گے اور تم امیر۔"

۴۔ بنو ہاشم کی بیعت میں تاخیر

جب انصار نے سقیفہ بنی ساعدہ میں خلافت کے متعلق مسئلہ چھیڑ ہی دیا۔ تو اس مسئلہ کی اہمیت اس بات کی متقاضی تھی کہ سب سے پہلے اب ادھر توجہ کی جائے۔ حضرت ابوبکرؓ اور ان کے چند ساتھی تو سقیفہ بنی ساعدہ پہنچ گئے۔ لیکن بنو ہاشم وہاں عمداً نہیں گئے۔ کیونکہ سقیفہ مذکورہ میں موجود انصار و مہاجرین میں سے کوئی گروہ بھی حضرت علیؓ کے دعویٰ کی تائید کو تیار نہ تھا۔ لہٰذا انھوں نے حضرت فاطمہؓ بنتِ رسولؐ کے گھر کا رخ کیا۔ بخاری شریف کی مذکورہ طویل حدیث کی شرح میں فتح الباری میں امام مالکؒ سے یہ روایت درج ہے۔ از سیرۃ النبویہ ابنِ کثیر جلد ۴ صفحہ ۴۸۸)

وان علیاً والزبیر ومن کان معھما تخلّفوا فی بیت فاطمۃ بنت رسول اللہ۔

اور علیؓ اور زبیرؓ اور جو لوگ ان کے ساتھ تھے۔ وہ حضرت فاطمۃ الزہراؓ کے گھر میں الگ جمع ہوئے۔

یہ بنو ہاشم گو تعداد میں کم تھے مگر اپنے دعوے میں متشدد تھے۔ طبری جلد ۳ کی یہ روایت اس معاملہ پر روشنی ڈالتی ہے :-

وتخلّف علیؓ والزبیر واخترع الزبیر سیفہٗ وقال: لا اغمدہ حتی یبایع علیؓ۔

اور حضرت علیؓ اور حضرت زبیرؓ نے علیحدگی اختیار کی اور حضرت زبیرؓ نے تلوار میان سے کھینچ لی اور کہا: جب تک حضرت علیؓ کے ہاتھ پر بیعت نہ کی جائے میں تلوار کو

میان میں نہ ڈالوں گا۔

۵۔ بیعتِ عامہ

وفات النبیؐ کے دن ہی یعنی پیر کو سقیفہ بنی ساعدہ میں حضرت ابوبکرؓ خلیفہ منتخب ہوئے تو اس سے اگلے دن یعنی منگل کو مسجد نبوی میں عام بیعت ہوئی۔ اس کی تفصیل درج ذیل حدیث سے واضح ہے:۔

اخبرنی انس بن مالکٍ انہ سمع خطبۃ عمر الاٰخرۃ حین جلس علی المنبر وذٰلک الغد من یوم توفیّ النبی صلی اللہ علیہ وسلم فتشھد وابوبکر صامت لایتکلم قال: کنت ارجوا من یعیش رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حتیٰ یدبرنا یرید بذٰلک ان یکون اٰخرھم فان یک محمدٌ فقد مات فان اللہ تعالیٰ قد جعل اظھرکم نوراً تھتدون بہ ھدی اللہ محمداً صلی اللہ علیہ وسلم وان ابوبکر صاحب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ثانی اثنین فانّہٗ اَوْلیَ المسلمین باموکم فقوموا فبایعوہُ وکانت طائفۃ منھم قد بایعوہ قبل ذٰلک فی سقیفۃ بنی ساعدۃ وکانت بیعۃ العامۃ علی المنبر۔ قال الزھری عن انس ابن مالک سمعتُ عمر یقول لابی بکرٍ یومئذٍ اصعد المنبر فلم یزل حتیّ صعد المنبر فبایعہُ الناس عامۃً۔ (بخاری۔کتاب الاحکام۔باب الاستخلاف)

مجھ کو انس بن مالکؓ نے خبر دی۔ انھوں نے حضرت عمرؓ کا دوسرا خطبہ سُنا۔ جب وہ منبر پر بیٹھے۔ یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے دوسرے دن انھوں نے سُنایا۔ انھوں نے تشہد پڑھا۔ حضرت ابوبکرؓ خاموش بیٹھے رہے۔ کوئی بات نہ کرتے تھے۔ حضرت عمرؓ نے کہا۔ مجھے تو یہ اُمید تھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت تک زندہ رہیں گے جب ہم دُنیا سے اُٹھ جائیں گے اور آپ ہم سب کے بعد وفات پائیں گے۔ خیر اب محمد صلی اللہ علیہ وسلم گزر گئے تو اللہ تعالیٰ نے تم میں ایک نور باقی رکھا ہے جس سے تم راہ پاتے رہو گے۔ اسی نور سے اللہ تعالیٰ نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی راہ بتلائی اور بلاشبہ ابوبکر صدیق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خاص رفیق اور ثانی اثنین

ہیں۔ تمام مسلمانوں میں ان کو خلافت کا زیادہ حق ہے، سو اٹھو اور ان سے بیعت کرو۔"
(حضرت عمرؓ نے یہ خطبہ اس وقت سنایا) جب مسلمانوں کا ایک گروہ پہلے ہی بنی ساعدہ کے منڈوے میں ابو بکرؓ سے بیعت کر چکا تھا (وہ بیعتِ خاص تھی) یہ بیعتِ عامہ (مسجد نبوی میں) منبر پر ہوئی۔

اسی سند سے زہری نے انس بن مالک سے روایت کی ہے کہ حضرت عمرؓ حضرت ابو بکرؓ سے برابر یہی کہتے رہے۔ اٹھو! منبر پر چڑھو۔ حتیٰ کہ وہ منبر پر چڑھے اور عوام الناس نے ان سے بیعت کی۔

۶۔ حضرت علیؓ کی بیعت

سقیفہ بنی ساعدہ میں حضرت ابو بکرؓ نے اپنی تقریر کے دوران جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد پیش کیا کہ آئمہ قریش سے ہوں گے۔ تو جماعتِ انصار نے اس فرمان کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیا۔ حضرت بشیر بن سعدؓ خزرجی نے حضرت ابو بکرؓ کے خیالات کی پُرزور تائید کی اور فرمایا:-

"ہم نے اسلام کا بول بالا کرنے کے لیے جو کچھ کیا ہے وہ فقط اطاعتِ رسول اور رضائے الٰہی کے لیے تھا۔ یہ مناسب نہیں کہ ہم اس کے عوض متاعِ دنیا کے خواہاں ہوں۔ ہمیں اجر دینے والا اللہ تعالیٰ ہے۔ خلافت کی مستحق تم سے زیادہ خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی قوم ہو سکتی ہے۔ تم لوگ اللہ کا خوف کرو اور مخالفت سے باز آؤ۔" (طبری جلد ۳ صفحہ ۲۲۱)

چنانچہ اسی مجمع میں سے بیشتر انصار نے حضرت ابو بکرؓ کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔ باقی نے دوسرے دن بیعت کی۔ حضرت ابو بکرؓ نے کچھ تعرض نہیں فرمایا۔ کیونکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے وصیت فرمائی تھی کہ "انصار میں سے جو کوئی نیک ہو اس کی قدر کرنا اور جو بُرا ہو اس کے قصور سے درگزر کرنا۔" (بخاری۔ کتاب المناقب باب اقبلوا من محسنهم و تجاوزوا عن مسیئهم)
ایک روایت کے مطابق حضرت سعد بن عبادہؓ نے اسی دن بعد میں بیعت کر لی۔
البتہ حضرت علیؓ نے چھ ماہ بعد حضرت ابو بکرؓ کی بیعت کی۔ جبکہ حضرت فاطمۃ الزہراؓ کا انتقال ہو گیا۔ اس دوران کبھی کبھار بنو ہاشم حضرت فاطمہؓ کے مکان پر جمع ہو کر مشورے کرتے رہتے۔ ابن ابی شیبہ نے مصنف میں اور طبری نے تاریخ کبیر میں یہ روایت نقل کی ہے کہ حضرت عمرؓ

نے ایک بار حضرت فاطمہؓ کے دروازے پر کھڑے ہو کر فرمایا:[1]

"یا بنت رسول اللہ! خدا کی قسم آپ ہم کو سب سے زیادہ محبوب ہیں۔ تاہم اگر لوگ آپ کے یہاں اس طرح مجمع کرتے رہے تو میں ان لوگوں کی وجہ سے گھر میں آگ لگا دوں گا۔"

گو اس روایت کی صحت کے متعلق کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ تاہم حضرت عمرؓ کی تندیٔ مزاج سے یہ بات بعید نہ تھی اور یہی مزاج کی تندی بعض دفعہ بڑے بڑے اُٹھتے ہوئے فتنوں کو دبا دیتی تھی۔

غالباً یہی وجہ تھی کہ جب حضرت ابوبکرؓ نے اپنی وفات کے وقت حضرت عمرؓ کو نامزد کرنے کا فیصلہ کر لیا اور اس معاملہ کے متعلق حضرت عبدالرحمان بن عوف اور حضرت عثمانؓ سے مشورہ کر چکے تو حضرت طلحہؓ نے آپ کے پاس آکر کہا تھا:

"آپ کی موجودگی میں حضرت عمرؓ نے ہمارے ساتھ کیا برتاؤ کیا تھا؟ اب خلیفہ ہوں گے تو خدا جانے کیا کریں گے اور آپ اس بارے میں خدا کو کیا جواب دیں گے؟ حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا۔ میں خدا سے کہوں گا۔ میں نے اس شخص کو امیر بنایا جو تیرے بندوں میں سب سے زیادہ اچھا تھا۔"

حضرت علیؓ کی بیعت کی تفصیل بخاری۔ کتاب المغازی باب غزوہ خیبر میں ملاحظہ کی جا سکتی ہے بغرض اختصار اس طویل حدیث کے چیدہ چیدہ اقتباسات یہ ہیں:

۱۔ "حضرت فاطمہؓ کے انتقال کے بعد حضرت علیؓ کے متعلق لوگوں کی وہ توجہ نہ رہی جو پہلے تھی۔ لہٰذا حضرت علیؓ نے بیعت کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

۲۔ حضرت علیؓ نے حضرت ابوبکرؓ کو اکیلے گھر پر آنے کی دعوت دی۔ دونوں ایک دوسرے کے مناقب بیان کرتے رہے۔ حضرت علیؓ نے یہ شکوہ کیا کہ آپ نے امر خلافت میں ہمیں مشورہ میں شامل نہیں کیا۔ آخر حضرت علیؓ نے کہا کہ شام کو میں مسجد نبوی میں بیعت کروں گا۔

۳۔ لیکن یہ بیعت ظہر کی نماز کے بعد ہی واقع ہو گئی۔ پہلے حضرت ابوبکرؓ نے حضرت علیؓ کے فضائل بیان کیے پھر حضرت علیؓ نے حضرت ابوبکرؓ کے اور اپنی معذرت پیش کی۔ لوگوں کو اس بات سے بہت خوشی ہوئی کہ حضرت علیؓ "معروف" کی طرف لوٹ آئے ہیں اور اب وہ پہلے سے

---

[1] بحوالہ الفاروق۔ شبلی نعمانی۔ خلافت ابوبکر۔

زیادہ حضرت علیؓ سے محبت کرنے لگے۔"

۷۔ امرِ خلافت پر تنقید

اب یہ معلوم کرنا بھی ضروری ہے کہ انصار سے سعد بن عبادہ اور بنو ہاشم سے حضرت علیؓ جو خلافت کے امیدوار تھے کیا وہ اس دعویٰ میں حق بجانب تھے یا نہیں؟ اور کیا ان کا انتخاب ممکن بھی تھا یا نہیں۔

ہم پیراگراف ۵ میں ایسی پانچ مستند اور صحیح احادیث درج کر چکے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ طلبِ امارت یا اس کی آرزو کرنے سے منع فرمایا گیا ہے۔ لہٰذا مندرجہ بالا دونوں بزرگوں کے اس دعویٰ اور اقدامات کو بشری کمزوریوں کے علاوہ کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ ان کے فضائل و مناقب بے شمار ہیں۔ تاہم انسان ہی تھے، فرشتے یا معصوم من جانب اللہ نہیں تھے۔

رہے حضرت ابوبکرؓ جن کی افضلیت کے سب قائل تھے (پیراگراف ۴) اور جن کی خلافت سے متعلق بہت سے ارشادات بھی ملتے ہیں (پیراگراف ۳) ان کا امارت کی طلب کرنا ہرگز ثابت نہیں۔ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے وفات پائی تو مدینہ میں موجود ہی نہ تھے۔ یہ اطلاع ملنے پر مدینہ آئے تو ایسا کوئی ذکر نہیں کیا۔ بلکہ ان کے ساتھی حضرت عمرؓ تو یہ تسلیم کرنے کے لیے تیار ہی نہ تھے کہ حضورؐ وفات پا چکے ہیں۔ تجہیز و تکفین میں مشغول ہوئے تو وہاں سے سقیفہ بنی ساعدہ کے سلسلہ میں بلایا گیا۔ آئے، تقریر فرمائی تو صرف اس طرف توجہ دلائی کہ بموجب فرمانِ نبوی خلافت قریش میں ہوگی۔ خود قطعاً دعویٰ نہیں کیا۔ بلکہ حضرت عمرؓ اور ابو عبیدہؓ بن الجراح کا نام لیا تو جس طرح حضرت عمرؓ نے یہ جواب دیا کہ آپ کی موجودگی میں خلیفہ بننا ہمیں سخت ناگوار ہے۔ آپ نماز میں آپؐ کے خلیفہ، سب سے افضل اور ثانی اثنین فی الغار ہیں۔ بالکل اسی طرح کا جواب حضرت ابو عبیدہ بن الجراح نے بھی دیا (طبری جلد ۳ ص ۲۲۱) آخر حضرت عمرؓ نے ان کا ہاتھ اُٹھا کر بیعت کی۔ تو سب لوگوں نے بیعت کر لی۔

وہ اپنے خلیفہ بن جانے پر بھی چنداں خوش نہ تھے۔ جیسا کہ خلافت کے بعد ان کی پہلی تقریر سے ثابت ہوتا ہے (ملاحظہ ہو طلبِ امارت اور اس کی آرزو ص۱۰) نیز آپ نے اپنی وفات کے وقت بھی یوں فرمایا تھا:

وودِدتُ الی یوم سقیفہ بنی ساعدۃ فکنت قذفت الامر فی عُنُق

احد الرجلین ــــ یرید عمر و ا با عبیدہ ــــ فکان احدھما امیراً وکنت وزیراً۔ (طبری ج ۴ ص ۴۳۰)

سقیفہ بنی ساعدہ کے دن میں چاہتا تھا کہ امرِ خلافت کا بار عمرؓ اور ابو عبیدہؓ میں سے کسی ایک کے سر پر ڈال دوں تاکہ ان میں سے کوئی ایک امیر بن جاتا اور میں وزیر ہوتا۔

اسی طرح حضرت عمرؓ اپنے خلیفہ نامزد ہونے پر چنداں خوش نہ تھے اور اس کا اظہار حضرت عمرؓ نے ایک تو اپنی وفات کے وقت کیا (دیکھیے انتخاب عثمانؓ) اور دوسرے اس بے رغبتی کا اظہار حضرت عمرؓ کے اس قول سے بھی ہوتا ہے جب غزوۂ خیبر کے متعلق حضور اکرمؐ نے یہ فرمایا کہ میں کل جھنڈا اس شخص کے ہاتھ میں دوں گا جو خیبر فتح کرے گا۔ حضرت عمرؓ فرمایا کرتے تھے۔

ما احببت الامارۃ الا یومئذٍ۔ (مسلم۔ فضائل علی ابن ابی طالب)

مجھے اس دن کے علاوہ کبھی امارت کی خواہش نہ ہوئی۔

گویا اس لحاظ سے بھی حضرت ابوبکرؓ کی امارت کے لیے افضلیت ثابت ہوتی ہے۔

حضرت سعد بن عبادہ کی خلافت پر اتفاق کئی وجوہ سے ناممکن تھا۔ پہلی وجہ یہ ہے کہ قبیلہ قریش اپنی دینی و دنیوی برتری کی وجہ سے کسی قبیلہ کو اپنا ہمسر نہ سمجھتے تھے لہٰذا وہ کسی دوسرے قبیلہ کے آگے سرِ تسلیم خم کرنے کو تیار نہ تھے اور نہ ہی دوسرے قبائل اپنے ہمسر یا اپنے سے کم تر قبیلہ کی فرمانروائی قبول کر سکتے تھے۔ اسی حقیقت کو حضرت ابوبکرؓ نے ان الفاظ میں واضح فرمایا ہے:۔

ان العرب لا تعرف ھذا الامر الا لھذا الحی من قریش (بخاری۔ کتاب المحاربین)

اہل عرب قبیلہ قریش کے علاوہ کسی دوسرے کی خلافت تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں ہو سکتے۔

دوسری وجہ یہ تھی کہ انصار خود دو گروہ تھے۔ اوس اور خزرج اور ان کا باہم اتفاق نہ تھا۔ گو خزرج تعداد میں زیادہ تھے اور اوس کی حیثیت بھی ثانوی قسم کی تھی تاہم ان میں باہمی رقابت کی بھی ہوئی چنگاریاں ابھی تک موجود تھیں۔ ان حالات میں بہتر یہی تھا کہ کسی لائق تر شخص کا انتخاب کرکے انصار کے اس دعویٰ کو دبا دیا جاتا۔ اور اگر امارت کی بحث پہلے سے شروع نہ ہو چکی ہوتی تو حضرت ابوبکرؓ کا فوری اور متفقہ انتخاب عین ممکن تھا۔

اور تیسری وجہ یہ بھی تھی کہ انصار اور پھر خزرج کے قبائل میں سے بنو ساعدہ کو تقویٰ اور بزرگی کے لحاظ سے کوئی خاص مقام حاصل نہ تھا۔ جیساکہ درج ذیل روایت سے معلوم ہوتا ہے۔ اس روایت کے راوی بذاتِ خود انصاری ہیں اور سعد بن عبادہؓ کے ذیلی قبیلہ، قبیلہ بنو ساعدہ

سے تعلق رکھتے ہیں۔

عن ابی حمیدٍ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال: "ان خیرُ دُورِ الانصار دار بنی النجار ثم عبد الاشھل ثم دار بنی الحارث ثم بنی ساعدۃ وفی کل دُورِ الانصار خیرٌ" للحقنا سعد بن عبادۃ فقال ابو اُسید: الم ترانّ نبی اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خیّر الانصار فجعلنا اخیراً"۔ فادرك سعد النبی صلی اللہ علیہ وسلم فقال: یارسول اللہ خیر دُورِ الانصار فجعلتنا اٰخراً۔ فقال: اَوَلیس یحببکم ان تکونوا من الخیار۔ (بخاری۔ کتاب المناقب۔ باب فضل دور الانصار)

ابو حمید ساعدی کہتے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بہتر گھرانہ انصار کا بنی نجار کا گھرانہ ہے، پھر عبد الاشہل کا، پھر بنی حارث کا، پھر بنی ساعدہ کا اور انصار کے سب گھرانے اچھے ہیں۔ پھر سعد بن عبادہ ابو اُسید سے ملے تو کہنے لگے۔ "ابو اُسید! تم نہیں دیکھتے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تعریف بیان کی تو ہم کو آخر میں کر دیا۔ پھر سعد بن عبادہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس گئے اور عرض کیا "یا رسول اللہ! انصار کے گھرانوں کی تعریف ہوئی تو ہمیں آخری درجہ دیا گیا"۔ آپ نے فرمایا: "کیا تمہیں یہ بات پسند نہیں کہ تم اچھے لوگوں میں شمار ہوئے (اوّل، آخر کی کیا بات ہے)

بنو ہاشم بوجہ قرابت امارت کے دعوے دار اور اس نظریہ میں متشدد بھی تھے اور یہ سمجھتے تھے کہ حضرت ابوبکرؓ اور عمرؓ نے ان سے امارت ظلماً اور حسداً چھین لی ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ حضرت علیؓ کے تعلقات قریش کے ساتھ کچھ ایسے پیچ در پیچ تھے کہ قریشی کسی طرح ان کے آگے سر نہیں جھکا سکتے تھے۔ علامہ طبری نے حضرت عمرؓ اور حضرت عبداللہ بن عباس کے درمیان ایک مکالمہ نقل کیا ہے۔ جس سے اس حقیقت پر کافی روشنی پڑتی ہے۔

حضرت عمرؓ : عبداللہ بن عباس! علی ہمارے ساتھ کیوں نہیں شریک ہوئے؟

عبداللہ بن عباس : میں نہیں جانتا۔

حضرت عمرؓ : تمہارے باپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا اور تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچیرے بھائی ہو۔ پھر تمہاری قوم تمہاری طرف دار کیوں نہیں ہوئی؟

عبداللہ بن عباس : میں نہیں جانتا۔

حضرت عمرؓ: لیکن میں جانتا ہوں۔ تمہاری قوم تمہارا سردار ہونا گوارا نہیں کرتی تھی۔
عبداللہ بن عباسؓ : کیوں ؟
حضرت عمرؓ : وہ پسند نہیں کرتے تھے کہ ایک ہی خاندان (بنو ہاشم) میں نبوت اور خلافت دونوں آجائیں۔ شاید تم یہ کہو گے کہ حضرت ابوبکرؓ نے ہمیں خلافت سے محروم کر دیا ہے۔ لیکن خدا کی قسم! یہ بات نہیں۔ ابوبکرؓ نے وہ کیا جس سے زیادہ کوئی مناسب بات نہیں ہو سکتی تھی۔ اگر وہ تم کو خلافت دینا بھی چاہتے تو تمہارے حق میں کچھ مفید نہ ہوتا۔" (طبری صفحہ ۲۷۶۸ بحوالہ الفاروق صفحہ ۲۶۶)

حضرت عمرؓ کا استخلاف (نامزدگی SELECTION)

حضرت ابوبکرؓ کو اگرچہ مدتوں کے تجربے سے یہ معلوم ہوگیا تھا کہ خلافت کا بارِ گراں حضرت عمرؓ کے سوا اور کسی سے اٹھ نہیں سکتا۔ لہٰذا آپ نے حضرت عمرؓ کو نامزد کر دینے کا عزم کر لیا۔ اس نامزدگی سے متعلق آپ اکابر صحابہؓ کی رائے کا بھی اندازہ کرنا چاہتے تھے۔ ہم اس سلسلہ میں طبری جلد ۳ صفحہ ۴۲۸ تا صفحہ ۴۳۰ سے چیدہ چیدہ اقتباس پیش کر رہے ہیں:۔

۱۔ وعقد ابو بکر فی مرضة التی توفی فیها لعمر بن الخطاب عقد الخلافة من بعده۔ وذکر انه لما اراد العقد له دعا عبد الرحمٰن بن عوف فیما ذکر ابن سعد، عن الواقدی ..... قال لما نزل بابی بکر رحمه الله الوفاة فدعا عبد الرحمٰن بن عوف، قال: اخبرنی عن عمر فقال: یا خلیفة رسول الله! هو والله افضل من رایك فیه من رجل، ولکن فیه غلظة۔

فقال ابو بکر: ذٰلك لانه یرانی رقیقا۔ ولو افضی الامر الیه لترك کثیرا مما هو علیه۔

اور حضرت ابوبکرؓ نے اپنی مرض الموت میں اپنے بعد کے لیے حضرت عمرؓ بن الخطاب کو خلیفہ مقرر فرمایا۔

کہا گیا ہے کہ جب انھوں نے خلیفہ مقرر کرنے کا ارادہ کر لیا تو حضرت عبد الرحمٰنؓ بن عوف کو بلایا جیسا کہ ابن سعد نے، اس نے واقدی سے۔ ... ذکر کیا ہے کہ جب ابوبکرؓ کی وفات کا وقت قریب ہوا تو آپ نے عبد الرحمٰنؓ بن عوف کو بلایا اور کہا عمرؓ کے متعلق کیا خیال ہے؟ حضرت عبد الرحمٰنؓ نے کہا۔ اے خلیفۂ رسولؐ! حضرت عمرؓ آپ کی رائے سے بھی زیادہ بہتر ہیں۔ لیکن مزاج میں سختی ہے۔

حضرت ابوبکرؓ نے کہا۔ "وہ اس لیے تھی کہ میں نرم تھا۔ جب خلافت کا بوجھ سر پر

پڑے کا تو سب سختیاں دُور ہو جائیں گی۔

۲۔ ثم دعا عثمان بن عفان، قال: یا ابا عَبدُاللہِ۔ اخبرنی عن عمر۔ قال: "انت اخبرُ بہ۔ فقال ابوبکر: علیٰ ذٰلک یا ابا عبد اللہ! قال: اللھم علمی بہ ان سریرتہٗ خیرٌ من علانیتہٖ وان لیس فینا مثلہٗ[1]

قال ابو بکر رحمہ اللہ: رحمک اللہ یا ابا عبد اللہ، لا تذکر مما ذکرتُ لک شیئًا۔

پھر حضرت عثمان بن عفانؓ کو بلایا اور کہا" اے ابو عبداللہ! حضرت عمرؓ کے متعلق کیا رائے ہے؟ حضرت عثمانؓ نے فرمایا۔ آپ ہم سے بہتر جانتے ہیں"۔ حضرت ابوبکرؓ نے کہا: اے ابو عبداللہ! بات واضح کیجئے۔ حضرت عثمانؓ نے کہا: میرے علم کے مطابق ان کا باطن ان کے ظاہر سے اچھا ہے اور ہم لوگوں میں ان کا کوئی جواب نہیں۔

حضرت ابوبکرؓ نے کہا" اے ابو عبداللہ! اللہ آپ پر رحم کرے۔ دوسرے لوگوں سے اس بات کا تذکرہ مت کرنا۔

۳۔ جب اس بات کے چرچے ہوئے کہ حضرت ابوبکرؓ حضرت عمرؓ کو خلیفہ کرنا چاہتے ہیں تو بعضوں کو تردّد ہوا۔ چنانچہ حضرت طلحہؓ نے حضرت ابوبکرؓ سے جاکر کہا کہ آپ کے موجود ہوتے عمرؓ کا ہم لوگوں کے ساتھ کیا برتاؤ تھا؟ اب وہ خلیفہ ہوں گے تو خدا جانے کیا کریں گے۔ اب آپ خدا کے ہاں جاتے ہیں یہ سوچ لیجئے کہ خدا کو کیا جواب دیجئے گا؟ حضرت ابوبکرؓ نے کہا۔ میں خدا سے کہوں گا کہ میں نے تیرے بندوں پر اس شخص کو افسر مقرر کیا ہے جو تیرے بندوں میں سب سے اچھا تھا۔ (الفاروق۔ شبلی نعمانی خلافت ابوبکر)

۴۔ عن محمد بن ابراھیم بن الحارث۔ قال۔ دعا ابوبکرٍ عثمان خالیا فقال اکتبْ۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم، ھذا ما عھد ابوبکر بن ابی قحافۃ

---

[1] ایک روایت کے مطابق آپ نے حضرت علیؓ کو بھی بلا کر پوچھا تو ان کا جواب بھی بعینہٖ حضرت عثمانؓ کے جواب کے مطابق تھا۔

الی المسلمین - امابعد قال : ثم اغمی علیہ، فذھب عنہ فکتب عثمان : اما بعد فانی قد استخلف علیکم عمر بن الخطاب ، و لم آلکم خیراً منہ، ثم افاق ابوبکر فقال اقرا علیّ - فقرا علیہ، فکبّر ابوبکرؓ

محمد بن ابراہیم حارث کہتے ہیں کہ حضرت ابوبکرؓ نے حضرت عثمانؓ کو تنہائی میں بلایا اور فرمایا : لکھو !

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ۔ یہ وہ عہد نامہ ہے جو ابوبکر بن ابو قحافہ نے مسلمانوں کی طرف سے طے کیا ۔ امابعد ۔ راوی کہتا ہے کہ پھر حضرت ابوبکرؓ کو غش آگیا ۔ تو حضرت عثمانؓ نے یہ دیکھ کر لکھ دیا : امابعد ! بے شک مَیں نے تم پر عمر بن الخطاب کو خلیفہ بنایا ہے اور تمہاری بھلائی میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا ۔" پھر حضرت ابوبکرؓ کو افاقہ ہوا تو کہنے لگے ۔" مجھے پڑھ کر سناؤ کیا لکھا ہے ؟ چنانچہ ان کو پڑھ کر سُنایا گیا تو بے ساختہ اللہ اکبر پکار اُٹھے ۔

۵ - عن ابی السفر ۔ قال : اشرف ابوبکر علی الناس من کنیفہ و اسماء بنت عمیس مُمسکتہ ، مرشومۃ الیدین، وھو یقول :

اترضون بمن استخلف علیکم فانی واللہ ما الوت من جھد الرای ولا ولیت ذا قرابۃ وانی قد استخلفت عمر بن الخطاب ، فاسمعوا لہ واطیعوا ۔ فقالوا سمعنا واطعنا ۔

" ابوالسفر کہتے ہیں ۔ حضرت ابوبکرؓ اپنے بالاخانے پر چڑھ کر لوگوں سے متوجہ ہوئے جبکہ اسماء بنت عمیس انھیں تھامے ہوئے تھیں جس کے دونوں ہاتھ گودے ہوئے تھے ۔ اور حضرت ابوبکرؓ کہتے تھے ۔

جس شخص کو مَیں نے خلیفہ بنایا ہے کیا تم اس سے راضی ہو ۔ خدا کی قسم مَیں نے رائے قائم کرنے میں کوئی کمی نہیں کی ہے اور اپنے کسی رشتہ دار کو نہیں بلکہ عمرؓ بن الخطاب کو مقرر کیا ہے ۔ لہٰذا تم اس کی سُنو اور اطاعت کرو ۔ اس پر لوگوں نے کہا : ہم سُنیں گے اور اطاعت کریں گے ۔"

۶ - عن قیس، قال رایت عمر بن الخطاب وھو یجلس والناس مَعَہٗ وبیدہ جریدۃ ، وھو یقول ایھا الناس و اسمعوا واطیعوا قول

خلیفۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انہ یقول" انی لم آلکم نصحًا۔
قال : ومنہ مولی لابی بکر یقال لہ شدید۔ معہ الصحیفۃ التی
فیھا استخلاف عمر۔

قیس کہتے ہیں کہ میں نے عمر بن الخطاب کو دیکھا جو کہ لوگوں کے ساتھ بیٹھے تھے، اور ان کے ہاتھ میں ایک ورق تھا اور وہ کہتے تھے۔ اے لوگو! خلیفہ رسول اللہ (حضرت ابوبکرؓ) کی بات سنو اور اس کی اطاعت کرو۔ وہ کہتے ہیں" میں نے تمھاری خیر خواہی میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا۔ راوی کہتا ہے : کہ حضرت عمرؓ کے ساتھ حضرت ابوبکرؓ کے آزاد کردہ غلام شدید نامی تھے۔ اس غلام کے پاس وہ ورق تھا جس میں حضرت عمرؓ کی نامزدگی لکھی ہوئی تھی۔

۷۔ اور حافظ ابنِ کثیر کی روایت کے مطابق حضرت عمرؓ ہی حضرت ابوبکرؓ کی مرض الموت کے دوران (اور اس کے علاوہ بھی) جماعت کی امامت کراتے تھے جس طرح حضرت ابوبکرؓ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی غیر موجودگی میں یہ فریضہ سرانجام دیتے تھے۔ گویا حضرت ابوبکرؓ کے بعد حضرت عمرؓ کی خلافت کا یہ واضح اشارہ تھا۔ استخلاف کے متعلق ابن کثیر کی یہ نہایت مختصر روایت اس طرح ہے :۔

وکان عمر ابن الخطاب یُصلی عنہ فیھا بالمسلمین وفی اثناء ھذا المرض فکتبہ، بالامر من بعدہٖ الی عمر ابن الخطاب، وکان الذی کتب العھد عثمان بن عفان، قُرِئَ علی المسلمین فاقروٗا بہ واسمعوا لہ واطاعوہ۔ (البدایۃ والنھایۃ ج ۵ ص۱۸)

اور حضرت ابوبکرؓ کی جگہ حضرت عمرؓ نماز پڑھایا کرتے تھے اور اس مرض کے دوران بھی۔ سو حضرت ابوبکرؓ نے اپنے بعد عمر بن خطاب کے لیے امر خلافت لکھا اور جس شخص نے یہ عہد لکھا وہ عثمان بن عفانؓ تھے۔ یہ عہد مسلمانوں پر پڑھا گیا۔ لوگوں نے خود بھی پڑھا اور سُنا اور اس کی اطاعت کی۔

انتخاب حضرت عثمانؓ

۱۔ حضرت عمرؓ سے نامزدگی کی درخواست

عن عبداللہ ابن عمر قال : قیل لِعُمَرَ : "الاتستخلفُ؟ قال ان استخلفُ فقد استخلف من ھو خیر منی ابوبکرٍ وان اترك فقد ترك من ھو خیر منی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔

فاثنوا علیہ فقال ، راغبٌ راھبٌ وددتُ ان نجوت منھا لاَ لی ولا علی ، لا اتحمّلھا حیّا ومیتا۔ (بخاری۔کتاب الاحکام۔باب الاستخلاف ۸۹۲)

عبداللہ بن عمرؓ کہتے ہیں (جب) حضرت عمرؓ (زخمی ہوئے تو ان) سے کہا گیا۔ "آپ کسی کو خلیفہ بنا دیجئے؟" فرمایا: "اگر خلیفہ مقرر کروں تو (بھی ٹھیک ہے کیونکہ) حضرت ابوبکرؓ ، جو مجھ سے بہتر تھے خلیفہ مقرر کر گئے تھے اور اگر نہ کروں تو (بھی ٹھیک ہے کیونکہ) حضور اکرمؐ جو مجھ سے بہتر تھے خلیفہ نہیں بنا گئے تھے۔"

پھر لوگوں نے آپ کی تعریف شروع کی تو آپ نے فرمایا "کوئی تو میری تعریف دل سے کرتا ہے اور کوئی مجھ سے ڈر کر اور میں تو یہی غنیمت سمجھتا ہوں کہ خلافت کے مقدمہ میں برابر پر چھوٹ جاؤں نہ مجھے ثواب ملے نہ عذاب ہو۔ میں اس بوجھ کو جسے زندگی بھر اٹھایا ہے۔ مرتے وقت بھی اٹھانا نہیں چاہتا۔"

دوسری بار جب یہ بات دہرائی گئی تو آپ نے یوں جواب دیا:

ان عمر بن الخطاب لما طعن قیل لہ : یا امیر المؤمنین، لو استخلفت! قال لمن استخلف؟ لو کان ابوعبیدۃ بن الجراح حیًّا، استخلفتہٗ، فان سئلنی ربی قلت : سمعت نبیّك یقول : وانہ امین ھذہ الاُمۃ۔ ولو کان سالم مولی ابی حذیفۃ حیًّا استخلفہٗ ، فان سئلنی ربی قلت سمعت نبیّك یقول : ان سالمًا شدید الحبّ للہ۔

فقال له رجل : ادلك عليه ؟ عبد الله بن عمر، فقال : قاتلك الله، والله ما اردت بهذا ، ویحك کیف استخلف رجلا عجز عن طلاق امرأته! لا ارب لنا فی امورکم، ما حمدتها فارغب فیها احداً من اهل بیتی : ان کان خیراً فقد اصبنا منه، وان کان شراً فشرعنا آل عمر بحسب آل عمران یحاسب منهم رجل واحد۔ (الطبری ۔۔۔۔)

حضرت عمرؓ بن الخطاب پر جب خنجر کا وار ہوا تھا تو آپ سے کہا گیا اے امیرالمومنینؓ کسی کو خلیفہ بنا جائیے۔ آپ نے کہا۔ "کس کو جانشین بناؤں ؟ اگر ابوعبیدہ بن الجراحؓ زندہ ہوتے تو ان کو جانشین مقرر کر جاتا۔ میرا رب اگر مجھے اس بارے میں پوچھتا تو کہہ دیتا کہ تیرے نبی کی زبان سے سنا تھا کہ ابوعبیدہ اس اُمت کے امین ہیں"۔

پھر اگر ابوحذیفہ کے مولیٰ سالمؓ زندہ ہوتے تو انھیں خلیفہ نامزد کر جاتا۔ میرا رب پوچھتا تو کہہ دیتا کہ مَیں نے تیرے نبی کو فرماتے ہوئے سنا تھا۔ "سالمؓ اللہ سے بہت محبت کرنے والا ہے"۔

کسی نے کہا : "میں آپ کو بتلاؤں ؟ عبداللہ بن عمرؓ کو نامزد کر جائیے"۔ آپ نے ناراضی کا اظہار فرمایا اور کہنے والے کو سخت سُست کہا اور فرمانے لگے کہ "میں ایسے آدمی کو اپنا جانشین بنا جاؤں جو اپنی عورت کو طلاق دینے میں جذبات پر قابو نہ رکھ سکا۔ ہمیں تمہارے معاملات کی کوئی خواہش نہیں۔ مَیں نے اسے کچھ اچھا نہیں پایا کہ اپنے گھر میں سے کسی اور کے لیے بھی اس کی خواہش کروں۔ اگر یہ حکومت اچھی چیز تھی تو اس کا مزہ ہم نے چکھ لیا۔ اور اگر یہ بری چیز تھی تو عمرؓ کے خاندان کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ کل کو خدا کے سامنے ان میں سے صرف ایک ہی آدمی سے حساب لیا جائے"۔

(الطبری ج ۴ ص ۲۲۷-۲۲۸)

نامزدگی سے متعلق حضرت عمرؓ کے خیالات کی ترجمانی علامہ شبلی نعمانی نے تحقیق کے بعد ان الفاظ میں کی ہے :-

"اس وقت (آپ کے زخمی ہونے کے بعد) اسلام کے حق میں جو سب سے اہم کام تھا وہ ایک خلیفہ کا انتخاب کرنا تھا۔ تمام صحابہ بار بار حضرت عمرؓ سے خطاب کرتے تھے کہ اس مہم کو آپ طے کر جائیے۔ حضرت عمرؓ نے خلافت کے معاملے میں مدتوں

غور کیا تھا۔ اور اکثر سوچا کرتے تھے۔ بار بار لوگوں نے ان کو اس حالت میں دیکھا کہ سب سے الگ متفکر بیٹھے ہیں اور کچھ سوچ رہے ہیں۔ دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ خلافت کے باب میں غلطاں وپیچاں ہیں۔

مدت کے غور و فکر پر بھی ان کے انتخاب کی نظر کسی شخص پر جچتی نہ تھی۔ بارہا ان کے منہ سے بے ساختہ آہ نکل گئی۔ کہ افسوس! اس بارِ گراں کا اٹھانے والا کوئی نظر نہیں آتا۔ تمام صحابہ میں اس وقت چھ شخص تھے جن پر انتخاب کی نظر پڑ سکتی تھی۔ علیؓ، عثمانؓ، زبیرؓ، طلحہؓ، سعد بن ابی وقاصؓ اور عبدالرحمان بن عوفؓ۔ لیکن حضرت عمرؓ ان سب میں کچھ نہ کچھ کمی پاتے تھے۔ اور اس کا انھوں نے مختلف موقعوں پر اظہار بھی کر دیا تھا۔ چنانچہ طبری وغیرہ میں ان کے ریمارک بہ تفصیل مذکور ہیں۔ مذکورہ بالا بزرگوں میں وہ حضرت علیؓ کو سب سے بہتر جانتے تھے لیکن بعض اسباب سے ان کی نسبت بھی قطعی فیصلہ نہ کر سکتے تھے۔

غرض وفات کے بعد جب لوگوں نے اصرار کیا تو فرمایا کہ ان چھ شخصوں میں سے جس کی نسبت کثرتِ رائے ہو وہ خلیفہ منتخب کر لیا جائے۔"

۲۔ چھ رکنی کمیٹی اور اس کا طریقِ کار

بعد ازاں جب حضرت عمرؓ آخری وصیتیں فرما رہے تھے تو لوگوں نے پھر ولی بنانے کو کہا؛ اس بارہ میں حضرت عمرؓ کی تجاویز یہ تھیں (طویل حدیث سے اقتباس لیا گیا ہے)۔

فقالوا أوصِ یا امیرالمومنین استخلف۔ قال ما اجدُ احق لھذا الامر من ھٰؤلاء النفر اَوِ الرھط الذین توفی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وھو عنھم راضٍ فسمّٰی علیًّا وعثمان والزبیر وطلحۃ وسعد وعبد الرحمٰن۔ وقال یشھدکم عبد اللہ بن عمر و لیس لہ من الامر شیٔ کھیئۃ التعزیۃ لہ فان اصابت الامرۃ سعداً ذاك والا فلیستعن بہ ۔۔۔۔۔۔ فلما فرِغ من دفنہٖ اجتمع ھٰؤلاء الرھط فقال عبد الرحمٰن اجعلوا امرکم الی ثلثۃ منکم۔ فقال الزبیر قد جعلت امری الی علیؓ، وقال طلحۃ قد جعلت امری الی عثمانؓ،

وقال سعدٌ قد جعلت امری الی عبد الرحمٰن بن عوفٍ - فقال عبدالرحمٰن ایکما تبرّا من هذا الامر ؟ فیجعله' الیه' والله علیه والاسلام لینظرنّ افضلهم فی نفسه - فاسکت الشیخان - فقال عبد الرحمٰن افتجعلونهٗ والله علیّ ان لا آلوا عن افضلکم ؟ قالا - نعم - فاخذ بید احدهما فقال لك قرابة من رسول الله صلی الله علیه وسلم والقدم فی الاسلام ما قد علمت فالله علیك لئن امّرتُك لتعدِلن ولئن امرتُ عثمان لتسمعن ولتطیعن ثمّ خلا بالآخر فقال له مثل ذلك - فلما اخذ المیثاق قال ارفع یدك یا عثمان فبایعهٗ فبایع له علیٌّ وولج اهل الدار فبایعوه -- (بخاری - کتاب المناقب باب قصة البیت والاتفاق علی عثمان)

لوگوں نے کہا اے امیر المومنین کسی کو خلیفہ بنا جائیے ! آپ نے کہا - خلافت کا حق داران چند لوگوں کے سوا کوئی نہیں جن سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم راضی رہے - انھوں نے علیؓ ، عثمانؓ ، زبیرؓ ، طلحہؓ ، سعد ابن وقاص اور عبدالرحمٰن بن عوف[1] کا نام لیا اور کہا کہ عبداللہ بن عمرؓ مشورہ میں تمھارے ساتھ شریک رہے گا - لیکن خلافت میں اس کا کوئی حصّہ نہیں - یہ عبداللہ کو تسلی دینے کے لیے کہا - پھر اگر خلافت سعدؓ کو مِل گئی تو بہتر ، ورنہ جو خلیفہ ہو وہ سعد سے مدد لیتا رہے .....

پھر جب ان کے دفن سے فراغت ہوئی تو یہ چھ آدمی ایک جگہ اکٹھے ہوئے - عبدالرحمٰن بن عوف نے کہا - چھ آدمی تین کو اپنے میں سے مختار کر دو - چنانچہ زبیرؓ نے حضرت علیؓ کو ، طلحہؓ نے حضرت عثمانؓ کو اور سعدؓ نے حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف کو اختیار دے دیا (ان کے حق میں دستبردار ہو گئے اور چھ سے تین رہ گئے) -

پھر حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف نے حضرت علیؓ اور حضرت عثمانؓ دونوں سے

---

[1] عشرہ مبشرہ سے یہی لوگ باقی تھے - ابو عبیدہؓ بن الجراح تو وفات پا چکے تھے اور سعید بن زیدؓ حضرت عمرؓ کے چچا زاد بھائی تھے - اس لیے اس کا نام آپ نے عمداً نہیں لیا - (البدایۃ والنہایۃ ج ، ص ۱۴۴)

کہا۔ تم دونوں میں سے جو کوئی خلافت کا طالب نہ ہو ہم اس کو خلیفہ بنائیں گے اللہ اور اسلام گواہ رہے ہیں۔ میں اسی کو تجویز کروں گا جو میرے نزدیک افضل ہے۔ یہ سُن کر دونوں بزرگ خاموش ہو گئے۔

پھر عبدالرحمٰنؓ نے دونوں سے کہا۔ "کیا تم مجھے مختار بناتے ہو؟ خدا کی قسم میں اسی کو خلیفہ بناؤں گا جو افضل ہوگا۔" دونوں نے کہا "ٹھیک ہے۔" حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے ان میں سے ایک (حضرت علیؓ) کا ہاتھ پکڑا اور فرمایا۔ تمہیں آنحضرتؐ سے قرابت ہے اور تمہارا اسلام بھی پُرانا ہے جیسا کہ تم خود جانتے ہو۔ اللہ تمہارا نگہبان ہو۔ اگر میں تمہیں خلیفہ بناؤں تو تم عدل کروگے اور اگر عثمانؓ کو بناؤں تو اس کا حکم سنوگے اور اس کی طاعت کروگے۔ پھر عثمانؓ سے تنہائی میں یہی گفتگو کی۔ جب دونوں سے اقرار لے چکے تو کہنے لگے۔ عثمانؓ اپنا ہاتھ اُٹھاؤ۔ سو عبدالرحمٰنؓ نے ان کے ہاتھ پر بیعت کی پھر علیؓ نے بیعت کی اور سارے مدینہ والے گھس پڑے اور انھوں نے بھی بیعت کرلی۔

۳۔ حضرت عثمانؓ کو کیوں منتخب کیا گیا (معیارِ انتخاب)

حضرت عبدالرحمٰن بن عوف نے ان دونوں بزرگوں میں سے حضرت عثمان کو کیسے افضل قرار دیا۔ اس کی تفصیل درج ذیل حدیث سے واضح ہے۔

ان المسور بن المخرمة اخبره ان الرهط الذين ولاهم عمر اجتمعوا فتشاروا۔ قال لهم عبد الرحمٰن لست بالذى انافسكم على هذا الامر، ولكنكم ان شئتم اخترت لكم منكم۔ فجعلوا ذلك الى عبد الرحمٰن۔ فلما ولوا عبد الرحمٰن امرهم فمال الناس على عبد الرحمٰن حتى ما ارى احدًا من الناس يتبعُ اولٰئك الرهط ولا يطا عقبه، ومال الناس على عبد الرحمٰن يشاورونه، تلك الليالى حتى اذا كانت الليلة التى اصبحنا منها فبايعنا عثمان قال المسور طرقنى عبد الرحمٰن بعد هجعٍ من الليل فضرب الباب حتى استيقظت فقال اراك نائمًا فوالله ما اكتحلتُ هذا الليلة بكبير نومٍ۔

انطلق فادع الزبیر و سعداً - فدعوتھما لہٗ فشاورھما ثم دعا نی فقال : ادع لی علیاً - فدعوتہٗ فناجاہ حتیٰ ابھارّ اللیل - ثم قام علیؓ من عندہ وھو علی طمع وقد کان عبد الرحمٰن یخشی من علیؓ شیئاً - ثم قال ادع لی عثمان فدعوتہ فناجاہ حتیٰ فرق بینما المؤذن بالصبح - فلما صلی الناس الصبح و اجتمع اولٰئك الرھط عند المنبر فارسل الی من کان حاضراً من المھاجرین و الانصار و ارسل الی امراء الاجناد وکانوا وافوا تلك الحجۃ مع عمر فلما اجتمعوا تشھد عبدالرحمٰن ثم قال اما بعد ! یا علیؓ اِنّی قد نظرت فی امر الناس فلم ادھم یعدلون بعثمان فلا تجعلن علی نفسك سبیلا - فقال ابایعك علی سنۃ اللہ و رسولہ والخلیفتین من بعدہ فبایعہ، عبد الرحمان و بایعہ الناس المھاجرون والانصار و امراءُ الاجناد والمسلمون - (بخاری - کتاب الاحکام باب کیف یبایع الامام الناس)

حضرت مِسوَر بن مخرمہ نے بیان کیا کہ حضرت عمرؓ جن چھ آدمیوں کو خلافت کے لیے نامزد کر گئے تھے، وہ سب جمع ہوئے اور مشورہ کیا - حضرت عبد الرحمٰن بن عوفؓ نے کہا مجھے اس امرِ خلافت سے کوئی دلچسپی نہیں - ہاں اگر تم چاہو تو تم میں انتخاب کر سکتا ہوں - انھوں نے عبدالرحمٰن کو یہ اختیار دے دیا - جب اختیار دے چکے تو لوگ عبدالرحمٰن کی طرف مائل ہو گئے - کوئی آدمی ایسا نہ تھا جو ان نامزدگان کے پیچھے نہ چل رہا ہو اور جسے دیکھو وہ ان راتوں میں حضرت عبدالرحمٰنؓ سے مشورہ کر رہا ہوتا یہاں تک کہ وہ رات آگئی جس کی صبح ہم نے عثمانؓ کی بیعت کی ۔

مِسوَر بن مخرمہ کہتے ہیں جب وہ رات آئی تو تھوڑی رات گئے عبدالرحمٰن بن عوف نے میرا دروازہ کھٹکھٹایا - مَیں جاگ اٹھا تو کہنے لگے - واہ تم سو رہے ہو میں اس رات (یا دن تین راتوں میں) کچھ زیادہ نہیں سویا ۔

جاؤ زبیر (ابن عوام) اور سعد (ابن ابی وقاص) کو بلا لاؤ - مَیں انھیں بلا لایا - عبدالرحمٰن ان سے مشورہ کرتے رہے - پھر مجھے بلایا اور کہا - اب علیؓ کو بلا لاؤ - میں بلا لایا تو آدھی رات تک ان سے سرگوشیاں کرتے رہے - جب علیؓ ان کے

پاس سے اُٹھے۔ حضرت علیؓ پُر اُمید تھے۔ لیکن عبدالرحمٰن بن عوف کو حضرت علیؓ کے سلسلہ میں کچھ خطرہ تھا۔

پھر مجھے کہا اب عثمانؓ کو بلاؤ۔ مَیں بلالایا تو سرگوشیاں کرنے لگے تا آنکہ مؤذّن کی صبح کی اذان نے انھیں جُدا کیا۔ جب لوگوں نے صبح کی نماز پڑھ لی تو یہ (چھ اشخاص) منبر کے پاس جمع ہو گئے تو حضرت عبدالرحمٰنؓ نے مدینہ میں موجود سب مہاجرین و انصار کو بلا بھیجا۔ اور ان فوج کے سرداروں کو بھی جنہوں نے حضرت عمرؓ کے ساتھ حج ادا کیا تھا اور وہ موجود تھے۔ جب سب لوگ جمع ہو گئے تو آپ نے تشہد پڑھا پھر کہنے لگے۔ "علیؓ! تم بُرا نہ ماننا مَیں نے سب لوگوں سے اس معاملہ میں گفتگو کی وہ عثمانؓ کو مقدم رکھتے ہیں ان کے برابر کسی کو نہیں سمجھتے۔

پھر عثمانؓ سے کہا۔ مَیں تم سے اللہ کے دین، اس کے رسول کی سنت اور اس کے بعد دونوں خلیفوں کے طریق پر بیعت کرتا ہوں۔ یہ کہہ کر عبدالرحمٰن نے بیعت کی اور جتنے مہاجرین و انصار، فوجوں کے سردار اور عام مسلمان وہاں موجود تھے، سب نے بیعت کر لی۔

۴۔ استصوابِ عامہ

حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ کے انتخاب میں کس قدر جانفشانی سے کام لیا۔ البدایہ والنہایہ کی درج ذیل عبارت میں اس کا تفصیلی ذکر ہے:۔

ثم نهض عبدالرحمٰن رضی الله عنه یستشیر الناس فیهما ویجمع رأی المسلمین برای رءُوس الناس واقیادهم جمیعًا واشتاتًا، مثنیٰ وفرادیٰ، ومجتمعین، سرًّا وجهرًا حتی خلص الی النساء المخدرات فی حجابین، وحتیٰ سال الولدان فی المکاتب، وحتیٰ سال من یرد من الرکبان والاعراب الی المدینة، فی مدة ثلاثة ایام ولیالیها۔ فلم یجد اثنین یختلفین فی تقوم عثمان بن عفان، الا ما ینقل عمار والمقداد انهما اشار بعلی بن ابی طالب ثم بایعا مع الناس علی ما سنذکره۔ فسعیٰ فی ذلك عبدالرحمٰن ثلاثة ایام بلیالیها

ينتهض بكثير يوم الاصلوٰة ودعاء واستخارة وسؤالا من ذوى الرأى عنهم، فلو يجد احدا يعدل لعثمان بن عفان رضى الله عنه۔
(البداية والنهاية ج ۷، ص۱۴۷)

پھر حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف ان دونوں (حضرت عثمانؓ و حضرت علیؓ) کے متعلق لوگوں سے مشورہ کرنے میں مشغول ہوگئے۔ آپ اکابر سے بھی مشورہ کرتے، اور ان کے پیروکاروں سے بھی۔ اجتماعاً بھی اور متفرق طور پر بھی۔ اکیلے اکیلے سے بھی اور دو دو سے بھی۔ خفیہ بھی اور علانیہ بھی، حتیٰ کہ پردہ نشین عورتوں سے بھی مشورہ کیا۔ مدرسے کے طالب علموں سے بھی، اور مدینہ کی طرف آنے والے سواروں سے بھی، بدوؤں سے بھی جنھیں وہ مناسب سمجھتے۔ تین دن اور تین راتیں یہ مشورہ جاری رہا۔ آپ نے دو آدمیوں کے سوا سب لوگوں کو حضرت عثمانؓ کی خلافت کے حق میں پایا۔ البتہ حضرت عمار اور مقدادؓ نے حضرت علیؓ کے حق میں مشورہ دیا۔ بعد میں ان دونوں نے بھی (حضرت عثمانؓ) کی دوسرے لوگوں کے ساتھ بیعت کی جیساکہ ہم ابھی بیان کریں گے۔

سو حضرت عبدالرحمٰنؓ ان تین دن اور تین راتوں میں بہت کم سوئے۔ وہ اکثر نماز، دعا، استخارہ اور ان لوگوں سے مشورہ میں وقت گزارتے تھے جن کو وہ مشورہ کا اہل سمجھتے۔

سو آپ نے (اس مشورہ کے دوران) کسی کو بھی نہ پایا۔ جو حضرت عثمانؓ کے برابر کسی کو سمجھتا ہو۔

۵۔ قواعدِ انتخاب

۱۔ خلیفہ کے انتخاب کے لیے تین دن کی مدت حضرت عمر فاروقؓ نے مقرر کی تھی۔
۲۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کو صرف رائے دینے کی حد تک نامزد شدہ کمیٹی میں شامل ہونے کی اجازت تھی۔
۳۔ حضرت مقدادؓ کو یہ حکم دیا گیا کہ جب تک یہ لوگ اپنے میں سے خلیفہ منتخب نہ کرلیں کسی دوسرے کو اندر نہ جانے دینا۔

حضرت مقداد بن اسود اور ابوطلحہ انصاریؓ نے وصیّتِ فاروقی کے مطابق حضرت صہیبؓ کو تین دن کے لیے عارضی طور پر (تا انتخاب خلیفہ) مدینہ کا امام مقرر کیا اور خود اپنے آدمیوں کی جمعیت لے کر (۵۰ آدمی) حضرت مسوّر بن مخرمہ اور بقول بعضے حضرت عائشہؓ کے مکان ——— جہاں نامزد شدہ ارکان خلیفہ کے انتخاب کے لیے جمع ہوئے تھے ——— کے دروازے پر حفاظت کی غرض سے بیٹھ گئے سوائے حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے کوئی اس میں داخل نہ ہو سکتا تھا۔

حضرت عمرو بن العاص اور حضرت مغیرہ بن شعبہ بھی آکر دروازہ پر بیٹھ گئے۔ حضرت سعد بن وقاصؓ کو معلوم ہوا تو انھوں نے ان دونوں کو وہاں سے اٹھوا دیا۔ تاکہ وہ یہ نہ کہہ سکیں کہ ہم بھی اصحابِ شوریٰ میں شامل تھے۔

تین دن بعد جب حضرت عبدالرحمٰن بن عوف مسجد میں خلافت کا اعلان کرنے والے تھے۔ تو کچھ لوگوں نے اعلان سے قبل اپنی رائے ظاہر کرنا شروع کر دی تھی۔ حالانکہ یہ لوگ شوریٰ میں سے نہ تھے۔ مثلاً حضرت عمارؓ نے کہا کہ میں حضرت علیؓ کو مستحق خلافت سمجھتا ہوں۔ ابن ابی سرحؓ اور عبداللہ بن ابی ربیعہؓ نے کہا کہ ہم حضرت عثمانؓ کو زیادہ مستحق و مناسب پاتے ہیں۔ یہ صورتِ حال دیکھ کر حضرت سعد بن وقاصؓ نے حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف سے کہا۔ "اب دیر کیوں کر رہے ہو؟ اندیشہ ہے کہ مسلمانوں میں کوئی فتنہ نہ پیدا ہو جائے، لہٰذا جلد اپنی رائے کا اظہار کر کے یہ مسئلہ ختم کرو۔" چنانچہ آپ نے اعلان کر دیا جس کی تفصیل پہلے گزر چکی ہے۔ (البدایہ والنہایہ جلد ۷ صفحہ ۱۴۵)

انتخاب حضرت علیؓ

(اقتباسات از روایات طبری ج ۴ از صفحہ ۴۲۷ تا ۴۳۵)

۱ - عن محمد بن عبد اللہ بن سوار بن نویرہ، وطلحۃ بن الاعلم، و ابو حارثہ و ابو عثمان، قالوا: بقیت المدینۃ بعد قتل عثمان رضی اللہ عنہ خمسۃ ایام، و امیرھا الغافقی بن حرب، یلتمسون من یُجیبھم الی القیام بالامر فلا یجدونہ۔ یاتی المصریون علیا فیختبی منھم و یلوذ بحیطان المدینۃ، فاذا لقوہ، باعدھم و تبرّا منھم و من مقالتھم مرۃ بعد مرۃ۔ و یطلب الکوفیون الزبیر فلا یجدونہ فارسلوا الیہ حیث ھو رسلاً: فباعدھم او تبرا من مقالتھم و یطلب المصریون طلحۃ فاذا لقیھم باعدھم و تبرا من مقالتھم مرۃ بعد مرۃ، وکانوا مجتمعین علی قتل عثمان، مختلفین فیمن یتولون، فلما لم یجدوا مما لثا ولا مجیبًا جمعھم الشر علی اول من اجابھم وقالوا: لا نُولّی احدا من ھؤلاء الثلاثۃ فبعثوا الی سعد بن ابی وقاص وقالوا انک من اھل الشوریٰ فراینا فیک مجتمع، فاقدم نبایعک۔ فبعث الیھم: اِنّی و ابن عمر فوضنا منھا فلا حاجۃ لی فیھا۔

ثم انھم اتوا ابن عمر عبد اللہ، فقالوا: انت ابن عمر فقم لھذا الامر: فقال: ان ھذا الامر انتقامًا واللہ لا اتعرض بہ فالتمسوا غیری"۔ فبقوا حَیَارٰی لا یدرون مایستون و الامر امرھم (ص ۴۳۲)

محمد بن عبد اللہ بن سوار بن نویرہ، طلحہ بن الاعلم، ابوحارثہ اور ابوعثمان سے روایت ہے۔ کہتے ہیں شہادت عثمان کے بعد پانچ دن تک غافقی بن حرب

امارت کے فرائض سرانجام دیتا رہا۔ یہ لوگ کسی ایسے شخص کی تلاش میں تھے جو امارت قبول کرے لیکن ناکام رہے۔ مصری لوگ حضرت علیؓ کے پاس آئے تو وہ ان سے غائب ہوگئے اور مدینہ کی ایک فصیل میں پناہ لی۔ جب یہ ان سے ملے تو حضرت علیؓ نے ان سے اور ان کے مطالبہ سے بار بار بیزاری کا اظہار کیا۔ اور کوفی لوگ حضرت زبیرؓ کو امام بنانا چاہتے تھے۔ ان لوگوں نے حضرت زبیرؓ کو کہیں نہ پایا۔ تو ان کی تلاش کے لیے آدمی بھیجے۔ حضرت زبیرؓ نے بھی ان سے اور ان کے مطالبہ سے بیزاری کا اظہار کیا۔ اور بصری لوگ حضرت طلحہؓ کو امیر بنانا چاہتے تھے۔ جب یہ ان سے ملے تو انھوں نے بھی ان سے اور ان کے مطالبہ سے بیزاری کا اظہار کیا۔ یہ شرپسند حضرت عثمانؓ کو شہید کر دینے پر متفق تھے مگر نئے امام کے تقرر میں اختلاف رکھتے تھے۔ پھر جب ان لوگوں کو کوئی بھی ایسا آدمی نہ ملا جو ان کے مطالبہ کو قبول کرتا یا جھوٹے وعدہ سے ہی ان کو خوش کر دیتا۔ وہ اس بات پر آمادہ ہوگئے کہ جو امارت قبول کرلے اسے امیر بنا دیا جائے۔ اور کہنے لگے ہم ان تینوں میں سے کسی کو بھی امیر نہیں بنائیں گے۔ انھوں نے حضرت سعد بن وقاص کے پاس آدمی بھیجا اور کہا۔ آپ اہلِ شوریٰ سے ہیں۔ ہم آپ کی امامت پر متفق ہیں سو آگے آیئے ہم آپ کی بیعت کرتے ہیں۔ حضرت سعدؓ نے جواب دیا میں اور عبداللہ بن عمر دونوں اس معاملہ سے باہر ہیں۔ مجھے اس امارت کی کوئی ضرورت نہیں۔

پھر یہ لوگ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے پاس آئے اور کہا۔ آپ حضرت عمرؓ کے بیٹے ہیں۔ آپ خلافت کے لیے کھڑے ہوں۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے کہا۔ یہ سب انتقامی کارروائی ہے۔ خدا کی قسم میں اس سے تعرض نہ کروں گا۔ میرے سوا کوئی اور آدمی ڈھونڈو۔ اب یہ لوگ سخت پریشان ہوئے اور نہیں جانتے تھے کہ اس معاملہ میں کیا کریں۔

۲۔ عن محمد وطلحة، قالا: فقالوا لهم: دونكم يا اهل المدينة فقد اجلناكم يومين، فوالله لئن لم تفرغوا لنقتلن غداً علياً طلحة والزبير وانا ساً كثيراً، فغشي الناس علياً۔ فقالوا: نبايعك و قد ترى ما انزل بالاسلام وما ابتلينا به من ذوي القربىٰ فقال

علی دعونی والتمسوا غیری (۴۳۴)

محمد اور طلحہ کہتے ہیں۔ اب ان لوگوں نے اہلِ مدینہ سے کہا کہ تمہیں دو دن کی مہلت ہے۔ اس دوران کوئی امیر مقرر کر لو۔ ورنہ اگلے دن ہم علیؓ، زبیرؓ اور طلحہؓ کے علاوہ اور بھی بہت سے لوگوں کو قتل کر دیں گے۔ پس لوگ حضرت علیؓ کے گرد ہو گئے اور کہا ہم آپ کی بیعت کرتے ہیں۔ آپ پہلے اسلام لانے والوں سے ہیں اور ذوی القربیٰ سے ہیں۔ حضرت علیؓ نے کہا۔ مجھے چھوڑ دو۔ کوئی دوسرا آدمی تلاش کرو۔

۴۔ عن الشعبی قال: لما قُتِل عثمان رضی اللہ عنہ اتی الناس علیاً وھو فی سوق المدینۃ، وقالوا لہ، اُبسط یدک نبایعک۔ قال لا تعجلوا فان عمر کان رجلاً مبارکاً وقد اوصیٰ بھا شوریٰ فامھلوا یجتمع الناس یتشاورون۔ فارتد الناس عن علیؓ ثم قال بعضھم ان رجع الناس الی امصارھم بقتل عثمان ولم یقم بعدہ قائم لھذا الامر لم تامن اختلاف الناس وفساد الامۃ فعادوا الی علیؓ فاخذ الاشتر بیدہٖ فقبضھا علی فقال ابعدِ ثلاثۃ: اما واللہ لئن ترکتھا لتقصرن عینیک علیاً حیناً۔ فبایعۃ العامۃ۔ واھل الکوفۃ یقولون ان اول من بایعہ اشتر۔ (۴۳۳)

شعبی کہتے ہیں جب حضرت عثمانؓ شہید ہو گئے تو لوگ حضرت علیؓ کے پاس آئے جبکہ وہ مدینہ کے بازار میں تھے۔ اور کہنے لگے ہاتھ بڑھایئے ہم آپ کی بیعت کرتے ہیں۔ آپ نے فرمایا۔ جلدی نہ کرو۔ حضرت عمرؓ بابرکت انسان تھے اور انھوں نے مشورہ کی تاکید فرمائی تھی۔ سو انتظار کرو تاکہ لوگ اکٹھے ہوں اور مشورہ کریں۔ سو لوگ حضرت علیؓ کے پاس سے چلے گئے۔ پھر بعض لوگوں (شرپسندوں) نے کہا۔ اگر ہم لوگ شہادتِ عثمانؓ کے بعد بغیر امیر کے تقرر کے اپنے شہروں کو چلے گئے تو ہماری خیر نہیں۔ اور اُمت میں فساد ہوگا۔ وہ دوبارہ حضرت علیؓ کے پاس آئے۔ اشتر (نخعی) نے آپ کا ہاتھ پکڑا اور انھیں قابو کیا اور تین بار کہا، اے خائن! خدا کی قسم اگر تو نے اس امارت کو ترک کیا تو ابھی تمہاری آنکھیں نکال دی جائیں گی[1]

[1] ان شرپسندوں اور غنڈوں کا طرزِ تخاطب ملاحظہ فرمایئے۔ نیز یہ بھی کہ کس صورتِ حال میں حضرت علیؓ خلیفہ منتخب ہوئے۔

پھر عام لوگوں نے بیعت کی یا اہلِ کوفہ نے۔کہتے ہیں کہ سب سے پہلے اشتر نے آپ کی بیعت کی۔

۴۔ عن عبد الرحمٰن بن جندب عن ابیہ قال: لما قُتِل عثمان رضی اللہ عنہ واجتمع الناس علی علیٍّ، ذھب الاشتر وجاء بطلحۃ فقال لہ. "دعنی انظر ما یصنع الناس- فلم یَدَعہ وجاء بہ یتلّہ تلاعنیفا وصعد المنبر فبایع- (۴۳۵)

عبدالرحمٰن بن جندب اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں۔جب حضرت عثمانؓ شہید ہوئے اور لوگ حضرت علیؓ کی خلافت پر متفق ہو گئے تو اشتر گیا اور طلحہؓ کو ساتھ لے آیا۔ حضرت طلحہ کہنے لگے۔ مجھے چھوڑ دو۔میں دیکھوں گا لوگ اس معاملہ میں کیا کرتے ہیں لیکن اس نے نہ چھوڑا اور سختی کے ساتھ کھینچ کر لے آیا۔چنانچہ وہ منبر پر چڑھے اور بیعت کی۔

۵۔ عن الحارث الوالبی: قال جاء حکیم بن جبلۃ بالزبیر حتی بایع: فکان الزبیر یقول: جاءنی لص من لصوص عبد القیس فبایعت و اللجم علی عنقی (۴۳۵)

حارث الوالبی کہتے ہیں۔حکیم بن جبلہ حضرت زبیر کو لے کر آیا حتیٰ کہ انھوں نے بیعت کی۔حضرت زبیر کہا کرتے تھے۔عبدالقیس کے چوروں میں سے ایک چور میرے پاس آیا اور میں نے بیعت کی جبکہ تلوار میری گردن پر تھی۔

۶۔ عن محمد بن حنفیۃ قال کنت مع ابی حین قتل عثمان رضی اللہ عنہ' فقام فدخل منزلہ، فاتاہ اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فقالوا ان ھذا الرجل قد قُتِل، ولا بُدَّ للناس من امام ولا نجد الیوم احداً احق بھٰذا الامر منك، لا اقدم سابقۃ ولا اقرب من رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ فقال: لا تفعلوا فانی اکون وزیراً خیرٌ من ان اکون امیراً، فقالوا ولا واللہ ما نحن بفاعلین حتی نبایعك: قال ففی المسجد، فان بیعتی لا تکون خفیًا ولا تکون الاعن رضا المسلمین"؛ قال سالم بن ابی الجعد، فقال عبد اللہ بن عباس لقد کرھت ان یاتی المسجد مخافۃ ان یشغب علیہ وابی ھو الا المسجد، فلما دخل دخل المھاجرون والانصار فبایعوہ ثم بایعہ الناس۔

محمد بن حنفیہ کہتے ہیں۔ جب حضرت عثمانؓ شہید ہوئے تو میں اپنے باپ (حضرت علیؓ) کے ساتھ تھا۔ آپ کھڑے ہوئے پھر اپنے گھر میں داخل ہوئے تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی آپ کے پاس آئے اور کہنے لگے۔ حضرت عثمانؓ تو شہید ہو گئے اور امام کے بغیر لوگوں کے لیے کوئی چارہ نہیں۔ اور ہم آج امارت کے لیے آپ سے زیادہ مناسب کوئی آدمی نہیں دیکھتے۔ مسابقت فی الاسلام کی وجہ سے بھی اور حضورؐ کے ساتھ قرابت کی وجہ سے بھی۔ حضرت علیؓ نے کہا۔ "ایسا نہ کرو۔ میں امیر بننے سے زیادہ وزیر بننا پسند کرتا ہوں"۔ لوگوں نے کہا۔ "خدا کی قسم! ہم تو آپ ہی کی بیعت کریں گے"۔ حضرت علیؓ نے کہا۔ "تو پھر یہ مسجد میں ہوگی۔ میری بیعت خفیہ طریقے سے یا مسلمانوں کی رضامندی کے بغیر نہیں ہو سکتی"۔ سالم بن ابی جعد کہتے ہیں کہ عبداللہ بن عباس نے کہا کہ میں حضرت علیؓ کے مسجد میں جانے کو ناپسند کرتا تھا مبادا کوئی آفت نہ پڑ جائے۔ مگر علیؓ نے مسجد کے سوا کچھ تسلیم نہ کیا۔ جب وہ داخل ہوئے تو مہاجر اور انصار بھی داخل ہوئے۔ سو انھوں نے بیعت کی۔ پھر عام لوگوں نے بیعت کی۔

۷۔ عن عبد اللہ بن الحسن قال لما قتل عثمان رضی اللہ عنہ بایعت الانصار علیًا الا نُفَيرًا يسيرا، منهم حسان بن ثابت، وكعب بن مالك ومسلمه بن مخلّد، وابو سعيد الخدری، ومحمد بن مسلمة والنعمان بن بشير وزيد بن ثابت، ورافع بن خديج، وفضاله بن عبيد، وكعب بن عجرة كانوا عثمانية۔

قال: وحدثنی من سمع الزهری يقول: هرب قوم من المدينة الى الشام فلم يبايعوا عليا، ولم يبايعه قدامة بن مظعون، و عبد الله بن سلام والمغيرة ابن شعبة وقال الاخرون: انما بايع طلحة والزبير كرهًا۔

وقال بعضهم لم يبايعه الزبير۔ (۴۳۰)

عبداللہ بن حسن کہتے ہیں کہ جب حضرت عثمانؓ شہید ہو گئے تو انصار نے حضرت علیؓ کے ہاتھ پر بیعت کی سوائے چند اشخاص کے۔ حسان بن ثابت، کعب بن مالک، مسلمہ بن مخلد، ابو سعید خدری، محمد بن مسلمہ، نعمان بن بشیر، زید بن ثابت

رافع بن خدیج ، فضالہ بن عبید، کعب بن عجرہ انہی میں سے تھے اور یہ سب حضرت عثمانؓ کے حامی تھے۔

راوی کہتا ہے۔ مجھ سے اس شخص نے بیان کیا جس نے زہری سے سنا کہ ایک قوم مدینہ سے شام کی طرف بھاگ گئی اور حضرت علیؓ کی بیعت نہ کی اور قدامہ بن مظعون عبداللہ بن سلام، مغیرہ بن شعبہ نے بھی بیعت نہ کی۔ بعض کہتے ہیں کہ حضرت طلحہؓ اور زبیر نے بھی جبری بیعت کی تھی۔

اور بعض کہتے ہیں کہ حضرت زبیرؓ نے بیعت نہیں کی تھی۔

حضرت علیؓ کی بیعت کا قصہ تاریخ کی دوسری مشہور کتب میں بھی مذکور ہے۔ اب ہم اس واقعہ کو تسلسل کے ساتھ بیان کریں گے اور جہاں ضرورت ہوئی تو دوسری کتب کا صرف اردو ترجمہ (بغیر متن) پیش کیا جائے گا۔ یا تائید کے طور پر ان کا حوالہ درج کر دیا جائے گا۔

شہادت عثمانؓ کے وقت باغی اور شورش پسند عنصر مدینہ پر چھایا ہوا تھا۔ انھوں نے شہر کی ناکہ بندی کی ہوئی تھی۔ بہت سے صحابہ تو حج پر تشریف لے جا چکے تھے باقی دل شکستہ اور سہمے ہوئے تھے۔ پورے شہر کا نظم ونسق باغیوں میں سے ہی ایک شخص غافقی بن حرب کے ہاتھ میں تھا۔ یہی شخص ۵ دن تک امامت کے فرائض بھی انجام دیتا رہا۔ شرپسندوں کا یہ گروہ حضرت عثمانؓ کو شہید کر دینے تک تو متفق تھا لیکن آئندہ خلیفہ بنانے میں ان میں آپس میں اختلاف تھا۔ مصری حضرت علیؓ کو خلیفہ بنانے پر مصر تھے، کوفی حضرت زبیرؓ اور بصری حضرت طلحہؓ کو۔ لیکن ان تینوں حضرات نے انکار کر دیا۔ پھر یہ لوگ حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کے پاس گئے اور کہا کہ آپ اہل شوریٰ سے ہیں زمام خلافت آپ سنبھال لیجئے۔ پھر حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے پاس جاکر یہی کچھ کہا۔ لیکن ان دونوں حضرات نے بھی صاف انکار کر دیا۔ (البدایہ ج ۷، ص ۲۲۶)

اس صورتِ حال سے ان شورشیوں کو یہ خطرہ پیدا ہو گیا کہ اگر ہم اس معاملہ کو یونہی چھوڑ کر واپس چلے گئے تو ہماری خیر نہیں[1]۔ یہ سوچ کر حضرت علیؓ کے پاس آئے اور اصرار کیا اور اس گروہ کے سرخیل اشتر نخعی نے حضرت علیؓ کا ہاتھ پکڑ کر بیعت کر لی۔ اس کے بعد دیگر افراد نے بھی بیعت کی۔ (البدایہ ج ۷، ص ۲۲۶)

---

[1] خود عبداللہ بن سبا مصر سے بھیس بدل کر مدینہ آیا اور اپنے چیلوں کو تاکید کی کہ خلیفہ کے تقرر کے بغیر اپنے علاقوں کو ہرگز واپس نہ جائیں۔

طبری کی روایت کے مطابق جب حضرت علیؓ سے زمام خلافت سنبھالنے کو کہا گیا تو آپ نے فرمایا:
"میری بیعت خفیہ طریقے سے نہیں ہوسکتی۔ یہ مسلمانوں کی مرضی سے ہونی چاہیئے"۔
(طبری جلد ۴۔ ص۴۲۷)

اور ابنِ قتیبہ کی روایت کے مطابق آپ نے اس کو یوں جواب دیا :۔
"یہ اہلِ شوریٰ اور اہلِ بدر کا کام ہے جسے وہ منتخب کریں۔ وہی خلیفہ ہوگا پس ہم جمع ہوں گے اور اس معاملہ پر غور کریں گے"۔ (ابن قتیبہ۔الامامۃ والسیاستہ ج ا ص۴۱)

لیکن ظاہر ہے کہ حضرت علیؓ کی خواہش کے مطابق اہلِ شوریٰ اور اہلِ بدر کے جمع ہونے کا موقع میسر نہ آسکا۔ اور اس کے بغیر ہی آپ خلیفہ چُن لیے گئے۔ جیسا کہ دوسری روایات سے معلوم ہوتا ہے۔

حضرت علیؓ سے بیعت کرنے کے بعد اشتر نخعی اور اس کے ساتھی حضرت طلحہؓ کے پاس گئے اور کہا بیعت کیجئے۔ انھوں نے پُوچھا: کس کی؟ کہنے لگے "علیؓ کی"۔ طلحہؓ نے پُوچھا کیا شوریٰ نے جمع ہوکر اس کا فیصلہ کیا ہے"؟ انھوں نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا اور کہنے لگے "بس چل کر بیعت کیجئے"۔ انھوں نے پھر انکار کیا لیکن وہ بجبر ان کو وہاں سے لے گئے۔ (الامامۃ والسیاستہ ج ا ص۴۲) اس واقعہ کی تائید میں طبری کی روایت بھی پیش کی جاچکی ہے۔

جیسا کہ حضرت علیؓ کے قول سے ظاہر ہے کہ انتخاب امیر اہلِ شوریٰ یا اہلِ بدر کا کام ہے جنھیں بالفاظِ دیگر اہلِ حلّ وعقد یا اعیانِ ملت بھی کہتے ہیں۔ چونکہ حضرت علیؓ کا انتخاب اہلِ شوریٰ کے بجائے عامیانہ دباؤ کے تحت ہوا تھا لہٰذا آپ کی خلافت کی آئینی حیثیت آئندہ بھی زیرِ بحث رہی۔ کئی مقامات پر بہت سے لوگ بیعتِ علیؓ سے کنارہ کش رہے۔ شام تو کلیتہً حضرت علیؓ کی بیعت سے کنارہ کش رہا۔ مدینے سے بھی بہت سے افراد بیعتِ علیؓ سے بچنے کے لیے شام چلے گئے تھے۔ (طبری ج ۴ ص۴۳۳۔ البدایہ ج ۷ ص۲۲۶، الکامل ج ۴ ص۱۹۲)

مصر، کوفہ اور بصرہ میں بھی ایک گروہ نے بیعتِ علی سے توقف کیا (ایضاً)

خود مدینے میں بیسیوں لوگوں نے بیعت نہیں کی جن میں جلیل القدر اصحابِ رسولؐ بھی تھے۔ علامہ ابنِ خلدون نے اپنے شہرۂ آفاق مقدمہ میں انتخابِ علیؓ کی تفصیل یوں لکھی ہے :۔

(مقدمہ ابنِ خلدون۔ فصل ولایت عہد ص ۲۷۸ - ۲۷۹ طبع بیروت ۱۹۶۱ء)

"شہادتِ عثمان کے وقت لوگ مختلف شہروں میں پھیلے ہوئے تھے۔ سب حضرت علیؓ کی بیعت کے موقعہ پر حاضر نہ ہوسکے اور جو حاضر تھے ان میں سے بھی سب نے بیعت نہیں کی۔ بعض نے کی اور بعض نے اس وقت تک توقف کی روش اختیار کی جب تک لوگ ایک امام پر جمع نہ ہوجائیں (گویا ان کی نظر میں خلافتِ علی خلفائے ثلاثہ کی طرح اجماعی نہ تھی) ان میں حضرت سعدؓ سعید، ابنِ عمرؓ، اسامہ بن زید، مغیرہ بن شعبہ، عبداللہ بن سلام، قدامہ بن مظعون، ابوسعید خدری، کعب بن مالک، نعمان بن بشیر، حسان بن ثابت، زید بن ثابت، مسلمہ بن مخلدؓ، فضالہ بن عبید اور ان جیسے دیگر اکابر صحابہ ہیں جنھوں نے بیعت نہیں کی تھی۔

(البدایہ والنہایہ ج ۵ ص ۲۲۶)

جو لوگ مدینے سے باہر دوسرے شہروں میں تھے انھوں نے بھی بیعت کرنے سے اس وقت تک اعراض کیا جب تک خونِ عثمان کا مطالبہ پورا نہ ہوجائے اور جب تک مجلسِ شوریٰ خود کسی شخص کو خلیفہ منتخب نہ کرے۔ حضرت علیؓ کے متعلق یہ لوگ اگرچہ یہ خیال تو نہیں رکھتے تھے کہ وہ بھی خونِ عثمانؓ میں شریک ہیں تاہم قاتلینِ عثمان کے معاملہ میں ان کے سکوت کو انھوں نے ان کی کمزوری اور سستی پر محمول کیا۔ حضرت معاویہؓ بھی حضرت علیؓ کو جو کچھ کہتے تھے اس کی بنیاد بھی حضرت علیؓ کا یہی سکوت تھا۔

خلافت علیؓ جس طرح بھی منعقد ہوئی ہوگئی لیکن منعقد ہوجانے کے بعد بھی اتفاق کی صورت پیدا نہ ہوسکی۔ اختلاف موجود رہا۔ حضرت علیؓ کا خیال تھا کہ ان کی بیعت منعقد ہوگئی ہے اور مدینہ جو شہر رسولؐ اور مسکنِ صحابہؓ ہے۔ وہاں کے باشندے ان پر مجتمع ہوچکے ہیں۔ اس لیے بیعت سے پیچھے رہنے والوں کے لیے اب بیعت ضروری ہوگئی ہے لیکن اس کے ساتھ ہی مطالبہ قصاص کے متعلق ان کا کہنا تھا کہ اسے اس وقت تک ملتوی رکھا جائے جب تک ایک کلمہ (خلافت) پر لوگوں کا اتفاق واجتماع نہ ہوجائے کیونکہ اس کے بغیر وہ طاقت ممکن نہیں جو اس کام کے لیے ضروری ہے۔ بالفاظِ دیگر ان کی اپنی نظر میں بھی انکی بیعت اجماعی مشکوک تھی۔

دوسرے حضرات کا یہ خیال تھا کہ جو صحابہ اہلِ حل وعقد ہیں وہ بیعتِ علیؓ کے وقت مدینہ میں نہ تھے یا ان کی تعداد قلیل تھی، وہ اس وقت دیگر شہروں میں متفرق تھے۔ ان کے بغیر یا ان کی قلیل تعداد کے ساتھ بیعت منعقد نہیں ہوسکتی، اس لیے بیعت ہی سرے سے

منعقد نہیں ہوئی۔ مسلمان لخہٴ انتشار میں ہیں۔اس بناء پر ان کا کہنا یہ تھا کہ پہلے خونِ عثمان کا مطالبہ پورا کیا جائے۔ اجماع علی الامام کا معاملہ دوسرے نمبر پر ہے۔اس نقطۂ نظر کے لوگوں میں حضرت معاویہؓ عمرو بن العاصؓ، ام المومنین حضرت عائشہؓ، حضرت زبیرؓ، ان کے صاحبزادے حضرت عبداللہؓ اور حضرت طلحہؓ اور ان کے صاحبزادے محمدؓ، حضرت سعدؓ، حضرت سعیدؓ، نعمان بن بشیرؓ معاویہ بن خدیج اور ان کے علاوہ ان کے ہم رائے وہ اکابر صحابہ تھے جو مدینے میں بیعتِ علیؓ سے پیچھے رہے تھے۔

حضرت علیؓ کی خلافت کی اس حیثیت کا احساس خود ان حضرات کو بھی تھا جو حضرت علیؓ کے قریب ترین رشتہ دار اور مصاحب تھے۔ جیسے حضرت عبداللہ بن عباس، انھوں نے حضرت علیؓ کو جب یہ مشورہ دیا کہ فی الحال حضرت عثمانؓ کے مقرر کردہ عاملین کو معزول نہ کیا جائے۔اس وقت انھوں نے ایک وجہ یہ بھی بیان کی کہ" اگر ان کو اس وقت معزول کر دیا گیا تو ممکن ہے کہ وہ آپ کی خلافت ہی کو چیلنج کر دیں اور کہیں کہ یہ خلافت ہی شوریٰ کے بغیر حاصل ہوئی ہے۔" (طبری ج ۴ ص۴۳۹) (الکامل ج ۳ ص۱۹۷)

جنگِ صفین کے دوران جب وفد کے ذریعہ صلح کی بات چیت شروع ہوئی تو حضرت معاویہؓ کے وفد نے اس وقت بھی اسی بات کو حضرت علیؓ کے سامنے دُہرایا تھا کہ آپ امرِ خلافت کو چھوڑ کر اسے شوریٰ کے حوالے کر دیں تاکہ لوگ اپنی مرضی سے جسے چاہیں خلیفہ منتخب کریں۔ (طبری جلد ۵ ص۷ ، الکامل جلد ۳ ص۲۹۱)

ماحصل:۔ حضرت علیؓ کو نہ تو اہلِ شوریٰ نے منتخب کیا۔ نہ مسلمانوں کی آزادانہ رائے کا اس سے کوئی تعلق تھا۔ یہ انتخاب ہنگامی حالات میں ہوا اور منتخب کرنے والا وہی باغی اور شورش پسند گروہ تھا جس کا دامن خونِ عثمان کے چھینٹوں سے داغدار تھا۔ تاہم یہ خلافت منعقد ہوگئی اور اسی طرح برحق ہے جیسے پہلے تین خلفاء کی برحق ہے۔ اگر جملہ اہلِ شوریٰ کو آزادانہ ماحول میسر آتا تو بھی حضرت علیؓ کے انتخاب کا غالب امکان تھا۔ جیساکہ حضرت عثمانؓ کی خلافت کے تقرر کے واقعہ سے واضح ہوتا ہے۔

انتخاب حضرت حسنؓ

۱۔ حضرت علیؓ کی وفات کے قریب آپ سے لوگوں نے کہا استخلف (یعنی اپنا ولی عہد مقرر کر جائیے) آپ نے جواب میں فرمایا: "میں مسلمانوں کو اسی حالت میں چھوڑوں گا جس میں رسول اللہ نے چھوڑا تھا۔" (البدایہ ج ۸ ص ۱۳-۱۴)

۲۔ ثم قال ان مت فاقتلوہ وان عشت فانا اعلم کیف اصنع بہ"۔
فقال جندب بن عبد اللہ" یا امیر المومنین ! ان مت نبایع الحسن؟
فقال" لا امرکم ولا انھاکم، انتم ابصر"۔ (البدایہ والنہایہ ج ۷، ص ۳۲۷)

پھر حضرت علیؓ نے فرمایا، اگر میں مر گیا تو اس (قاتل کو قتل کر دینا) اور اگر میں زندہ رہا تو میں جانوں میرا کام"۔ حضرت جندب بن عبد اللہ نے کہا" اے امیر المومنین! اگر آپ فوت ہو جائیں تو ہم حضرت حسنؓ کے ہاتھ پر بیعت کر لیں؟ فرمایا: "میں نہ تمہیں اس کا حکم دیتا ہوں نہ منع کرتا ہوں۔ تم خود بہتر سمجھتے ہو"۔

۳۔ بُویِعَ للحسن بن علی علیہ السلام بالخلافۃ وقیل ان اوّل من بایعہ قیس بن سعد قال لہ اُبسط یدک ابایعک علی کتاب اللہ عزوجل وسنۃ نبیّہٖ۔ (طبری ج ۵ ص ۱۵۸)

حضرت حسنؓ بن علیؓ کی خلافت پر بیعت ہوئی اور کہتے ہیں کہ پہلا شخص جس نے بیعت کی وہ قیس بن سعد تھا۔ اس نے کہا اپنا ہاتھ بڑھائیے۔ میں آپ کے ہاتھ پر اللہ تعالیٰ کی کتاب اور اس کے نبی کی سنت پر بیعت کرتا ہوں"۔

ضمنی مباحث

ہم نے خلفائے راشدین کی خلافت کے انعقاد سے متعلق حتی الامکان صحیح روایات اولین ماخذوں سے پیش کر دی ہیں۔ ان سے مندرجہ ذیل نتائج سامنے آتے ہیں۔

۱۔ آیا خلافت ایک انتخابی منصب ہے؟

۱۔ استخلاف یا نامزدگی | ا۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ پہلے خود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکرؓ کو خلیفہ نامزد کرنے کا ارادہ کیا تھا۔ لیکن اس یقین کی وجہ سے یہ ارادہ ترک کر دیا کہ "مسلمان کسی دوسرے کا خلیفہ بننا گوارا نہیں کر سکتے اور نہ ہی اللہ تعالیٰ کو یہ منظور ہے" تو پھر خلیفہ نامزد کر دینے سے نامزد نہ کرنا ہی بہتر ہے۔ آپ کا ترکِ ارادہ جملہ مسلمانوں کی دلجوئی اور ان پر آپ کی شفقت کا مظہر تھا۔ یعنی اگر کچھ لوگ آس لگائے بیٹھے ہوں تو ان کی دل شکنی نہ ہو۔

ب۔ حضرت ابوبکرؓ نے حضرت عمرؓ کو خلیفہ نامزد کر دیا۔ نامزدگی کے وقت ان کے سامنے مندرجہ ذیل باتیں تھیں۔

۱۔ ان کے نزدیک اُمّت میں حضرت عمرؓ سے زیادہ خلافت کے لیے کوئی اہل تر نہ تھا۔

۲۔ انھوں نے اپنے کسی قریبی رشتہ دار کو نامزد نہیں کیا۔

۳۔ نامزدگی کے سلسلہ میں خدا کے سامنے جوابدہی کا تصور غالب تھا۔

ج۔ حضرت عمرؓ کو جب یہ کہا گیا کہ خلیفہ نامزد کر جائیے تو آپ نے یہ نہیں فرمایا کہ ایسا کیوں کہتے ہو۔ خلافت تو محض ایک انتخابی منصب ہے۔ بلکہ یوں فرمایا (اور اس وقت آپ کے ذہن میں مندرجہ ذیل باتیں تھیں) :۔

۱۔ "اگر میں خلیفہ نامزد کر جاؤں تو بھی ٹھیک ہے کہ یہ سنت اپنے سے بہتر آدمی

(حضرت ابوبکرؓ) کی سنت ہے اور اگر نہ کروں تو بھی ٹھیک ہے کہ یہ مجھ سے بہتر آدمی (خود حضورِ اکرم) کی سنت ہے"۔

۲۔ آپ نامزدگی کو اس صورت میں ترجیح دے سکتے تھے جب کہ کوئی اہلِ تر آدمی ان کے پاس موجود ہوتا۔ جیساکہ آپ نے حضرت عبیدہ بن الجراحؓ اور سالمؓ کے نام بھی لیے۔ کہ اگر ان میں سے کوئی بھی زندہ ہوتا تو اسے ہی نامزد کرنے کو ترجیح دیتے۔

۳۔ اپنے بیٹے حضرت عبداللہ کو آپ نے اس لیے نامزد نہیں کیا تھا کہ وہ خلافت کی ذمّہ داریوں سے عہدہ برآ ہونا ایک کٹھن کام سمجھتے تھے اور خدا کے سامنے جوابدہی کے تصوّر سے ڈر کر خلافت کو اپنے تک ہی محدود رکھنا چاہتے تھے۔

۴۔ اب ثانوی شکل یہ رہ گئی تھی کہ انھوں نے خلافت کے لیے ۶ آدمیوں کو نامزد کر دیا۔ کسی ایک کے نامزد نہ کرنے کی وجہ یہ تھی کہ آپ کی نظر میں ان چھ آدمیوں میں سے ہر ایک میں کچھ نہ کچھ خامی تھی[1] لہٰذا انتخاب کی ذمّہ داری انہی پر ڈال دی۔ اگر انھیں کسی ایک شخص پر بھی اطمینان ہو جاتا تو وہ یقیناً نامزدگی کو انتخاب پر ترجیح دیتے۔

د۔ حضرت عثمانؓ سے بھی ایک مرتبہ لوگوں نے خلیفہ نامزد کرنے کو کہا تھا۔ یہ سوال جواب بھی ملاحظہ فرما لیجیے۔

اخبرنی مروان بن الحکم قال : اصاب عثمان ابن عفان رُعافٌ شدید سنۃ الرُّعاف حتّٰی حبسہ عن الحج واوصٰی فدخل علیہ رجل من قریشٍ قال : استخلف قال" وقالوہ"؟ قال نعم۔ قال "ومن"؟ فسکت فدخل علیہ رجلٌ اخرُ احسبہ الحارث فقال استخلف فقال عثمان" وقالوا"؟ قال نعم" :قال ومن ھو؟ فسکت قال : فلعلھم قالوا الزبیر؟" قال نعم" :قال" اما والذی نفسی بیدہٖ انہ لخیرھم ما علمت وان کان لاحبّھم الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (بخاری۔کتاب المناقب۔باب مناقب زبیر بن العوامؓ)

مروان بن حکم نے مجھے خبر دی کہ حضرت عثمانؓ کو ایک سال نکسیر پھوٹنے کی ایسی بیماری لاحق ہوئی کہ وہ حج کو بھی نہ جا سکے اور وصیت کرنے لگے۔ قریش کے کسی آدمی

---

[1] الفاروق۔ شبلی نعمانی ص۱۷۸ مطبوعہ سنگ میل پبلی کیشنز لاہور ۱۹۷۶ء۔

نے انھیں کہا" کوئی خلیفہ بنا جائیے"۔ کہنے لگے۔" کیا لوگ ایسی باتیں کرتے ہیں "۔
وہ کہنے لگا۔ ہاں۔ آپ نے پُوچھا" کِس کے متعلق کہتے ہیں"؟ تو وہ چپ ہو رہا۔
پھر ایک اور آدمی آیا۔ میرا خیال ہے وہ حارث تھا۔ اس نے بھی یہی کہا کہ کسی کو
خلیفہ بنا دیجئے۔ حضرت عثمانؓ نے پُوچھا۔ کیا لوگ ایسی باتیں کرتے ہیں؟ کہنے لگا
"ہاں"۔ آپ نے پُوچھا "کس کے متعلق"؟ تو وہ بھی چپ رہا۔ پھر آپ نے فرمایا "شاید
وہ زبیرؓ بن عوام کو خلیفہ بنانا چاہتے ہیں؟ اس نے کہا۔ "ہاں"، آپ نے فرمایا" خدا
کی قسم! جس کے ہاتھ میں میری جان ہے۔ جتنے لوگوں کو میں جانتا ہوں زبیرؓ بن
عوام ان سب سے بہتر ہیں اور سب سے زیادہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم
سے محبت رکھتے تھے"۔

اس کے ساتھ ہی اگلی حدیث میں یہ الفاظ بھی ہیں۔ حضرت عثمانؓ نے تین بار یہ بات
دہرائی کہ" تم خود جانتے ہو کہ زبیر بن عوام تم سب میں سے بہتر ہیں"۔

بخاری شریف کے مترجم علامہ وحید الزمان نے اس حدیث پر یہ نوٹ بھی دیا ہے۔
کہتے ہیں کہ حضرت عثمانؓ نے اپنے بعد خلافت عبدالرحمٰنؓ بن عوف کے لیے لکھ کر اپنے
منشی کے پاس وہ کاغذ رکھوا دیا تھا۔ مگر حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف ان کی زندگی میں ہی
۳۲ھ میں انتقال کر گئے۔

اس حدیث سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ اگر کوئی اہل تر آدمی موجود ہو تو نامزدگی کو نہ تو
خلفائے راشدین ہی ناجائز سمجھتے تھے اور نہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین۔

ھ۔ حضرت علیؓ کو آخری وقت میں حضرت حسنؓ کو خلیفہ نامزد کرنے کو کہا گیا تو آپ نے نہ تو یہ
فرمایا کہ استخلاف ناپسندیدہ یا ناجائز کام ہے اور نہ ہی یہ فرمایا کہ باپ کے بعد بیٹا کیونکر
نامزد کیا جاسکتا ہے۔ جب حضرت جندب بن عبداللہؓ صحابی رسولؐ نے آپ سے فرمایا
کہ ہم حضرت حسن کے ہاتھ بیعت کر لیں۔ تو آپ نے فقط یہ فرمایا:۔

- "نہ میں تمھیں اس کا حکم دیتا ہوں نہ اس سے منع کرتا ہوں۔ تم لوگ اچھی طرح
دیکھ سکتے ہو"۔

ان تصریحات سے یہ واضح ہے کہ خلافت محض انتخابی منصب نہیں بلکہ خلیفہ وقت خدا
کے سامنے جوابدہی کے تصوّر کو سامنے رکھ کر اگر خلیفہ نامزد کر جائے تو یہ صورت صرف جائز

ہی نہیں بلکہ بہتر ہے۔ جیساکہ حضرت عمرؓ کے ارشادات سے واضح ہوتا ہے اور دوسرا نتیجہ یہ بھی نکلتا ہے کہ باپ کے بعد بیٹا بھی خلیفہ بن سکتا ہے۔ جیساکہ حضرت حسنؓ کی خلافت کو متفقہ طور پر خلافتِ راشدہ میں شمار کیا جاتا ہے اور تیسرا یہ کہ باپ اگر خود بیٹے کو نامزد کردے بشرطیکہ وہ اس کا اہل ہو تو یہ بھی کوئی گناہ کی بات نہیں۔ بلکہ جائز ہے جیساکہ حضرت علیؓ کے ارشاد سے واضح ہوتا ہے۔

خلافت و ملوکیت

یہاں آکر خلافت و ملوکیت کی ایک سرحد آپس میں مل جاتی ہے۔ ہم یہ پہلے بتلا چکے ہیں کہ خلافت، ملوکیت اور موجودہ جمہوریت کے درمیان اعتدال کی راہ ہے۔ اسے نہ ملوکیت سے بَیر ہے نہ موجودہ جمہوریت سے کوئی کد حضرت داؤد علیہ السلام بیک وقت خلیفہ بھی تھے اور بادشاہ بھی۔ داؤد علیہ السلام کے متعلق درج ذیل آیت میں بعض علماء نے خلیفہ کا ترجمہ "بادشاہ" سے بھی کیا ہے : مثلاً :-

يَا دَاوُدُ إِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِيفَةً فِي الْأَرْضِ (۳۸/۲۶)

"اے داؤد ہم نے تجھے زمین میں بادشاہ بنایا ہے۔ (احمد علیؒ)

" " " " " " " " (فتح محمد جالندھری)

اللہ تعالیٰ نے خود بھی داؤد علیہ السلام کو خلیفہ بھی کہا ہے اور بادشاہ بھی۔ بادشاہ کے لیے مَلِک اور بادشاہت کے لیے مُلک کا لفظ استعمال ہوا ہے۔

وَقَتَلَ دَاوُدُ جَالُوتَ وَاٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ وَالْحِكْمَةَ (۲/۲۵۱)

اور داؤد نے جالوت کو مار ڈالا اور اللہ نے سلطنت اور حکمت داؤد کو دی۔ (احمد علیؒ)

اور داؤد نے جالوت کو قتل کر ڈالا اور خدا نے ان کو بادشاہی اور دانائی بخشی۔ (فتح محمدؒ)

گویا داؤد علیہ السلام خلیفہ بھی اور بادشاہ بھی تھے۔ جب نظام حکمرانی کا پہلو اجاگر کرنا مقصود تھا کہ وہ حق کے ساتھ فیصلے کریں اور خواہشات کی پیروی نہ کریں تو ان کے لیے خلیفہ کا لفظ استعمال کیا گیا اور جب ان کے اقتدار، سلطنت، بادشاہی یا حکومت کی طرف اشارہ مقصود تھا تو مَلِک یا مُلک کا لفظ استعمال کیا گیا جیساکہ دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ نے داؤد علیہ السلام کے متعلق فرمایا :-

وَشَدَدْنَا مُلْكَهٗ وَاٰتَيْنٰهُ الْحِكْمَةَ وَفَصْلَ الْخِطَابِ (۳۸/۲۰)

اور ہم نے داؤد کی سلطنت کو مستحکم بنایا اور اسے حکمت اور قوتِ فیصلہ بھی بخشی۔

معلوم ہوا کہ ملوکیت فی نفسہٖ مذموم نہیں جیسا کہ آج کل مغربی جمہوریت سے متاثر لوگ محسوس کرتے ہیں۔ داؤد علیہ السلام کے بیٹے سلیمان علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے خود بادشاہی کے لیے یوں دُعا مانگی۔

قَالَ رَبِّ اغْفِرْ لِيْ وَهَبْ لِيْ مُلْكًا لَّا يَنْۢبَغِيْ لِاَحَدٍ مِّنْۢ بَعْدِيْ (۳۸/۳۵)

اے پروردگار مجھے مغفرت کر اور مجھ کو ایسی بادشاہی عطا کر جو میرے بعد کسی کو شایاں نہ ہو۔ (فتح محمد جالندھری)

اور سلیمان علیہ السلام کی یہ دُعا اللہ تعالیٰ نے قبول بھی فرمائی۔ اسی طرح یوسف علیہ السلام کو خدا نے بادشاہت عنایت فرمائی۔ (۱۲/۱۰۱)

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد بنی اسرائیل نے اپنے نبی سے عرض کی کہ کوئی بادشاہ مقرر کر دیجئے تو نبی نے فرمایا:۔

وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ اِنَّ اللّٰهَ قَدْ بَعَثَ لَكُمْ طَالُوْتَ مَلِكًا۔ (۲/۲۴۷)

اور پیغمبر نے ان سے کہا کہ خدا نے تم پر طالوت کو بادشاہ مقرر فرمایا ہے۔

اس نبی نے بنواسرائیل سے یا خدا نے نبی سے یہ نہیں فرمایا کہ ملوکیت تو بُری شے ہے اس کا سوال کیوں کرتے ہو؟ اور اللہ تعالیٰ نے خود اپنی قدرت اور حاکیت ان الفاظ میں بیان فرمائی کہ جسے چاہے بادشاہی عطا کرے اور جس سے چاہے چھین لے۔

قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ (۳/۲۶)

کہو ! اے اللہ ! بادشاہی کے مالک ! تو جسے چاہے بادشاہی بخشے اور جس سے چاہے بادشاہی چھین لے۔

پھر اللہ تعالیٰ جس طرح اپنے فرمانبردار بندوں پر خلافت کی نعمت کا ذکر کرتے ہیں۔ (جیسا کہ پہلے گزر چکا) اسی طرح بادشاہ بنانے کی نعمت کا بھی ذکر فرماتے ہیں:۔

۱۔ فَقَدْ اٰتَيْنَآ اٰلَ اِبْرٰهِيْمَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَاٰتَيْنٰهُمْ مُّلْكًا عَظِيْمًا (۴/۵۴)

سو ہم نے خاندان ابراہیم کو کتاب اور دانائی عنایت فرمائی تھی اور سلطنتِ عظیم بھی بخشی تھی۔

۲۔ وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ جَعَلَ فِيْكُمْ اَنْۢبِيَآءَ وَجَعَلَكُمْ مُّلُوْكًا۔ (۵/۲۰)

اور جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا کہ بھائیو! تم پر خدا نے جو احسان کیے ہیں ان

کو یاد کرو کہ اس نے تم میں سے پیغمبر پیدا کیے اور تمھیں بادشاہ بنایا۔
ہاں اگر بادشاہ اللہ کی فرمانبرداری کے بجائے سرکشی کی راہ اختیار کرے تو ملوکیت ایک مذموم چیز بن جاتی ہے۔ فرعون، نمرود، شداد، ہامان اسی قسم کے بادشاہ تھے۔ ایسی ہی مطلق العنان اور استبدادی حکومت کو قرآن کریم نے مذموم قرار دیا ہے۔ اور حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے "ملک عضوض" کے نام سے پکارا ہے۔ (خلافت و ملوکیت کے فرق کی تفصیل کسی دوسرے مقام پر ہے)۔

حضرت عمرؓ نامزد ہوئے یا منتخب؟

خلافتِ راشدہ میں استخلاف کی واضح مثال حضرت عمرؓ کی نامزدگی ہے۔ جنھیں حضرت ابوبکرؓ نے اپنی وفات سے قبل نامزد کیا تھا۔ لیکن بعض دوستوں نے اسے بھی انتخابی خلافت ہی میں شمار کیا ہے۔ کیونکہ استخلاف یا نامزدگی کا یہ تصور موجودہ جمہوریت کے تصورِ انتخاب سے متصادم ہے۔ یہ حضرات اسے انتخاب ثابت کرنے کے لیے یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ حضرت ابوبکرؓ نے نامزدگی کا اعلان کرنے سے پیشتر اکابر صحابہؓ سے مشورہ کر لیا تھا۔ لہٰذا یہ نامزدگی بھی فی الحقیقت عوام کا انتخاب ہی تھا۔

اس معاملہ میں بھی حقائق کو توڑ موڑ کر پیش کیا جاتا ہے۔ اصل واقعہ بہ روایت صحیحہ ہم پیش کر چکے ہیں۔ حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ کے استخلاف یا نامزدگی کا پختہ عزم رکھتے تھے جیساکہ پہلی روایت کے ابتداء ہی میں لفظ عقد سے واضح ہو جاتا ہے۔ آپ نے حضرت عبدالرحمٰن بن عوف کو بُلا کر ان سے تذکرہ کیا۔ تو انھوں نے ان کی سختی کا شکوہ کیا۔ تو آپ نے حضرت عبدالرحمٰن کی رائے قبول نہیں کی بلکہ ان کی رائے کو ہموار کیا۔ حضرت عثمانؓ سے بلا کر تذکرہ کیا تو انھوں نے اس نامزدگی کی داد دی۔

بعد ازاں جب اس بات کا تذکرہ عام ہونے لگا تو حضرت طلحہؓ نے حضرت عمرؓ کی تیزیٔ طبیعت کا شکوہ کیا تو آپ نے یہ کہہ کر ان کی رائے کو بھی ہموار کر لیا کہ اس نامزدگی کے لیے خدا کے حضور میں جواب دِہ میں ہوں۔ میں کہہ دوں گا کہ "مجھے تیری اُمت میں عمرؓ سے بہتر کو آدمی نہ ملا"۔
مشورہ وہ ہوتا ہے جس میں دوسروں سے رائے لے کر اس پر غور کیا جائے۔ لیکن یہاں دوسروں کی رائے کو ہموار کر کے مطمئن کیا جا رہا ہے۔ ان حقائق کے باوجود بھی اگر ہمارے یہ دوست اس واقعہ کو انتخابی خلافت کے زمرہ میں شمار کریں تو ہم اس کے سوا اور کیا کہہ سکتے ہیں:۔

رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا (۳/۸)
اے پروردگار! جب تو نے ہمیں ہدایت بخشی ہے تو اس کے بعد ہمارے دلوں میں ٹیڑھ نہ پیدا کرنا۔

۲۔ جب حضرت ابوبکرؓ نے نامزدگی کا پروانہ خود حضرت عثمانؓ سے لکھوا دیا۔ لوگوں کے سامنے پڑھا گیا۔ پھر بعد میں بیعت بھی ہوئی تو پھر نامزدگی اور کس چیز کو کہتے ہیں؟

۳۔ جب حضرت عمرؓ کو خود اعتراف ہے[۱] کہ میری نامزدگی ہوئی تھی اور یہ حضرت ابوبکرؓ نے کی تھی۔ تو پھر ان جمہوریت نوازوں کے اس خیال کی کیا وقعت باقی رہ جاتی ہے۔

انتخابی خلافت کا تصوّر

نظامِ خلافت میں انتخاب کا وہ تصور سرے سے ناپید ہے جو مغربی طرزِ انتخاب کا طرّہ امتیاز ہے جس میں فیصلہ کثرت رائے کی بنیاد پر ہوتا ہے جبکہ حضرت ابوبکرؓ کو بقول حضرت عمرؓ صرف ایک شخص (حضرت عمرؓ) نے انتخاب کیا۔ حضرت حسنؓ کو صرف ایک شخص قیس بن سعد نے انتخاب کیا۔ حضرت علیؓ کو اہلِ بدر اور شوریٰ میں سے (جو کہ بقول حضرت علیؓ انتخاب کے جائز حق دار تھے) ایک قلیل تعداد نے انتخاب کیا تھا۔

البتہ حضرت عثمانؓ کے معاملہ میں حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ کا استصوابِ عام انتخابی خلافت کے لیے ایک واضح ثبوت ہے۔ لیکن ہمیں افسوس ہے کہ یہ ثبوت بھی اس معیار پر پورا نہیں اُترتا۔ جس معیار پر ہمارے یہ دوست اُتارنا چاہتے ہیں۔ پوری مملکتِ اسلامیہ اس وقت پچیس لاکھ ۲۰ ہزار مربع میل میں پھیلی ہوئی تھی جب کہ یہ انتخاب صرف مدینہ میں ہوا اور وہ بھی چیدہ چیدہ لوگوں سے۔

حضرت عثمانؓ کے انتخاب سے تین باتیں سامنے آتی ہیں:۔

۱۔ انتخاب کا فیصلہ حضرت عبدالرحمان بن عوفؓ نے کیا اور اس اختیار کی بناء پر کیا جو انھیں حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ نے دیا تھا۔ کثرتِ رائے اس کی حقیقی بنیاد نہ تھی۔

۲۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے جیسا کہ حدیثِ مندرجہ سے واضح ہے۔ اس اصول کی بناء پر حضرت عثمانؓ کو منتخب کیا تھا کہ وہ کتاب و سنت کے علاوہ پہلے دونوں خلفاء

---

[۱] فقد استخلف من هو خير منّي (بخاری۔ کتاب الاحکام۔ باب الاستخلاف)

کے نظائر کا بھی اتباع کریں گے۔ یہ بات حضرت علیؓ نے تسلیم نہ کی تھی۔ لہٰذا ان کو منتخب نہ کیا گیا گویا فیصلہ بہرحال اصُول کے تحت تھا۔ محض کثرت رائے کے تحت نہ تھا۔ البتہ کثرت رائے بھی اس دلیل کے ساتھ مل گئی تو فیصلہ کرنا مزید آسان ہو گیا۔

۳۔ حضرت عبدالرحمان بن عوفؓ نے صرف ان لوگوں سے ہی مشورہ کیا تھا جن کو وہ مشورہ کا اہل سمجھتے تھے۔ جیسا کہ روایات کے الفاظ سے صاف واضح ہے۔ خواہ وہ چرواہے تھے یا مدرسہ کے طالب علم، پردہ نشین عورتیں تھیں یا راہ چلتے مسافر۔ مشورے کا یہ تصور بھی موجودہ طرزِ انتخاب (حق بالغ رائے دہی) کو باطل قرار دیتا ہے۔

انتخابِ عام اگر حضرت ابوبکرؓ چاہتے تو پوری مملکت میں استصواب کروا سکتے تھے۔ ان کے پاس وقت تھا۔ اور اگر حضرت عمرؓ چاہتے تو وہ بھی کروا سکتے تھے کیونکہ وسائل رسل و رسائل کافی ترقی کر چکے تھے۔ مسلمانوں کی مردم شماری کی لسٹ تیار کرنے کا کام عہدِ نبوی میں ہی شروع ہو چکا تھا۔ (بخاری۔ کتاب الجہاد والسیر باب کتابۃ الامام الناس) اور حضرت عمرؓ کے عہد میں یہ کام ایک علیحدہ شعبہ کی حیثیت اختیار کر چکا تھا۔ لیکن اُن بزرگوں نے اسے کوئی اہمیت نہیں دی جو اس بات کا بیّن ثبوت ہے کہ اسلام میں خلیفہ کے انتخاب کا وہ تصور ہی سرے سے مفقود ہے جو مغربی طرزِ انتخاب کی جان ہے۔

ماحصل

۱۔ خلیفہ کو اگر شوریٰ منتخب کرے تو یہ سب سے بہتر صورت ہے۔ کیونکہ حضورِ اکرمؐ کا اُسوہ یہی ہے اور حضرت عمرؓ کا ارشاد ہے :-

لاخلافة الاعن مشورة (مصنف ابن ابی شیبہ ج ۳ ص ۱۳۹)
مشورہ کے بغیر خلافت نہیں [۱]

---

[۱] بعض علماء کا یہ خیال ہے کہ حضرت عمرؓ کے اس قول سے ان کی مراد خلافت کے کاروبار یا انتظامِ سلطنت میں مشورہ کرنا ہے یعنی "اصولِ حکومت مشورہ" ہے۔ خلیفہ کے تقرر پر مشورہ ضروری نہیں۔ اور یہ بات بہت قرینِ قیاس معلوم ہوتی ہے جیسا کہ عثمانؓ کے انتخاب کے عنوان میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے متعلقہ روایات سے ثابت ہوتا ہے کہ اگر ان کا کسی ایک شخص پر اطمینان ہو جاتا تو وہ یقیناً استخلاف کو انتخاب پر ترجیح دینے کو تیار تھے۔ تاہم ہمارا خیال یہی ہے کہ امر خلافت بھی اس سے خارج نہ کرنا چاہیئے۔ جیسا کہ حضرت عمرؓ کے طویل خطبہ سے بھی ظاہر ہوتا ہے اور حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کے قول سے بھی ثابت ہے۔

حضرت ابوموسیٰ اشعری بیان کرتے تھے :۔

الامرۃ ما ائتمر فیہا وان الملک ما غلب علیہ بالسیف (طبقات ج ۴ ص۱۱۳)

امارت وہ ہے جسے قائم کرنے میں مشورہ کیا گیا ہو اور بادشاہی وہ ہے جس پر تلوار کے زور سے قبضہ حاصل کیا گیا ہو۔

خود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم، حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ نے اپنے عمل سے اس منصب کو شوریٰ کے سپرد کیا۔ اگرچہ اول الذکر دونوں ہستیاں استخلاف کی طرف مائل تھیں۔

۲۔ شورائی انتخاب کے بعد نامزدگی یا استخلاف کا نمبر ہے جسے حضرت ابوبکرؓ نے عملاً اختیار کیا۔ حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ نے بھی اسے درست سمجھا۔

۳۔ ہنگامی صورتِ حال میں شوریٰ کے ایک ممبر کی بیعت سے خلافت منعقد ہو جاتی ہے۔ جیسے حضرت ابوبکرؓ اور حضرت حسنؓ کی خلافت منعقد ہوئی۔ اسی طرح ہنگامی صورت میں عوام الناس (شوریٰ کے بغیر) کی بیعت سے بھی خلافت منعقد ہو جاتی ہے جیسا کہ حضرت علیؓ کی خلافت منعقد ہوئی۔

باپ کے بعد بیٹے کی خلافت بھی جائز ہے بشرطیکہ وُہ اہل ہو جیسے حضرت حسنؓ کی خلافت یا حضرت داؤدؑ کے بعد حضرت سلیمانؑ خلیفہ بنے۔

مندرجہ بالا مختلف صورتوں سے بآسانی یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ خلافت ان معنوں میں انتخابی منصب ہرگز نہیں ہے جو معنی جمہوریت نواز پہنانا چاہتے ہیں۔ یہاں عوامی رائے دہندگی یا موجودہ قسم کی نمائندگی کا کوئی چکر نہیں۔

۲۔ طریق انتخاب

ہمارے جمہوریت نواز دوست عموماً یہ تاثر دیتے ہیں کہ :۔

۱۔ سقیفہ بنی ساعدہ اس دَور کا پارلیمان تھا۔

۲۔ جہاں انصار و مہاجرین کے سرکردہ حضرات نے جو اس دَور کے قبائلی نظام کے مطابق اپنے اپنے قبیلہ کے نمائندہ کی حیثیت رکھتے تھے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے انتخاب میں حصہ لیا اور

۳۔ نتیجۃً حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کثرت رائے سے منتخب ہو گئے تھے۔

۴۔ انصار و مہاجرین کی حیثیت بھی آج کل کی سیاسی پارٹیوں سے ملتی جلتی تھی۔

لہٰذا اندریں صورت موجودہ دَور کے طرزِ انتخاب میں کوئی ایسی بات نظر نہیں آتی جو اسلامی طرزِ انتخاب سے متصادم ہو۔

اب ہم ان چاروں اجزا کا تفصیلی جائزہ لیں گے۔

۱۔ سقیفہ بنی ساعدہ سقف عربی زبان میں چھت کو کہتے ہیں۔ دو مکانوں کے درمیان اگر کوئی گلی ہو اور اس پر چھت ڈال کر ــــ خواہ وہ محض سائبان وغیرہ ہو یا لکڑی وغیرہ کی چھت ــــ گلی کو سایہ دار بنا لیا جائے تو اسے سقیفہ کہا جاتا تھا۔ سقیفہ کا ترجمہ مولانا وحید الزمان نے "منڈوا" کیا ہے۔ بعض دوسرے علماء اسے سائبان سے تعبیر کرتے ہیں۔ کچھ لوگ اسے ڈیرہ (پنجابی دارا) کہتے ہیں۔

یہ ڈیرہ محض قبیلہ خزرج کی ایک شاخ "بنو ساعدہ" کا تھا۔ جس سے حضرت سعد بن عبادہ تعلق رکھتے تھے۔ اور یہ ڈیرہ یا سائبان ان ہی کے مکان سے ملحق تھا۔ فراغت کے اوقات میں روز مرّہ کی عام گفتگو کے لیے یہاں چند لوگ جمع ہو جاتے تھے۔ یہ نہ تو کوئی ایسا مقام تھا جو مدینہ[1] بھر کے معززین کے لیے مخصوص ہو۔ یا اس جگہ اتنے آدمیوں کی گنجائش ہو۔ پھر یہ کوئی پولنگ سنٹر بھی نہ تھا کہ کسی کے دل میں یہ خیال تک آ سکتا کہ انتخاب کے وقت یہ جگہ ہی موزوں رہے گی۔ لہٰذا اس سقیفہ کو پوری امت کا پارلیمان قرار دینا ہر لحاظ سے حقائق کے خلاف ہے۔

۲۔ نمائندگان کی موجودگی جب عام لوگ اور خصوصاً مہاجرین حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تجہیز و تکفین میں مشغول تھے تو رئیس انصار حضرت سعد بن عبادہ رضؓ نے اس موقع کو غنیمت سمجھ کر اپنے چند ہمراہیوں کو اکٹھا کیا۔ ان کا یہی خیال تھا کہ مہاجرین کو اطلاع دیے بغیر ان کی بے خبری میں خلیفہ کا انتخاب ہو جائے تو پھر کسی کو بھی اس سے اختلاف

---

[1] آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کا حال سُن کر ایک طرف مسجد نبوی میں لوگ جمع ہو گئے تھے ان میں قریباً سب مہاجرین تھے۔ کیونکہ مہاجرین کے مکانات اسی علاقہ میں زیادہ تھے۔ یہاں انصار بہت کم تھے۔ دوسری طرف بازار کے متصل سقیفہ بنی ساعدہ میں مسلمانوں کا اجتماع تھا۔ اس مجمع میں تقریباً سب انصار ہی تھے۔ کوئی دو مہاجر بھی اتفاقاً وہاں موجود تھے۔ (تاریخ اسلام۔ اکبر خاں نجیب آبادی ج ۱ ص ۲۷۵)

کرنے کی گنجائش باقی نہ رہے گی۔ لہٰذا وہ اس مسئلہ کو جلد از جلد طے کر لینا چاہتے تھے۔
اتفاقاً کسی صحابی نے حضرت عمرؓ کو اس صورتِ حال سے مطلع کیا اور کہا کہ آپ کو جلد وہاں پہنچ کر خبر لینی چاہیئے۔ تو ایک روایت کے مطابق وہ حضرت ابوبکرؓ کو ساتھ لے کر وہاں پہنچے۔ اور ایک دوسری روایت کے مطابق حضرت ابوعبیدہؓ بھی دو اور ساتھیوں کو لے کر وہاں پہنچ گئے تھے۔ کیونکہ سقیفہ بنی ساعدہ میں کل چار یا پانچ مہاجرین نے حضرت ابوبکرؓ کے ہاتھ پر بیعت کی تھی۔

اب تاریخی حقائق یہ ہیں کہ فہر بن مالک (لقب قریش۔ قبیلہ قریش کے جدِ امجد) تک تیرہ پشتوں پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا نسب جا کر مل جاتا ہے۔ عہدِ نبوی میں قبیلہ قریش کی بے شمار ذیلی شاخیں موجود تھیں تاہم یہ دس قبیلے زیادہ مشہور تھے۔ جو سب مسلمان ہو چکے تھے۔
ہاشم، اُمیہ، نوفل، عبدالدار، اسد، تیم، مخزوم، عدی، جمح، سہم۔
زمانہ جاہلیت میں قریش کی شرافت و حکومت زیادہ تر ان دس خاندانوں میں منفرد منقسم تھی۔ ان معزز سردار خاندانوں کی ذمہ داریاں یہ تھیں :-

۱۔ بنوہاشم کے ذمہ سقایت یعنی حاجیوں کو پانی پلانے کا کام تھا۔
۲۔ بنونوفل بے زاد حاجیوں کو توشہ اور زادِ سفر مہیا کرتے تھے۔
۳۔ بنوعبدالدار کے پاس خانہ کعبہ کی چابی اور دربانی تھی۔
۴۔ بنواسد سے متعلق مشورہ اور دارالندوہ کا کام تھا۔
۵۔ بنوتمیم کے متعلق خوں بہا اور تاوان کا فیصلہ تھا۔
۶۔ بنوعدی سے متعلق سفارت اور قومی تفاخر کا کام تھا۔
۷۔ بنوجمح کے پاس شگون کے تیر تھے۔
۸۔ بنوسہم کے متعلق بتوں کا چڑھاوا وغیرہ تھا۔
۹۔ بنوامیہ۔ سپہ سالاری ان سے متعلق تھی۔
۱۰۔ بنومخزوم۔ سپہ سالاری (خالد بن ولید اسی خاندان سے تعلق رکھتے تھے)۔

حضرت ابوبکرؓ اپنے قبیلہ تیم کے سردار تھے جو خوں بہا اور تاوان کا فیصلہ کرتے تھے۔
حضرت عمرؓ بنوعدی سے تھے اور سفارت کی خدمت انجام دیتے تھے۔ جنگ میں سفیر بن کر جاتے اور مقابلہ میں قومی تفاخر بیان کرتے تھے۔

حضرت ابوعبیدہ بن الجراح فہر کے پوتے الحلج کی اولاد سے تھے گویا یہ مندرجہ بالا دس مشہور قبیلوں کے علاوہ قبیلہ سے تعلق رکھتے تھے۔

حضرت عبدالرحمٰن بن عوف اور سعد بن وقاص بنو تیم (بن مرہ بن کعب بن لوئی بن غالب بن فہر) کی اولاد سے تھے۔ یہ خاندان بھی مندرجہ دس خاندانوں کے علاوہ ہے۔

سقیفہ مذکورہ میں بیعت کرنے والے مہاجرین کی زیادہ سے زیادہ تعداد پانچ تک ثابت ہے ضروری نہیں کہ یہ سب قریش سے ہی تعلق رکھتے ہوں۔ اگر ان سب کو قریشی ہی فرض کر لیا جائے تو بھی یہ مندرجہ تین یا زیادہ سے زیادہ چار قبیلوں کے نمائندہ تھے تو کیا اس طرح مغربی طرزِ انتخاب کے تقاضے پورے ہو جاتے ہیں جب کہ قریش کے اکثر قبیلوں کے ووٹ کاسٹ ہی نہیں ہوئے؟

پھر انصار کا معاملہ تو اس سے بھی بڑھ کر ہے۔ انصار میں دو بڑے قبائل اوس اور خزرج شامل تھے۔ جن کی ذیلی شاخوں کی تعداد سینکڑوں تک جا پہنچتی ہے تو کیا وہاں سینکڑوں قبائل کے نمائندوں کی گنجائش تھی؛

پھر انصار نے جس عجلت میں یہ مہم سرانجام دینے کی ٹھان رکھی تھی۔ یہ بات قطعاً بعید از قیاس معلوم ہوتی ہے کہ تمام قبائلی نمائندوں کو شرکت کی دعوت دی جا سکتی ہو یا اس قلیل وقت میں یا غیر متوقع موقع پر سب سرداروں کا جمع ہونا از خود ناممکنات سے ہے۔

پھر یہ قبائلی سردار اس طرح منتخب نہیں ہوتے تھے جس طرح آج کل کسی وارڈ کے ممبر کا انتخاب کثرتِ رائے سے ہوتا ہے۔ ان قبائل کا معیارِ انتخاب بالکل سادہ اور فطری ہوتا تھا۔ عام طور پر تین باتیں ملحوظ رکھی جاتی تھیں۔

(۱) عمر میں بڑا ہونا (۲) سمجھ دار اور تجربہ کار ہونا (۳) اپنی عادات و خصائل کی بنا پر محترم ہونا۔

گویا ان سرداروں کا انتخاب کسی مخصوص مجلس یا مخصوص وقت میں نہیں ہوتا تھا۔ بلکہ فیصلہ کے لیے چند معزز لوگ اپنی نجی گفتگو اور مجلس میں یہ رائے قائم کر لیتے تھے کہ آج کل فلاں شخص ہی اس رُتبہ کا اہل ہے۔ ایسی ہی چند متفرق اور نجی مجلسوں میں رائے زنی کے بعد اسے سردار منتخب کر لیا جاتا تھا۔ اس سردار کے اس منصب کی توثیق کے لیے قبیلہ کے ہر کہ و مہ سے رائے لینا چنداں ضروری نہیں سمجھا جاتا تھا۔

اسلام نے آکر ان اہلیتوں میں صرف علم اور تقویٰ کا اضافہ کیا اور پہلی اہلیتوں کو برقرار

رہنے دیا۔

اب ایک دوسرے پہلو سے بھی غور فرمائیے۔ اس وقت مسلمان صرف مہاجرین و انصار ہی کا نام نہ تھا۔ بلکہ وفات النبیؐ کے وقت جزیرۃ العرب میں مسلمانوں کی تعداد بیس لاکھ کے لگ بھگ تھی۔ تو کیا یہ تصور بھی کیا جا سکتا ہے کہ ان بیس لاکھ افراد کے نمائندوں نے سقیفہ بنی ساعدہ میں شرکت کی ہوگی اور انصار و مہاجرین کے قبائل کے علاوہ دوسرے قبیلوں کے نمائندے بھی شامل ہوئے ہوں گے۔ ان حالات میں تو یہ انتخاب بالواسطہ انتخاب کے تقاضے بھی پورے نہیں کرتا۔ براہِ راست انتخاب تو دُور کی بات ہے۔

نمائندگی کی ضرورت؟ عوام کے نمائندوں کی ضرورت اس مشہور واقعہ سے جائز ثابت کی جاتی ہے جو بخاری میں متعدد مقامات پر مذکور ہے کہ جب قبیلہ ہوازن کے قیدی حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں میں تقسیم کر دیے تو اسی قبیلہ کے سرکردہ لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور التجا کی کہ ان کے قیدیوں کو چھوڑ دیا جائے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو خطاب فرمایا اور کہا:

"........ اور میں مناسب سمجھتا ہوں کہ ان کے قیدی ان کو پھیر دوں۔ جو کوئی خوشی سے چاہے ایسا کرے اور جو اپنا حصّہ واپس نہ کرنا چاہے تو وہ ٹھہرا رہے۔ آئندہ جب غنیمت کا مال آئے تو ہم اسے معاوضہ ادا کر دیں گے۔"

لوگوں نے عرض کیا "یا رسول اللہ ہم بخوشی یہ قیدی واپس کر دیتے ہیں۔"

آپؐ نے فرمایا: "مجھے یہ کیسے معلوم ہو کہ تم میں سے کون راضی ہے اور کون نہیں (کیونکہ مسلمان بارہ ہزار تھے) تم ایسا کرو۔ کہ تم اپنے اپنے نقیبوں (حدیث میں عرفاءکم کا لفظ ہے عرفاء، عریف بمعنی چودھری کی جمع ہے) سے اپنی اپنی مرضی کہلا بھیجو۔"

یہ سُن کر لوگ چلے گئے اور عریف لوگ اپنے اپنے لوگوں سے گفتگو کر کے آپؐ کے پاس آئے اور کہا "لوگ برضا و رغبت قیدی واپس کرنے کو تیار ہیں۔" (بخاری کتاب الجہاد والسیر)

اس واقعہ سے موجودہ طرزِ انتخاب میں نمائندوں کی ضرورت اور جواز ثابت کیا جاتا ہے، جب کہ اس واقعہ اور موجودہ انتخابات میں بنیادی فرق یہ ہے کہ اس واقعہ میں لوگوں کو فرداً فرداً اپنے حقِ ملکیت سے دست بردار ہونے کی اپیل کی گئی تھی اور اگر کسی ایک آدمی کی بھی مرضی نہ ہوتی اور وہ مجمع عام میں خاموش رہتا تو یہ ایک قسم کا ظلم تھا۔ لہٰذا ہر ایک کی فرداً فرداً مرضی معلوم کرنے

کی ضرورت تھی جو اہلِ محلہ یا محلہ کے چوہدری ہی بذریعہ بات چیت معلوم کرسکتے تھے۔ مگر شوریٰ یا امیر کا انتخاب اسلامی نقطۂ نظر سے عوام کا حق ہے ہی نہیں۔ وہ تو ایک ذمہ داری ہے۔ انتخاب کرنے والے اور منتخب ہونے والے سب کے متعدد اوصاف ہیں۔ اور انتخاب کنندگان (یا اہلِ الرائے) پر ایک ذمہ داری اور بوجھ ہے کہ وہ یہ امانت اسی شخص کے حوالے کریں جو اس کا اہل تر ہو ورنہ وہ خدا کے سامنے جواب دہ ہوں گے۔

۳۔ کثرت رائے اور انتخاب حضرت ابوبکرؓ

ہم بخاری کی حدیث سے ثابت کر چکے ہیں کہ حضرت عمرؓ کے اپنے بیان کے مطابق صرف اُنھوں نے اکیلے بیعت کی جسے اللہ تعالیٰ نے کامیاب بنا دیا۔ حضرت عمرؓ کے بعد حضرت ابوعبیدہؓ بن الجراح نے، پھر دو تین مزید موجود قریشیوں نے بیعت کی۔ اس کے بعد انصار کے موجود لوگوں میں سے اکثر نے بیعت کر لی۔

اب حضرت عمرؓ کا بیان یہ ہے کہ میں نے اکیلے حضرت ابوبکرؓ کی بیعت کی اور خدا نے اسے کامیاب بنایا جس کا مطلب بالکل واضح ہے کہ بیعت کرنے والوں کی گنتی مقصود نہیں بلکہ خلافت کے انتخاب کے متعلق مشورہ دینے والوں کی گنتی مقصود ہے۔ اور وہ صرف حضرت عمرؓ کی ذات تھی۔

اسی طرح حضرت حسنؓ کی بیعت بھی صرف ایک شخص قیس بن سعد بن عبادہ نے کی۔ بعد میں دوسرے لوگوں نے بیعت کی اور یہ خلافت بھی منعقد ہوگئی جس کی صحت میں انکار کی گنجائش نہیں ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ اگر ایک فردِ واحد کی رائے پر بھی خلافت کا منعقد ہو جانا ثابت ہے اگرچہ یہ ہنگامی حالات کے تقاضے تھے ـــ تو پھر کثرتِ رائے کا سوال ہی کہاں باقی رہ جاتا ہے۔ جب کثرت رائے حق کا معیار ہی نہیں (جیسا کہ مشورہ کے عنوان کے تحت تفصیلاً مذکور ہے) تو پھر کثرت رائے کو ثابت کرنے کا فائدہ بھی کیا ہے؟ کیا جمہوری طرزِ انتخاب میں ایسی گنجائش موجود ہے کہ ہنگامی صورت میں کوئی شخص برسرِ اقتدار آجائے یا اسے چند اشخاص لے آئیں تو اسے آئینی سربراہ سمجھ لیا جائے؟

۳ ۔ سیاسی جماعتوں کا وجود

کیا انصار و مہاجرین سیاسی جماعتیں تھیں ؟

مہاجرین و انصار میں خلافت کے معاملہ پر سقیفہ بنی ساعدہؓ میں چند لمحات کے لیے نزاع پیدا ہوئی جو اسی مقام پر ختم ہو گئی ۔ تو اس واقعہ کی بناء پر مہاجرین و انصار کو آج کل کی سیاسی پارٹیوں کے مماثل قرار دینا ، میں سمجھتا ہوں کہ ہمارے جمہوریت نواز دوستوں کی بہت بڑی جسارت ہے ۔ جب یہ مہاجرین اولین مکہ کی گلیوں میں پٹ رہے تھے اور کفار کے ظلم و تشدد کا نشانہ بنے ہوئے تھے تو کیا یہ سب کچھ اس لیے ہو رہا تھا کہ ہم کسی نہ کسی وقت کاروبارِ حکومت پر قابض ہوں جیسا کہ موجودہ دور کی سیاسی پارٹیوں کا بنیادی مقصد ہی یہ ہوتا ہے ۔

مہاجر اور انصار تو صفاتی نام ہیں جو ان کو خود اللہ تعالیٰ نے عطا فرمائے تھے ۔ کیا یہ گروہ مہاجرین و انصار ایسے ہی اغراض و مقاصد کے تحت وجود میں آئے تھے ، جیسے موجودہ دور میں سیاسی جماعتوں کی تشکیل ہوتی ہے ؟ کتنا گھناؤنا الزام ہے یہ صحابہ کبارؓ پر ۔

اب ذرا جمہوریت کے علمبرداروں کی زبانی سیاسی جماعت کی تعریف سنیے ۔ بعد میں فیصلہ ہم قارئین پر چھوڑتے ہیں ۔

۱ ۔ میک آئیور ـــــ " ایسی جماعت جو کسی اصول یا پالیسی کی بنیاد پر منظم ہوا ور جو آئینی ذرائع سے حکومت سنبھالنے کی کوشش کرے "

۲ ۔ گلکرائسٹ ـــــ " شہریوں کا ایک منظم گروہ جو ایک ہی سیاسی عقیدہ رکھتے ہیں اور جو سیاسی اتحاد کے ذریعہ اقتدارِ حکومت کے حصول کی کوشش کرتے ہیں "

۳ ۔ لارڈ برائس ـــــ " منظم جماعتیں جن کی رکنیت رضا کارانہ ہوتی ہے اور جن کا پورا زور سیاسی طاقت کے حصول پر صرف ہوتا ہے " (اصول سیاسیات مصنفہ صفدر رضا صدر شعبۂ سیاسیات بعنوان سیاسی جماعتیں ص ۳۰۹ ۔ پانچواں ایڈیشن)

گویا موجودہ جمہوری دور میں ایک سیاسی جماعت میں تین عناصر کا وجود ضروری ہے (۱) کسی مخصوص سیاسی عقیدہ کی بنا پر اس کی تشکیل (۲) رضا کارانہ تنظیم اور (۳) تشکیل کا مقصد اقتدار کا حصول ہوتا ہے ۔

علاوہ ازیں جو سیاسی جماعتیں الیکشن ہار جاتی ہیں ۔ وہ حزبِ اختلاف کی شکل میں اپنا

مستقل وجود برقرار رکھتی ہیں۔ یہ جمہوری طرزِ انتخاب میں لازمی عنصر ہے جس کے بغیر اسمبلیاں تشکیل پا ہی نہیں سکتیں۔ اب بتلایئے کہ حضرت ابوبکرؓ کی خلافت کے انعقاد کے بعد کون سا حزبِ اختلاف باقی رہ گیا تھا؟

پھر اس حزبِ اختلاف کا کام حکومت کی پالیسیوں پر نکتہ چینی کرنا ہے۔ اور چونکہ ہر سیاسی جماعت ـــــ خواہ وہ حزبِ اقتدار ہو یا حزبِ اختلاف میں ہو ـــــ اپنا مستقل سیاسی عقیدہ رکھتی ہے۔ لہٰذا حکومت کی پالیسی پر تنقید کے وقت فریقین میں انا کا مسئلہ پیدا ہو جاتا ہے۔ اور مفاہمت کی بجائے مناقشت ہی بڑھتی چلی جاتی ہے۔ اب فرمایئے کہ سقیفہ بنی ساعدہ میں کیا ہوا؟ حضرت ابوبکرؓ نے رسولؐ خدا کا ایک فرمان پیش کیا جس کے آگے انصار نے سرِتسلیم خم کر دیا اور اُمّت میں پیدا شدہ انتشار کا طوفان اسی دم تھم گیا۔ وجہ یہ ہے کہ ان کے "سیاسی عقیدے" الگ الگ نہیں تھے۔ تو کیا ایں صورتِ حال انصار یا مہاجرین کو موجودہ سیاسی جماعتوں کے مماثل قرار دیا جا سکتا ہے؟

سیاسی جماعتوں میں اس بات کی گنجائش ہوتی ہے کہ باپ اگر ایک پارٹی سے تعلق رکھتا ہے تو بیٹا دوسری پارٹی سے تعلق رکھتا ہو اور یہ بات عام مشاہدہ میں آچکی ہے۔ غور فرمایئے۔ کیا مہاجرین وانصار میں یہ گنجائش نظر آتی ہے کہ باپ اگر مہاجر ہے تو بیٹا انصاری بن جائے یا اگر باپ انصاری ہے تو بیٹا مہاجر بن جائے۔

علاوہ ازیں موجودہ سیاسی نظام میں یہ گنجائش بھی موجود ہے کہ ایک شخص ایک وقت میں تو مثلاً مسلم لیگ کا رکن ہو اور بعد میں کسی بھی وقت وہ پارٹی تبدیل کر کے کسی دوسری سیاسی پارٹی مثلاً پیپلز پارٹی میں چلا جائے۔ غور فرمایئے کیا مہاجرین وانصار سے اس گنجائش سے فائدہ اٹھا سکتے تھے؟ کیا یہ ممکن تھا کہ ایک مہاجر کا جب جی چاہے وہ انصاری بن جائے یا کوئی انصاری جب جی چاہے مہاجر بن جائے؟ پھر آخر کس بنا پر انہیں سیاسی جماعتیں کہا جا سکتا ہے؟

کیا عرب قبائل سیاسی جماعتیں تھیں؟

بعض دوسرے دوست مہاجرین وانصار کا نام تو نہیں لیتے وہ قبائل کو سیاسی جماعتوں کے مماثل قرار دیتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اوس اور خزرج میں اندرونی طور پر رقابت موجود تھی۔ لیکن وہ اس "انتخابی معرکہ"

میں متحد ہو گئے تھے۔ اسی طرح بنو ہاشم اپنے مفاد کی خاطر مہاجرین سے الگ ہو گئے تھے اور عرب میں قبائلی نظام، ان کی آپس میں رقابتیں اور لڑائیاں، یہ سب کچھ ایک دوسرے پر مسابقت اور حصولِ اقتدار کے لیے ہوتا تھا۔ اور پھر اس قبائلی نظام کی اسلام نے مذمت نہیں کی بلکہ یہ کہہ کر حوصلہ افزائی ہی کی ہے۔

یا ایھا الناس انا جعلنکم شعوبًا و قبائل لتعارفوا۔ (۴۹/۱۳)

لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور پھر تمھاری قومیں اور قبیلے بنائے تاکہ ایک دوسرے کو شناخت کرو۔

اس آیت کا مطلب تو صاف ہے کہ قبائل کا وجود فطری طور پر ظہور میں آیا ہے اور اس کا فائدہ یہ ہے کہ جب آبادی بڑھ جاتی ہے تو ایک دوسرے کو پہچاننے کا یہ ایک ذریعہ ہے۔

ہم ان دوستوں کی ذہانت کی داد دیے بغیر نہیں رہ سکتے۔ جنھوں نے تعارف کے معنی کو بھی "غالب و مغلوب" کا جامہ پہنا دیا۔

بُرا ہو جمہوریت پرستی کا، اس نے انسانی ذہن کو کن راہوں پر ڈال دیا ہے۔ کیا ان بزرگ ہستیوں کے متعلق یہ تصور کیا جا سکتا ہے کہ اسلام لانے کے بعد بھی ان میں پرانی جاہلیت برقرار رہی تھی؟ کیا وہ سقیفہ بنی ساعدہ میں چند لمحات کی نزاع کے بعد اسی طرح شیر و شکر نہیں ہو گئے تھے۔ جس طرح پہلے تھے؟ کیا ایسے اہم معاملہ میں وقتی شکر رنجی کے بعد فوری مفاہمت کے بلند کردار کی کوئی اور مثال بھی پیش کی جا سکتی ہے؟

یہ درست ہے کہ بنو ہاشم کے چند افراد نے کچھ عرصہ تک بیعت نہیں کی۔ لیکن کیا کوئی ایک ادنیٰ سی مثال بھی پیش کی جا سکتی ہے کہ انھوں نے حکومت کی پالیسیوں پر نکتہ چینی کر کے حزبِ اختلاف کا کردار ادا کیا ہو؟ یا اپنا مستقل وجود برقرار رکھنے پر اصرار کیا ہو۔ اگر کسی اجتہادی غلطی یا بشری لغزش اور قرابتداری کی بناء پر بنو ہاشم خود کو خلافت کا حق دار سمجھتے تھے تو کیا انھوں نے اس معاملہ میں عصبیت اختیار کی تھی؟ آخر وہ کون سی بنیاد ہے کہ انھیں ہم موجودہ سیاسی جماعتوں کے مماثل قرار دے سکیں؟

جب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خلافت منعقد ہو گئی تو یہ بات حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ کو بھی محض قبائلی عصبیت کی بنا پر کچھ ناگوار سی محسوس ہوئی۔ وہ اس سلسلہ میں حضرت علیؓ کے پاس گئے اور ان سے ہمدردی کا اظہار کرتے ہوئے کہنے لگے:-

"قریش کے سب سے چھوٹے قبیلے کا آدمی کیسے خلیفہ بن گیا۔ تم اگر اُٹھنے کے لیے تیار ہو تو میں اس وادی کو سواروں اور پیادوں سے بھر دوں؟" مگر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے یہ جواب دے کر ان کا منہ بند کر دیا کہ "تمہاری یہ بات اسلام اور اہلِ اسلام کی دشمنی پر دلالت کرتی ہے۔ میں ہرگز نہیں چاہتا کہ تم سوار اور پیادے لاؤ۔ مسلمان سب ایک دوسرے کے خیر خواہ اور ایک دوسرے سے محبت کرنے والے ہوتے ہیں خواہ ان کے دیار اور اجسام ایک دوسرے سے کتنے ہی دُور ہوں۔ البتہ منافقین ایک دوسرے کی کاٹ کرنے والے ہوتے ہیں۔ ہم ابوبکرؓ کو اس منصب کا اہل سمجھتے ہیں۔ اگر وہ اہل نہ ہوتے تو ہم لوگ کبھی انہیں اس منصب پر مامور نہ ہونے دیتے۔"

(کنز العمال ج ۵ ص ۲۳۷۴، طبری ج ۲ ص ۴۴۹)

غور فرمایئے اس روایت کے مطابق حضرت علیؓ حزبِ اختلاف کا کردار ادا کرنے کو منافقین کا نام دے رہے ہیں۔

سیاسی فرقوں اور مذہبی فرقوں میں فرق

سیاسی جماعتوں کے وجود کے جواز میں یہ دلیل بھی پیش کی جاتی ہے کہ اگر فقہی اختلاف یا مذہبی فرقوں کا وجود برداشت کر لیا گیا ہے تو آخر سیاسی اختلاف اور سیاسی جماعتوں کے وجود کو کیوں ناجائز سمجھا جاتا ہے؟ ہم یہ عرض کریں گے کہ فقہی اختلاف سے مراد کتاب وسُنّت کی تعبیر کا اختلاف ہے۔ کتاب وسُنّت کے علاوہ کچھ نہیں لیکن اس اختلاف میں بھی جب عصبیت پیدا ہو جائے اور فرقہ پرستی تک نوبت پہنچ جائے تو یہ بھی کُفر ہے[1] پھر ایک غلط بات کو جائز قرار دے کر اس کو دوسری غلط چیز کے لیے بنیاد قرار دے دینا کہاں تک درست ہے؟ سیاسی اختلاف کا ہونا ایک فطری بات ہے لیکن اس اختلاف کو عقیدہ کا رنگ دینا پھر اپنے ہم خیال لوگوں کا منظم ہونا اور پھر حصولِ اقتدار کے لیے کوشش کرنا اور پھر اسے درست سمجھنا اور اس پر اڑے رہنا ایک گمراہ کُن امر ہے۔

مذہبی فرقوں اور سیاسی فرقوں میں دوسرا فرق یہ ہے کہ مذہبی قائدین نے کبھی اپنے قیاس و مسلک کو قابلِ اتباع قرار نہیں دیا کہ اس عقیدہ کو لوگ اپنا کر فرقہ بنائیں اور اگر لوگ بنالیں تو

---

[1] دیکھئے حدیث ملا زیرعنوان ملی وحدت۔

ان کی اپنی غلطی ہے جس سے قائد بیزار ہوتے ہیں۔ جبکہ سیاسی جماعتوں میں ایسی تنظیم بنانا لازمی شرط ہے۔ اور ان قائدین کا یہی مقصد ہوتا ہے۔

اور تیسرا فرق یہ ہے کہ مذہبی فرقوں کا مقصد عوام کی اکثریت کو اپنے ساتھ ملانا اور اقتدار پر قبضہ یا اس کے حصول کی کوشش کرنا نہیں ہوتا جبکہ سیاسی جماعتوں کا اصل مقصود ہی یہ ہوتا ہے کہ ملک میں اپنی اکثریت پیدا کرنے کے لیے تشتت و انتشار پیدا کیا جائے اور پھر اس راستہ سے حکومت میں سے حصہ رسدی حاصل کرنے کے لیے راستہ ہموار کیا جائے۔

ایک اعتراض اور اس کا جواب

ایک استفسار یہ بھی کیا جاتا ہے کہ" اگر اسلام میں سیاسی جماعتوں کا وجود گوارا نہیں تو جماعتِ اسلامی اور سید احمد شہید کی جماعت کے متعلق کیا خیال ہے؟"

جواب :۔ سطحِ زمین پر آباد مخلوقِ انسانی کی دو ہی قسمیں قرآنِ کریم نے بتلائی ہیں۔

هوالذی خلقکم فمنکم کافر ومنکم مومن (۶۴/۲)

وہی تو ہے جس نے تم کو پیدا کیا۔ پھر کوئی تم میں کافر ہے اور کوئی مومن۔

اسی مضمون کو قرآنِ کریم نے ایک دوسرے مقام پر حزب اللہ اور حزب الشیطان کے نام سے پکارا ہے۔ گویا بنیادی طور پر سیاسی پارٹیاں دو ہی ہیں (۱) اللہ کی پارٹی یا مسلمانوں کی جماعت (۲) شیطان کی پارٹی یا پوری دنیائے کفر۔

مسلمانوں کی جماعت میں تفرقہ و انتشار پیدا کرنا یا مذہبی اور سیاسی پارٹیاں بنانا بڑا جرم ہے جس کی تفصیل ہم "ملی وحدت" کے تحت پیش کر چکے ہیں۔ مغربی جمہوریت جیسے لادینی نظام میں ایسی سیاسی پارٹیوں کا وجود، جو خلوصِ نیت سے دین کی سربلندی کے لیے کوشاں ہوں، صرف اس حد تک اضطراراً گوارا کیا جا سکتا ہے کہ بے دینی کے بڑھتے ہوئے سیلاب میں کچھ نہ کچھ رکاوٹ پیدا کرتی رہیں۔ اور یہ اَهْوَنُ الْبَلِيَّتَيْن میں سے ایک کم ضرر والی صورت کو اختیار کرنے کی شکل ہے۔ اب یہ جماعتیں خواہ جماعتِ اسلامی ہو، یا جمعیت علمائے اسلام یا جمعیت علمائے پاکستان، سب کی ایک ہی حالت ہے۔ جمہوری نظام کا تقاضا یہ ہے کہ یہ جماعتیں اپنا تشخص برقرار رکھیں جب کہ نظامِ اسلام کا تقاضا یہ ہے کہ ایسی سب پارٹیاں اپنا تشخص ختم کر کے ایک ملتِ واحدہ میں مدغم ہو کر حزب اللہ بن جائیں اور حزب الشیطان کے مقابلہ میں ڈٹ کر مقابلہ کریں۔ اگر ایسا نہ کریں تو اسے مسلمانوں کی بدبختی کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے۔

اور سید احمد شہید کی جماعت معروف معنوں میں کوئی سیاسی جماعت نہیں تھی جس نے اپنا علیحدہ نام تک رکھنا گوارا نہ کیا بلکہ وہ ایک تحریک تھی۔ جیسا کہ اسلام بذاتِ خود ایک تحریک ہے۔ اس تحریک نے تبلیغ، ہجرت اور جہاد کا بالکل وہی طریق اختیار کیا جو انبیاء علیہم السلام کا شیوہ رہا ہے اور جس طریق سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کی رہنمائی میں ——— اُمتِ مسلمہ کی قیادت کی تھی۔ لہٰذا اسے تحریک علیٰ منہاج النبوۃ کہنا بالکل بجا ہے۔ اس جماعت نے گاندھی کا طرزِ سیاست اختیار نہیں کیا کہ ظالم کا گریبان پکڑنے کی بجائے اپنا گریبان پھاڑ کر سڑکوں پر واویلا کیا جائے تاکہ اندرونی اور بیرونی رائے عامہ اپنے حق میں استوار کرے۔ گرفتاریاں پیش کرے یا جیل میں اے کلاس کی درخواست کرے اور ضمانت پر رہائی کے بعد پھر گرفتاری اور اس کے بعد بھوک ہڑتال (خودکشی) کی دھمکیاں دیتی پھرے۔

سوچنے کی بات ہے کہ اگر سڑک پر آکر مرنا شہادت ہے تو گولی چلانے والوں کے لیے کیا فتویٰ ہے؟ اور پیٹھ پھیر کر بھاگنے والوں کے متعلق کیا رائے ہے؟ رائے عامہ کو ہموار کرنے کی یہ کوشش اسلام اور جہاد کا نام لیے بغیر بھی کی جاسکتی ہے۔ آخر یہ اندازِ فکر اسلامی سیاست کا کونسا حصہ ہے۔ جہاں اسلام اور جہاد کا نام لینا ضروری ہوجاتا ہے؟

سید احمد شہید کی تحریک ایسی بے ہودگیوں سے یکسر پاک تھی اور اس نے جو قدم اُٹھایا، اسلامی نقطۂ نظر سے بالکل صحیح سمت میں اُٹھایا تھا اور ہماری یہ دُعا ہے کہ موجودہ دین پسند سیاسی جماعتیں بھی متحد ہوکر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسی اسوہ کی تقلید کریں۔

۴۔ بیعتِ خاص اور بیعتِ عام

ہم پہلے ذکر کرچکے ہیں کہ حضرت ابوبکرؓ کے ہاتھ پر خلافت کے انعقاد کے لیے بیعت سقیفہ بنوساعدہ میں ہوئی۔ پھر دوسرے دن مسجد نبوی میں عام بیعت ہوئی۔ حضرت عمرؓ کو حضرت ابوبکرؓ نے نامزد کیا۔ نامزدگی کے متعلق گفتگو آپ کے گھر پر ہوتی رہی۔ لیکن عام بیعت مسجدِ نبوی میں ہوئی۔ اسی طرح حضرت عثمانؓ کی خلافت سے متعلق مشورے تو حضرت مسوّر بن مخرمہ کے گھر پر ہوتے رہے لیکن عام بیعت مسجدِ نبوی میں ہوئی۔ حضرت علیؓ بھی یہی کچھ چاہتے تھے۔ کہ ان کا انتخاب اور بیعت حسبِ دستور ہو۔ مگر ہنگامی حالات کی وجہ سے ان کی یہ آرزو پوری نہ ہوسکی۔ البتہ بیعتِ عام مسجدِ نبوی میں ہی ہوئی۔

ان تصریحات سے واضح ہے کہ بیعت دو قسم کی ہوتی ہے :۔

۱۔ بیعتِ خاص یہ بیعت خلافت کے انعقاد کے لیے ہوتی ہے اور اس میں صرف معزز افراد یا اہلِ شوریٰ حِصّہ لیتے ہیں جیسا کہ حضرت علیؓ نے باغیوں کے گروہ سے فرمایا تھا کہ :۔

"خلیفہ کا انتخاب اہلِ شوریٰ اور اہلِ بدر کا کام ہے۔ ہم کسی وقت جمع ہوں گے اور اس پر غور کریں گے۔" (ابن قتیبہ۔ الامامۃ والسیاستہ جلد ۱۔ صفحہ ۴۱)

اس بیعت سے مقصد خلیفہ کا انتخاب، انتخاب کی توثیق اور سمع و اطاعت (حلفِ وفاداری) سب کچھ شامل ہوتا ہے۔

۲۔ بیعتِ عام بیعتِ خاص کے لیے کوئی خاص مقام مقرر نہیں لیکن بیعتِ عام کسی مرکزی مسجد میں برسرِ عام ہونی چاہیئے۔ خلفائے اربعہ کی بیعتِ عام مسجدِ نبوی میں برسرِ عام اور اعلانات کے ذریعے ہوتی رہی۔ بیعت عامہ کا مقصد محض سمع و اطاعت ہے۔ جیسا کہ تمام متعلقہ اور محولہ احادیث سے ثابت ہوتا ہے۔ عوام کا کام صرف یہ ہے کہ وہ خواص کے فیصلہ کو تسلیم کرلیں۔ خلیفہ کے انتخاب میں عوام کی کوئی ذمّہ داری نہیں ہے۔ نہ ہی انھیں اس بات کا اختیار رہے کہ خواص کے فیصلہ کو مجلسِ عام میں رد کردیں۔ نہ ہی ایسی کوئی مثال پیش کی جا سکتی ہے۔ اس کے باوجود ہمارے کچھ دوست یہ کہنے میں باک محسوس نہیں کرتے کہ اہلِ شوریٰ کے انتخاب کے بعد یہ فیصلہ عوام کے سامنے بغرض قبولیتِ عامہ" پیش کیا جاتا تھا۔ چاہے تو اسے منظور کریں یا رد کریں۔

اور میں سمجھنے میں شاید غلطی پر نہ ہوں گا کہ حضرت علیؓ کے زمانہ میں اُمّتِ مسلمہ جس تشتّت و انتشار کا شکار رہی اور جنگِ جمل وصفین جیسے معرکے پیش آئے تو اس کی وجہ محض یہ تھی کہ ان کی بیعتِ عامہ تو ہوگئی لیکن اس سے پہلا اقدام "بیعتِ خاص" ان کی آرزو کے باوجود انھیں میسر نہ آسکا۔ کیونکہ خلیفہ کے انتخاب کے اصل ذمّہ دار اور حق دار "اعیانِ ملّت" ہیں عوام نہیں۔

ہمارے جمہوریت نواز دوست بیعتِ خاص اور بیعت عام کے موضوع سے تعرض نہیں کرتے۔ کیونکہ اسی سے موجودہ طرزِ انتخاب کے بنیادی عقیدہ "حق بالغ رائے دہی" پر کاری ضرب پڑتی ہے۔

ہمارے ہاں "ووٹ" کی مروجہ اصطلاح پہلے معنوں یعنی بیعت خاص کی ترجمانی کرتی ہے۔ جیسا کہ اس کے عنوان "حق بالغ رائے دہی" سے ظاہر ہے جب کہ بیعتِ عامہ محض ایک ذمہ داری

ہے۔حق نہیں۔

عموماً یہ کہہ دیا جاتا ہے کہ عہد نبوی یا خلفائے راشدین میں براہِ راست یا بالواسطہ انتخاب کا کوئی باضابطہ نظام موجود نہ تھا۔ لہٰذا مدینہ میں موجود بزرگ صحابہ (جو تمام عرب کے قبائل کے نمائندہ کی حیثیت رکھتے تھے) ہی خلیفہ کے انتخاب میں حصہ لیتے رہے۔

یہ بات بھی حقیقت کے خلاف ہے۔ مسلمانوں کی باقاعدہ مردم شماری کا رواج تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں ہی پڑ چکا تھا جیسا کہ درج ذیل حدیث سے واضح ہے۔

عن حذیفة قال : قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم: "اکتبوا لی من تلفظ بالاسلام من الناس"۔ فکتبنا لہ الفا وخمس مائة۔

(بخاری۔ کتاب الجہاد والسیر۔ باب کتابة الامام الناس)

حضرت حذیفہؓ کہتے ہیں۔ ہمیں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ ہر وہ شخص جس نے اسلام کا کلمہ پڑھا ہے ان کے نام لکھ کر مجھے دیے جائیں"۔ سو ہم نے آپؐ کے لیے فہرست تیار کی تو ایک ہزار پانچ سو (١٥٠٠) مسلمان ہوئے۔

اور حضرت عمرؓ کے زمانہ میں تو یہ مردم شماری کا ایک الگ محکمہ بھی قائم ہو گیا تھا۔ اگر بالغ رائے دہی فی الواقع کوئی پسندیدہ چیز تھی تو کسی بھی دور میں ان رجسٹروں سے کیوں نہ کام لیا گیا جب کہ انتخابی فہرستیں پہلے سے ہی موجود تھیں۔

بالغ رائے دہی کے حق میں دلائل

پہلی دلیل حق بالغ رائے دہی کے جواز میں مندرجہ ذیل آیت سے استدلال پیش کیا جاتا ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓى اَهْلِهَا (٤/٥٨)

اللہ تعالیٰ تمہیں حکم دیتا ہے کہ امانتیں ان کے اہل افراد کو دو۔

کہا جاتا ہے کہ اس حکم میں نمائندہ پر تو پابندی ہے کہ وہ اس کا اہل ہو۔ لیکن ووٹر پر عمل صالح کی کوئی پابندی نہیں۔ پھر اس عام حکم کو کس رُو سے مقید کیا جاتا ہے۔ علاوہ ازیں ہمارے پاس کون سا ایسا معیار ہے کہ ہم لوگوں کے اندرونی حالات کا پتہ لگاتے پھریں کہ کون صالح ہے اور کون غیر صالح؟ جبکہ قرآن کریم میں یہ بھی واضح حکم ہے کہ :۔

وَلَا تَجَسَّسُوْا (۱۲/۴۹)

اور کسی کا بھید نہ ٹٹولو۔

جواب :۔ قرآن کریم میں بے شمار ایسے احکامات موجود ہیں جن میں صیغہ جمع حاضر استعمال ہوا ہے۔ حکم عام ہے لیکن اس کا اطلاق صرف اس کے اہل افراد پر ہوتا ہے۔ مثلاً قرآن کریم میں ہے :۔

وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَۃُ فَاقْطَعُوْا اَیْدِیَھُمَا (۵/۳۸)

اور جو چوری کرے مرد ہو یا عورت، ان کے ہاتھ کاٹ ڈالو۔

آیت مذکورہ میں ہاتھ کاٹنے کا حکم عام ہے۔ لیکن اس کے مخاطب عمال حکومت ہی ہو سکتے ہیں۔ جو سزا دینے کے اہل ہیں۔ اب اگر اس حکم کو عام سمجھ کر عام لوگ بھی یہ فریضہ سرانجام دینے لگیں تو جو حشر ہوگا اس کا آپ اندازہ کر سکتے ہیں۔

اسی طرح " واٰتوا الزکوٰۃ " کا حکم عام ہے اور قرآن کریم میں سینکڑوں جگہ استعمال ہوا ہے لیکن اس کے مکلف صرف وہ لوگ ہیں۔ جو زکوٰۃ دینے کے اہل یا صاحب نصاب ہیں۔

گو ہم پہلے خلافت راشدہ کے نظائر سے یہ ثابت کر چکے ہیں کہ عوام انتخاب میں حصہ لینے کے مکلف نہیں ہیں۔ تاہم اگر ہمارے دوستوں کو یہ اصرار ہے تو ہم وہ قیود بھی پیش کر دیتے ہیں جو شریعت نے اس عام حکم پر لگائی ہیں۔

ووٹر کی اہلیت

۱۔ پہلی پابندی تو یہ ہے کہ وہ مسلمان ہو کیونکہ اس آیت کے مخاطب مسلمان ہیں۔ کسی نام نہاد اسلامی ریاست کے عوام نہیں۔ اور مسلمان کی قانونی تعریف یہ ہے کہ وہ کم از کم نماز اور روزہ کا پابند ہو ورنہ وہ ایک اسلامی مملکت میں وہ حقوق شہریت کا مجاز نہیں ہے۔ ارشاد نبوی ہے۔

امرت ان اقاتل الناس حتی یشھدوا ان لا الٰہ الا اللہ وان محمداً رسول اللہ ویقیموا الصلوٰۃ ویوتو الزکوٰۃ فاذا فعلوا ذلک فعصموا منی دماء ھم الا بحق الاسلام وحسابھم علی اللہ ۔(مسلم۔ کتاب الایمان باب الامر لقتال الناس)۔

مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں لوگوں سے جنگ کروں یہاں تک کہ وہ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کی شہادت دیں۔ نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں۔ اگر ایسا کریں تو ان کی

جائیں محفوظ ہو جائیں گی۔ الا یہ کہ وہ اسلام کے کسی حق کے تحت اس حفاظت سے محروم رہیں اور ان کے باطن کا حساب اللہ پر ہے۔

۲۔ ووٹ جیسے ایک مقدس امانت ہے۔ ویسے ہی ایک شہادت بھی ہے کہ ووٹر فی الواقعہ (بدل وجان) اس نمائندے کو نمائندگی کا اہل تر سمجھتا ہے۔ جسے وہ ووٹ دے رہا ہے لہٰذا جس شخص کی شہادت اسلام ناقابلِ قبول قرار دیتا ہے اس کو ووٹ دینے کا بھی حق نہیں پہنچتا۔ اور ایسے لوگ درج ذیل ہیں:۔

۱۔ جس پر حدِ قذف نافذ ہو چکی ہو۔ ارشاد باری ہے:۔

وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ ثُمَّ لَمْ يَاْتُوْا بِاَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ فَاجْلِدُوْهُمْ ثَمٰنِيْنَ جَلْدَةً وَّلَا تَقْبَلُوْا لَهُمْ شَهَادَةً اَبَدًا۔ (۲۴/۴)

اور جو لوگ پرہیزگار عورتوں کو بدکاری کا عیب لگائیں اور اس پر چار گواہ نہ لائیں تو ان کو اسّی دُرے مارو۔ اور کبھی ان کی شہادت قبول نہ کرو۔

۲۔ جھوٹی گواہی دینے والے لوگ جن کی جھوٹی گواہی ثابت ہو چکی ہو۔ قرآن میں مومن کی صفات سے ایک یہ بھی ہے:۔

وَالَّذِيْنَ لَا يَشْهَدُوْنَ الزُّوْرَ (۲۵/۷۲)

اور جو لوگ جھوٹی گواہی نہیں دیتے۔

جھوٹی گواہی دینا کبیرہ گناہوں سے ہے اور قابلِ تعزیر جرم بھی۔ حضرت عمرؓ جھوٹے گواہوں کا سر مونڈ کر چہرہ پر سیاہی لگا دیتے، پیٹھ پر کوڑے لگاتے اور طویل عرصے کے لیے قید کر لیا جاتا۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی نے پوچھا کبیرہ گناہ کیا کیا ہیں؟ آپ نے فرمایا:

الاشراك بالله وعقوق الوالدين وقتل النفس وشهادة الزور۔

(بخاری۔ کتاب الشهادات)

خدا تعالیٰ[۱] سے شرک کرنا، والدین[۲] کی نافرمانی، کسی[۳] کو قتل کرنا اور جھوٹی[۴] گواہی دینا۔

۳۔ فاسق کی شہادت قبول نہ کرنی چاہیئے۔ ارشادِ باری ہے:۔

يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اِذَا جَآءَكُمْ فَاسِقٌۢ بِنَبَاٍ فَتَبَيَّنُوْا (۴۹/۶)

اے مومنو! اگر کوئی بدکردار تمہارے پاس کوئی خبر لے کر آئے تو خوب تحقیق کر لیا کرو۔

انہی نصوص سے فقہاء نے درج ذیل قسم کے اشخاص کی گواہی ناقابلِ قبول قرار دی ہے۔

(۱) نماز روزے کا عمداً تارک (۲) یتیم کا مال کھانے والا (۳) زانیہ۔ زانی (۴) لواطت کا مرتکب (۵) جس پر حدِّ قذف نافذ ہو چکی ہو (۶) چور۔ ڈاکو (۷) ماں باپ کی حق تلفی کرنے والا (۸) خائن۔ خائنہ۔

اب سوال یہ رہ جاتا ہے کہ ہمارے پاس وہ کونسا معیار ہے جس سے ہم صالح اور غیر صالح کی تمیز کر سکیں۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ آپ اپنی مسجد سے رابطہ قائم فرمائیے۔ یہ مسئلہ خود بخود حل ہو جائے گا۔ وہاں سے آپ کو نماز ادا کرنے والوں، زکوٰۃ ادا کرنے والوں، چوروں، ڈاکوؤں، خائنوں اور فاسقوں سب کا پتہ چل جائے گا۔ پھر اگر کچھ غلطی رہ بھی جائے تو یہ تکلیف مالا یطاق ہے۔ اور ایک مسلمان کے لیے یہ بات کافی ہے۔

دوسری دلیل حق بالغ رائے دہی کے اثبات میں مندرجہ ذیل آیت پیش کی جاتی ہے جو آیۂ استخلاف کے نام سے مشہور ہے۔

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ (۲۴/۵۵)

اللہ نے وعدہ فرمایا ہے، تم میں سے ان لوگوں کے ساتھ جو ایمان لائیں اور نیک عمل کریں کہ وہ ان کو اسی طرح زمین میں خلیفہ بنائے گا جس طرح ان سے پہلے گزرے ہوئے لوگوں کو بنا چکا ہے۔

اس آیت کی مختلف تعبیریں مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی زبان سے سنیئے۔ ایک طرف آپ ایک سیاسی جماعت کے بانی اور جمہوریت نواز ہیں تو دوسری طرف مفسرِ قرآن۔ لہٰذا ان کی اپنی دونوں تحریروں میں یہ تضاد بہت واضح ہو گیا ہے۔

تشریح ۱۔ "خلیفہ بنانے کا وعدہ تمام مومنوں سے کیا گیا ہے۔ یہ نہیں کہا کہ ان میں سے کسی ایک کو خلیفہ بناؤں گا۔ اس سے یہ بات نکلتی ہے کہ سب مومن خلافت کے حامل ہیں۔ یہاں ہر شخص خلیفہ ہے۔ کسی شخص یا گروہ کو حق نہیں کہ عام مسلمانوں سے ان کی خلافت کو سلب کر کے خود حاکمِ مطلق بن جائے۔ یہاں جو شخص حکمران بنایا جاتا ہے اس کی اصل حقیقت یہ ہے کہ تمام مسلمان یا اصطلاحی الفاظ میں تمام خلفاء اپنی رضامندی سے اپنی خلافت کو انتظامی اغراض کے لیے اس کی ذات میں مرکوز کر دیتے ہیں جو ایک طرف خدا کے سامنے جواب دہ ہے اور دوسری طرف ان

عام خلفاء کے سامنے جنھوں نے اپنی خلافت ان کو تفویض کی ہے"۔ (اسلام کا سیاسی نظریہ)

بات سیدھی سی تھی۔ اللہ تعالیٰ بنی اسرائیل پر اپنی نعمتوں کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

وَجَعَلَ فِيكُمْ أَنْبِيَاءَ وَجَعَلَكُمْ مُلُوكًا (۵/۲۰)

اور اللہ نے تم میں سے انبیاء بھی بنائے اور تم کو بادشاہ بھی بنایا۔

اب اس آیت میں صیغہ کُمْ جمع حاضر اور ملوک بھی جمع کا لفظ ہے۔ لیکن اس آیت سے کبھی کسی نے یہ نہیں سمجھا کہ بنی اسرائیل کے جملہ افراد سارے کے سارے ہی بادشاہ تھے۔ جو اپنا حق ملوکیت کسی ایک خاص فرد کو منتقل کر دیتے تھے۔ لیکن آیت استخلاف میں مندرجہ بالا معنیٰ کر کے بالغ رائے دہی کا حق ثابت کیا جاتا ہے۔

تشریح ۲۔ اب اسی آیت مذکورہ کی تفسیر تفہیم القرآن میں اس طرح ہے :۔

" اس ارشاد سے مقصود منافقین کو متنبہ کرنا ہے کہ اللہ نے مسلمانوں کو خلافت عطا فرمانے کا جو وعدہ کیا ہے اس کے مخاطب محض مردم شماری کے مسلمان نہیں بلکہ وہ مسلمان ہیں جو صادق الایمان ہوں، اخلاق و اعمال کے اعتبار سے صالح ہوں، اللہ کے پسندیدہ دین کا اتباع کرنے والے ہوں اور ہر طرح کے شرک سے پاک ہو کر خالص اللہ کی بندگی و غلامی کے پابند ہوں۔ ان صفات سے عاری اور محض زبان سے ایمان کے مدعی لوگ نہ اس وعدے کے اہل ہیں اور نہ یہ ان سے کیا ہی گیا ہے لہٰذا وہ اس میں حصّہ دار ہونے کی توقع نہ رکھیں"۔

یہاں حق بالغ رائے دہی کو بہت حد تک مقید کر دیا گیا ہے۔

اور تیسرے مقام پر مولانا موصوف خود ہی حق بالغ رائے دہی کا فیصلہ یہ فرما رہے ہیں :۔

"حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد جب کچھ لوگوں نے حضرت علیؓ کو خلیفہ بنانا چاہا تو انھوں نے کہا :۔

"تمھیں ایسا کرنے کا اختیار نہیں ہے۔ یہ تو اہلِ شوریٰ اور اہلِ بدر کے کرنے کا کام ہے۔ جس کو اہلِ شوریٰ اور اہلِ بدر چاہیں گے۔ وہی خلیفہ ہوگا۔ پس ہم جمع ہوں گے اور اس معاملے پر غور کریں گے"۔ (خلافت و ملوکیت صـ۸۶ بحوالہ ابن قتیبہ : الامامۃ والسیاسۃ ج ۱ ص ۴۱)

" اسلام کا نظریہ سیاسی" کے مطابق تو ہر بالغ مسلمان ووٹ کا حق دار ہے جب کہ تفہیم القرآن کے مطابق ووٹ دینے کا اہل صرف نیک، صالح اور متقی مسلمان ہو سکتا ہے۔

اب خلافت و ملوکیت کے مطابق حضرت علیؓ کی اپنی وضاحت یہ ہے کہ انتخاب صرف اہلِ بدر اور اہلِ شوریٰ کا کام ہے۔

بالفاظِ دیگر نیک اور متقی لوگوں میں سے بھی چند افضل ترین افراد (جیسے اعیانِ ملت یا اربابِ حل وعقد کہا جاتا ہے) ہی انتخابی مہم میں حصّہ لیتے ہیں۔ اور یہی بات حق ہے کہ بالغ رائے دہی کے حق کا عام تصور عقل اور شرع دونوں کے خلاف ہے۔ کسی لامذہب سیاست میں تو اسے قبول کیا جا سکتا ہے لیکن اسلامی نظام میں ایسے بے ہودہ نظریات کے لیے کوئی گنجائش نہیں۔

عورت کا ووٹ اور سیاسی حقوق

مغربی طرزِ انتخاب کے ثمرات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اس نے عورت کو بھی اس میدان لا گھسیڑا ہے اور پھر مساوات مرد وزن کے نعرہ کی بدولت وہ ووٹر بھی ہے۔ ممبر اسمبلی بھی بن سکتی ہے۔ صدر بھی بن سکتی ہے اور دوسری کلیدی سامیوں پر بھی فائز ہو سکتی ہے۔ عہدِ نبوی سے لے کر خلافتِ راشدہ کی پوری تاریخ پڑھ جائیے آپ کو کوئی ایسی مثال نہ مل سکے گی کہ عورت نے ووٹ دیا ہو یا مجلسِ شوریٰ کی ممبر ہو یا کوئی کلیدی اسامی اس کے سپرد کی گئی ہو یا میدانِ امارت و سیاست میں اس کا کسی قسم کا عمل دخل ہو[۱]۔ قرآن میں بھی عورتوں کی بیعت کا ذکر ہے۔ اور بخاری

---

[۱] **حضرت عائشہؓ اور جنگِ جمل** خلافتِ راشدہ کے چالیس سالہ دور میں ہمیں صرف ایک مثال ایسی ملتی ہے جہاں میدانِ سیاست میں کسی عورت نے حصّہ لیا ہو اور وہ اُمّ المومنین حضرت عائشہؓ کی جنگِ جمل میں شمولیت اور قیادت ہے جنھوں نے شہادتِ عثمانؓ اور قصاص کے جذبہ شدید کی وجہ سے جنگ میں شمولیت اختیار کی۔ تو حضرت علیؓ نے اس اقدام کے متعلق انھیں لکھا کہ:

فانك خرجت غاضبةً لله ولرسوله تطلبين امرا كان عليك موضوعًا مابال النسوة والحرب واصلاح بين الناس۔ (الامامة والسياسة لابن قتيبة ص ۷۰)

"آپ اللہ اور رسول (کے احکام۔ قصاص) کے لیے غضبناک ہو کر ایک ایسے معاملہ

(باقی اگلے صفحہ پر)

کتاب الاحکام اور اسی طرح دوسری احادیث کی کتابوں میں بھی۔ ان احادیث میں انہی اُمور پر بیعت کا ذکر ہے۔ جن کا ذکر قرآن کریم نے کر دیا ہے :۔

يَآاَيُّهَا النَّبِيُّ اِذَا جَآءَكَ الْمُؤْمِنٰتُ يُبَايِعْنَكَ عَلٰٓى اَنْ لَّا يُشْرِكْنَ بِاللّٰهِ شَيْئًا وَّلَا يَسْرِقْنَ وَلَا يَزْنِيْنَ وَلَا يَقْتُلْنَ اَوْلَادَهُنَّ وَلَا يَاْتِيْنَ بِبُهْتَانٍ يَّفْتَرِيْنَهٗ بَيْنَ اَيْدِيْهِنَّ وَاَرْجُلِهِنَّ وَلَا يَعْصِيْنَكَ فِيْ مَعْرُوْفٍ فَبَايِعْهُنَّ وَاسْتَغْفِرْ لَهُنَّ اللّٰهَ۔ (۶۰/۱۲)

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) کے لیے نکلی ہیں جس کی ذمہ داری سے آپ سبکدوش تھیں بھلا عورتوں کا جنگ اور لوگوں میں مصالحت سے کیا تعلق ہے؟

اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ۔ جو اس جنگ جمل میں غیر جانبدار تھے اور جنھیں حضور اکرمؐ نے "نیک بخت آدمی" (بخاری کتاب المناقب) فرمایا تھا ۔ کی حضرت عائشہؓ کی جنگ میں شمولیت کے متعلق یہ رائے تھی ۔

ان بيت عائشة خير لها من هودجها (الامامة والسياسة لابن قتيبة ص۶۱)

"حضرت عائشہؓ کا گھران کے لیے ہودج سے بہتر ہے۔"

خود حضرت عائشہؓ کا اپنا خیال اس باب میں کیا تھا۔ عبداللہ بن احمد بن حنبل نے زوائد الزھد میں، اور ابن المنذر، ابن ابی شیبہ اور ابن سعد نے اپنی کتابوں میں مسروق کی روایت نقل کی ہے کہ حضرت عائشہؓ جب تلاوتِ قرآن کرتے ہوئے اس آیت (وَقَرْنَ فِيْ بُيُوْتِكُنَّ) پر پہنچتی تھیں تو بے اختیار رو پڑتی تھیں یہاں تک کہ ان کا دوپٹہ بھیگ جاتا تھا۔ کیونکہ اس پر انھیں اپنی وہ غلطی یاد آجاتی تھی جو ان سے جنگِ جمل میں ہوئی تھی۔ (تفہیم القرآن۔ ج ۴ ص۹۱)

ان روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ :۔

۱۔ حضرت عائشہؓ کی جنگ میں شمولیت کی اصل وجہ حضرت عثمانؓ کا قصاص تھا نہ کہ سیاسی معاملات میں دلچسپی اور عمل دخل۔ اگر قانون شرعی کے مطابق قصاص کا مسئلہ طے ہو جاتا تو انھیں شمولیت سے کوئی غرض نہ تھی۔ جیسا کہ اس موقع پر صلح کی بات چیت سے بھی ثابت ہوتا ہے۔ حضرت عائشہؓ کے نزدیک اس معاملہ کی نوعیت سیاسی ہرگز نہ تھی۔

۲۔ ان حالات میں بھی اکابر صحابہؓ نے حضرت عائشہؓ کی شمولیت کو مناسب نہیں سمجھا اور جب بعد میں ان کی ندامت بھی ثابت ہے تو اس واقعہ سے استدلال قطعاً درست نہ رہا۔

اے پیغمبرؐ! جب تمہارے پاس عورتیں اس بات پر بیعت کرنے کو آئیں کہ خدا کے ساتھ نہ تو شرک کریں گی، نہ چوری کریں گی نہ بدکاری کریں گی، نہ اپنی اولاد کو قتل کریں گی اور نہ اپنے ہاتھ پاؤں میں کوئی بہتان باندھ لائیں گی (یعنی جو بچہ ان کا نہ ہو اس کو اپنے خاوندوں سے منسوب نہ کریں گی) نہ نیک کاموں میں تمہاری نافرمانی کریں گی تو ان کی بیعت لے لو اور ان کے لیے خدا سے بخشش مانگو۔

مساوات مرد و زن | اسلام مساوات مرد و زن کا ہرگز قائل نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے عورت کی شہادت کو مکمل نہیں بلکہ نصف قرار دیا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:۔

وَاسْتَشْهِدُوا شَهِيدَيْنِ مِن رِّجَالِكُمْ ۖ فَإِن لَّمْ يَكُونَا رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَامْرَأَتَانِ مِمَّن تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَاءِ (۲/۲۸۲)

اور اپنے میں سے دو مردوں کو گواہ بنا لیا کرو۔ اور اگر دو مرد نہ ہوں تو ایک مرد اور دو عورتیں جن کو تم گواہ بنانا پسند کرو۔

صرف یہی نہیں بلکہ میراث میں بھی عورت کا حصہ مرد سے نصف ہے اور عبادت میں بھی عورت مرد کے برابر نہیں حیض و نفاس کے ایام میں عورت سے نماز ساقط ہو جاتی ہے۔ انہی وجوہ کی بنا پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عورت کو "ناقص العقل والدین" کہا ہے۔

اور امارت و سیاست کے معاملات میں تو عورت کی شمولیت کو اسلام نے ہرگز پسند نہیں کیا۔ نہ ہی خلفائے راشدین کے انتخاب میں عورت کے ووٹ کی کوئی مثال ملتی ہے[۱۵]۔ وجہ یہ

---

[۱۵] حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف نے خلافت عثمان کے تقرر کے سلسلہ میں بعض پردہ نشین عورتوں سے بھی مشورہ کیا تھا۔ اس واقعہ سے عورت کا حق رائے دہی ثابت کیا جاتا ہے جو دو وجہ سے غلط ہے:۔

۱۔ مشورہ ان کے گھر پر لیا گیا، پردہ کی حدود و قیود کو توڑا نہیں گیا۔ نہ انھیں خود کہیں جا کر مشورہ سے مطلع کرنے کو کہا گیا۔

۲۔ صرف ان عورتوں سے مشورہ کیا گیا جنھیں اس کا اہل سمجھا گیا۔

رہا صاحب الرائے عورتوں کے مشورہ سے استفادہ کا معاملہ تو اس پر کوئی پابندی نہیں۔ اکابر صحابہؓ حضرت عائشہؓ سے مسائل پوچھتے اور مشورہ لیا کرتے تھے۔

ہے کہ نہ تو عورت کی جسمانی ساخت اور فطری صلاحیت ایسی ہے کہ امارت و سیاست جیسے معاملات میں وہ حصہ لے اور اسلام امیر کے لیے جن شرائط کی پابندی لگاتا ہے ان پر پوری اتر سکے اور نہ ہی اسلام ایسی بے حیائی اور مرد و عورت کے آزادانہ اختلاط کی اجازت دیتا ہے جس کے بغیر ایسے امور میں حصہ لینا ناممکن ہے۔ نیز ایسی صورت میں عائلی نظام بھی تباہ ہو کر رہ جاتا ہے جو اسلامی نقطۂ نگاہ سے بہت اہمیت کا حامل ہے۔ جب اہلِ ایران نے بنت کسریٰ (پوران، نوشیرواں کی پوتی اور شیرویہ کی بہن) کو اپنا بادشاہ بنالیا۔ یہ خبر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو پہنچی تو آپؐ نے سخت ناپسندیدگی کا اظہار کیا اور فرمایا :-

كيف يفلح قوم وّلّوا امرهم امراةٌ (بخاری۔کتاب المغازی)

وہ قوم کیسے فلاح پا سکتی ہے جس نے اپنا سربراہ ایک عورت کو بنالیا ہے۔

ایک اسلامی معاشرے میں ایسے امُور کا عورتوں کے ہاتھ میں چلے جانا کوئی اچھی علامت نہیں ہوتی۔ درج ذیل حدیث اس پہلو پر پوری روشنی ڈالتی ہے۔

عن ابی هریرة قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم : اذا کان اُمراء کم خیارکم واغنیاءُکم سمحاءُکم واُمورُکم شوریٰ بینکم فظهر الارض خیرٌ لکم من بطنها واذا کان امراءکم شرارکم و اغنیاءُکم بخلاءُکم وامورکم الی نساءِکُم فبطن الارض خیرٌ من ظهرِها۔ (ترمذی بحواله مشکوٰة باب تغیر الناس)

حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب تمہارے حکمران اچھے لوگ ہوں اور تمہارے دولتمند سخی ہوں اور تمہارے معاملات باہمی مشورہ سے طے ہوں تو تمہارے لیے زندگی موت سے بہتر ہے اور جب تمہارے حکمران بدکردار ہوں اور دولتمند بخیل ہوں اور تمہارے معاملات بیگمات کے حوالے ہوں تو تمہاری موت زندگی سے بہتر ہے۔

اسلامی نقطۂ نظر سے عورت کا مقام

ہو سکتا ہے ہمارا نوجوان طبقہ اور موجودہ دور کی "مہذب" عورتیں ان احکام و ارشادات سے یہ تاثر لیں کہ اہلِ مغرب نے عورت کو جو حقوق عطا کیے ہیں وہ اسلام کے عطا کردہ حقوق سے کہیں زیادہ ہیں۔ لہٰذا ہم یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ مغرب نے عورت کو کس طرح کے حقوق بخشے ہیں اور اسلام نے کیسے؟

مغرب نے عورت کو آزادی اور مساوات کے نام پر جو حقوق دیے ہیں وہ انھوں نے عورت کو پہلے مرد بنا کر عطا کئے ہیں۔ اسے ملازمتوں اور کھیلوں، مقابلۂ حُسن اور دوسری تفریحات کے بہانہ گھر سے نکال کر بازار میں لا کھڑا کیا تو مردوں نے اس سے اپنی جنسی ہوس کی تکمیل کی۔ فحاشی اور بے حیائی عام ہوئی۔ اور جب عورت اپنی جوانی کی عمر سے گزر کر اپنی رعنائی کھو بیٹھتی ہے تو اس کی حالت قابلِ رحم ہوتی ہے۔ مگر کوئی اس کا پُرسانِ حال نہیں ہوتا اور بڑھاپے کے ایام اپنی اولاد کی یاد اور تڑپ میں سسکیاں بھر کر گزار دیتی ہے جب کہ اس کی اولاد —— اسی کی طرح —— اپنی رنگ رلیوں میں مصروف ہوتی ہے اور اس بوڑھی کھوسٹ کی آرزوؤں کو اپنی عیش و طرب میں مداخلت تصوّر کر کے اسے دھتکار دیتی ہے۔ ایسے بے شمار واقعات مغربی دُنیا کے جرائد میں آئے دن چھپتے رہتے ہیں۔

اسلام نے عورت اور مرد کے دائرۂ کار الگ الگ مقرر کیے ہیں۔ اور ایک کے دائرہ میں دوسرے کی مداخلت برداشت نہیں کرتا۔ عورت کی فطری ساخت اور طبیعت اسی بات کا تقاضا کرتی ہے کہ وہ معاشی اور سیاسی اُلجھنوں سے آزاد ہو کر بال بچوں کی نہایت اطمینان سے تربیت کرے اور گھر کے اندر کا پورا انتظام سنبھالے اور نہایت باوقار طریقے سے اپنے گھر میں خود مختار بن کر اپنی اولاد کی بہتر سے بہتر تربیت کرے۔ مرد کے دائرۂ کار میں اس کی مداخلت کو اسی لیے ناپسند کیا گیا ہے [1] اس پہلو کو مستثنیٰ کرنے کے بعد کہیں تو عورت کا درجہ

---

[1] مغربی تہذیب مذہب سے بیزاری اور لادینیت کے نتیجہ میں معرضِ وجود میں آئی۔ موجودہ دَور کا مہذب انسان اپنے مسائل خدا کی ہدایت سے بے نیاز ہو کر حل کرنے پر مُصر ہے۔ انہی مسائل میں سے ایک شادی کا مسئلہ بھی ہے۔ "مساواتِ مرد و زن اور عورت کی آزادی" کے نعروں کی مقبولیت کے بعد۔ عورت کی آزادی سے یہ مطلب لیا جانے لگا ہے کہ وہ اپنے گھر کو خیر باد کہہ کر ہر شعبہ میں مرد کے دوش بدوش کام کرے۔ اب عورت مرد کے ساتھ صرف صنفی حد تک منسلک رہ گئی ہے۔ گھر کے کام کاج اور بچوں کی تربیت سے اس نے خلاصی حاصل کر لی ہے۔ معاشی طور پر بھی اب وہ مرد کے زیر بار نہیں۔ جب دونوں میں سے کسی ایک کا دوسرے سے جی بھر جاتا ہے تو نئے ازدواجی تجربے شروع کرنے لگتے ہیں۔ اس طرح نکاح کا یہ بندھن جسے مقدس اور مذہبی فریضہ سمجھ کر زندگی بھر اس سے نباہنے کی کوشش کی جاتی تھی۔ محض ایک ذاتی فعل سمجھا جاتا ہے۔ (باقی اگلے صفحہ پر)

مرد کے بالکل برابر قرار دیا گیا ہے جیسے کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے۔

وَمَنۡ يَّعۡمَلۡ مِنَ الصّٰلِحٰتِ مِنۡ ذَكَرٍ اَوۡ اُنۡثٰى وَهُوَ مُؤۡمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ يَدۡخُلُوۡنَ الۡجَنَّةَ وَلَا يُظۡلَمُوۡنَ نَقِيۡرًا (۴/۱۲۴)

(بقیہ حاشیہ)

عورت کو مساویانہ حقوق اور آزادی دینے کے بعد مغربی ممالک بے شمار خاندانی مسائل سے دوچار ہو چکے ہیں۔ خاندانی زندگی کا شیرازہ بکھر رہا ہے۔ اکثر بچے نرسریوں اور سکولوں میں پلتے ہیں۔ ماں کی ممتا، باپ کی شفقت اور خاندانی برکات سے محروم رہتے ہیں۔ مشرقی ممالک جوں جوں مغربی تہذیب کا اثر قبول کر رہے ہیں وہ بھی ایسے ہی مسائل سے دوچار ہو رہے ہیں۔ اس "جدید خاندان" کا سب سے بڑا مسئلہ اسکی ناپائیداری اور طلاقوں کی بھرمار ہے اور بہت کم شادیاں صحیح معنوں میں کامیاب قرار دی جاسکتی ہیں۔ عائلی نظام کی ناپائیداری کے باعث بہت سے دیگر ذیلی مسائل پیدا ہو گئے ہیں مثلاً:

(۱) طلاقوں کی کثرت (۲) میاں بیوی میں اکثر ناچاقی رہنا (۳) بچوں سے عدم توجہی اور غفلت۔

(۴) نافرمان اولاد (۵) میاں بیوی دونوں کا گھریلو ذمہ داریوں کو ادا کرنے سے گریز کرنا وغیرہ۔

ایسی صورتِ حال کی وجہ سے ہی سیاسیات کے مفکرین میں اس بات پر اختلافِ رائے ہے کہ خواتین کو حقِ رائے دہی ملنا چاہیئے یا نہیں۔ دُنیا کے بعض متمدن ترین ممالک میں بیسویں صدی کے ربع اوّل تک عورتوں کو حقِ رائے دہی نہیں ملا تھا۔ انگلستان میں یہ حق ۱۹۲۸ء میں، فرانس میں ۱۹۴۶ء میں اور ریاستہائے متحدہ امریکہ میں ۱۹۶۴ء میں عورتوں کو یہ حق دیا گیا۔ سوئٹزرلینڈ میں جو کہ دنیا کی متمدن ترین اوّل درجے کی جمہوری ریاست شمار ہوتی ہے ابھی تک خواتین کو حقِ رائے دہی نہیں دیا گیا۔ وجہ یہ ہے کہ خواتین کا چونکہ دائرۂ کار الگ ہے اس لیے انھیں ملکی سیاسیات کی خارزار وادیوں میں گھسیٹ لانا مناسب نہیں سمجھا گیا۔ اب بھی جو یہ حق عورتوں کو عطا ہوا ہے تو اس کے پیچھے دراصل مرد و زن کی ظاہری مساوات کا وہ مغربی تصور ہے جس کے مطابق خواتین کے قدرتی فرائض اور ان کی گھریلو ذمہ داریوں کو یکسر نظر انداز کر دیا گیا ہے۔

حقیقی مساوات: مساوات کا کبھی یہ مطلب نہیں لیا جاتا کہ ہر شخص ایک ہی جیسا معیارِ زندگی رکھتا ہو اور ایک ہی پیشہ اختیار کیے ہوئے ہو۔ جس طرح ایک ڈاکٹر اور ایک انجینئر بالکل الگ الگ نوعیت کے فرائض ادا کرنے کے باوجود مساوی مرتبہ کے انسان ہی رہتے ہیں اسی طرح اگر عورت اپنے مخصوص دائرۂ کار میں اپنے گھریلو فرائض اچھے طریقے سے سرانجام دے رہی ہے تو وہ بھی مساوی انسانی مرتبہ سے گر نہیں جاتی۔

ترجمہ:۔ اور جو نیک کام کرے گا مرد ہو یا عورت اور وہ صاحبِ ایمان ہوگا تو ایسے لوگ بہشت میں داخل ہوں گے اور ان کی تل برابر بھی حق تلفی نہ ہوگی۔

اور کہیں عورت کا درجہ مرد سے بہت زیادہ بلند قرار دیا گیا۔ ارشادِ نبوی ہے:۔

عن ابی هریرة قال جاء رجل الی رسول الله صلی الله علیه وسلم فقال یارسول الله! من احق بحسن صحابتی؟ قال "امك" قال ثم من؟ قال "امك" قال ثم من؟ قال "امك" قال ثم من؟ قال "ابوك"۔ (بخاری کتاب الادب)

ابو ہریرہؓ کہتے ہیں۔ ایک آدمی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور کہا۔ یارسولؐ اللہ! میرے بہتر سلوک کا سب سے زیادہ حق دار کون ہے؟ فرمایا "تیری ماں" وہ کہنے لگا۔ اس کے بعد۔ فرمایا "تیری ماں"۔ پھر کہنے لگا۔ اس کے بعد۔ فرمایا "تیری ماں" پھر کہنے لگا اس کے بعد؟ فرمایا "تیرا باپ"۔

دوسرے مقام پر فرمایا:۔

عن المغیرة عن النبی صلی الله علیه وسلم قال: انّ الله حرم علیکم عقوق الامهات۔ (بخاری حواله مذکوره)

حضرت مغیرہؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "اللہ تعالیٰ نے تم پر ماؤں کی نافرمانی کو حرام کیا ہے"۔

کہیں آپؐ نے یوں فرمایا کہ "ماؤں کے قدموں میں جنت ہے"۔ (ترغیب ترہیب) اور کہیں فرمایا کہ "لڑکیوں کی تربیت انسان کو دوزخ کے عذاب سے بچا لے گی" (بخاری) تو یہ ہیں عورت کے وہ حقوق جو اسے معاشرہ میں بلند مقام عطا کرتے ہیں۔

ایک دفعہ آپ نے فرمایا "تف ہے اس شخص پر جو اپنے بوڑھے ماں باپ کی خدمت کر کے جنت حاصل نہیں کرتا (بخاری) گویا جس وقت عورت بوڑھی ہو، اہلِ مغرب کے معاشرہ میں ناکارہ اور ناقابلِ التفات چیز ہوتی ہے، اس وقت اسلام اسے وہ مقام عطا کرتا ہے جو معاشرہ میں بلند تر ہوتا ہے۔

۵۔ طلبِ امارت اور اس کی آرزو

ہم "خلافتِ ابوبکرؓ کا پس منظر" کے عنوان کے تحت "امتناع طلبِ امارت" کی سرخی میں متعدد

مستند احادیث درج کر آئے ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ امارت طلب کرنے والوں کو حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ کہہ کر انکار کر دیا تھا کہ "خدا کی قسم ہم ایسے لوگوں کو کرسی نہیں دیتے جو اس کو طلب کرتے ہیں"۔ آپ نے اس کی آرزو رکھنے والوں کی بھی مذمت فرمائی ہے۔

اس کی کئی وجوہ آپ نے بیان فرمائی ہیں مثلاً :۔

پہلی یہ کہ" انسان کی دولت اور مرتبے [1] سے محبت اس کے دین میں اس چیز سے زیادہ تباہ کر ڈالتی ہے جیسے دو بھوکے بھیڑیے کسی بکریوں کے ریوڑ میں پڑ کر تباہی مچا سکتے ہیں"۔

دوسری یہ کہ : "امارت جب تک رہے تو امیر سمجھتا ہے کہ خوب مزے ہیں لیکن اس کا انجام بُرا ہوتا ہے"۔

تیسری یہ کہ : "امارت ایک عظیم ذمہ داری ہے اور قیامت کے دن ذلت اور ندامت کا باعث بنے گی۔ اِلاّ یہ کہ کسی نے اس کی ذمہ داریوں کا پُورا پُورا حق ادا کر دیا ہو"۔

اب ہم ان ارشادات کے تحت خلفائے راشدین کا تعامل دیکھیں تو حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ اور حضرت حسنؓ سے کسی نے بھی امارت کی خواہش نہیں کی۔ حضرت علیؓ نے جس وقت اس کی خواہش کی اس وقت انھیں ملی نہیں اور جب وہ خلافت قبول کرنے پر تیار نہ تھے تب یہ انھیں سونپ دی گئی۔

حضرت ابوبکرؓ نے بیعتِ عام کے بعد مسجدِ نبوی میں جو پہلی تقریر فرمائی۔ اس میں امارت کی ذمہ داریوں کا بوجھ محسوس کر کے اسے ناپسند فرمایا :

> "مَیں آپ لوگوں پر حکمران بنایا گیا ہوں۔ حالانکہ مَیں آپ کا سب سے بہتر آدمی نہیں ہوں۔ اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے۔ مَیں نے یہ منصب اپنی رغبت اور خواہش سے نہیں لیا ہے۔ نہ یہ مَیں چاہتا تھا کہ کسی دوسرے کی بجائے یہ مجھے ملے۔ نہ مَیں نے کبھی خدا سے اس کے لیے دُعا کی۔ نہ میرے دل میں کبھی اس کی حرص پیدا ہوئی۔ مَیں نے تو اسے بادلِ ناخواستہ اس لیے قبول کیا ہے کہ مجھے مسلمانوں میں فتنۂ اختلاف اور عرب میں فتنۂ ارتداد برپا ہو جانے کا اندیشہ تھا۔ میرے لیے اس منصب میں کوئی راحت نہیں ہے بلکہ یہ ایک بارِ عظیم ہے جو مجھ پر ڈال دیا گیا ہے"۔

---

[1] طلب جاہ کا امام فرعون اور طلب مال کا امام قارون تھا۔

جس کے اُٹھانے کی طاقت مجھ میں نہیں ہے۔ اِلّا یہ کہ اللہ ہی میری مدد فرمائے۔ میں یہ چاہتا تھا کہ میرے بجائے کوئی اور یہ بار اُٹھائے۔ اب بھی اگر آپ لوگ چاہیں تو اصحابِ رسول میں سے کسی اور کو اس کام کے لیے چن لیں۔ میری بیعت آپ کے راستے میں حائل نہ ہوگی ......" (السیرۃ النبویہ ج ۴ ص ۴۹۳، کنزالعمال ج ۵ احادیث نمبر ۲۲۶۱، ۶۴، ۶۸، ۷۸، ۹۱، ۲۲۹۹)

اور حضرت عمرؓ یہ فرمایا کرتے تھے۔ جب یومِ فتح خیبر سے پہلی شام جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا کہ میں کل صبح اس مستحق کو جھنڈا دوں گا جس کے ہاتھوں خیبر فتح ہوگا" اس رات بہت سے صحابہ کبار کو یہ آرزو تھی کہ شاید کل اسے ہی یہ جھنڈا مل جائے اور یہ جھنڈا حضرت علیؓ کے نصیب میں تھا۔ حضرت عمرؓ کہتے ہیں کہ" بس اس ایک دن کے علاوہ مجھے کبھی امارت کی خواہش نہیں ہوئی (بخاری۔ کتاب المغازی، باب غزوہ خیبر)۔

اور جب آپ سے ان کے بیٹے عبداللہ بن عمرؓ کو خلیفہ نامزد کرنے کو کہا گیا تو آپ نے فرمایا:

" ہمیں تمہارے معاملات کی کوئی خواہش نہیں۔ اگر یہ خلافت اچھی چیز تھی تو اس کا مزہ ہم نے چکھ لیا اور اگر یہ بُری چیز تھی تو عمر کے خاندان کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ کل کو خدا کے سامنے ان میں سے صرف ایک آدمی سے ہی حساب لیا جائے۔
(بخاری۔ باب الاستخلاف)

طلب امارت کے دلائل

ان تصریحات کے بعد ایک مسلمان کے لیے تو اعتراض کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ لیکن جمہوریت پرستوں نے یہاں بھی بہت سی جولانیاں دکھائی ہیں اور مندرجہ ذیل آیات سے طلبِ امارت کی درخواست یا آرزو ثابت کی ہے:

پہلی دلیل | حضرت یوسف علیہ السلام کی عزیزِ مصر سے درخواست۔
قَالَ اجْعَلْنِي عَلَى خَزَآئِنِ الْاَرْضِ۔ اِنِّيْ حَفِيْظٌ عَلِيْمٌ۔ (۱۲/۵۵)

ترجمہ: یوسفؑ نے بادشاہ مصر سے کہا: اس ملک کے خزانوں پر مجھے مقرر کر دو کیونکہ میں حفاظت بھی کر سکتا ہوں اور اس کام سے واقف بھی ہوں۔

حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ طلبِ عہدہ کی درخواست نہیں تھی - اقتدار توانھیں پہلے سے بن مانگے ہی مل چکا تھا - اس سے پہلی آیت اس طرح ہے :

قَالَ الْمَلِكُ ائْتُونِي بِهِ أَسْتَخْلِصْهُ لِنَفْسِي فَلَمَّا كَلَّمَهُ قَالَ إِنَّكَ الْيَوْمَ لَدَيْنَا مَكِينٌ أَمِينٌ (۱۲/۵۴)

بادشاہ نے کہا - یوسف کو میرے پاس لاؤ تاکہ میں اسے اپنے لیے مخصوص کرلوں - جب یوسفؑ نے اس سے گفتگو کی تو کہنے لگا - آج سے آپ ہمارے نزدیک قدر و منزلت رکھتے ہیں -

حضرت یوسف علیہ السلام کی قال اجعلنی علیٰ خزائن الارض کہنے سے مُراد وزارت مالیات کی درخواست نہیں تھی بلکہ آپ نے مکمل اقتدار کا مطالبہ کیا تھا جو حالات کی نزاکت کے پیشِ نظر فرعون کو ماننا پڑا - جس کے بعد فرعونِ مصر کی بادشاہت ختم ہو کر رہ گئی - چنانچہ اس سے اگلی آیت یوں ہے :-

وَكَذَٰلِكَ مَكَّنَّا لِيُوسُفَ فِي الْأَرْضِ يَتَبَوَّأُ مِنْهَا حَيْثُ يَشَاءُ (۱۲/۵۶)

اسی طرح ہم نے اس سرزمین میں یوسف کو اقتدار بخشا - وہ مختار تھا کہ اس میں جہاں چاہے اپنی جگہ بنائے -

چنانچہ اس تبدیلیٔ اقتدار کے بعد قرآن نے پہلے فرعونِ مصر کو کبھی مَلِک کے لفظ سے یاد نہیں کیا - ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کی ہستی ہی ختم ہو چکی تھی - اس واقعہ کے بعد مَلِک کا لفظ حضرت یوسف علیہ السلام کے لیے استعمال ہوا ہے -

پھر یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ کیا ایک نبی یہ گوارا کر سکتا ہے کہ ایک کافرانہ حکومت کا کل پرزہ بن کر اس کی چاکری گوارا کرے - اگر حضرت یوسف علیہ السلام کو ایسی ملازمت کی خواہش ہوتی تو اس طرح کے موقعے تو وہ اس سے پہلے بھی پیدا کر سکتے تھے - اتنی مدت قید و بند کی سختیاں کیوں جھیلیں ؟

دوسری دلیل | دوسری آیت جس سے طلبِ امارت کا جواز پیش کیا جاتا ہے وہ یہ دُعا ہے جو مسلمانوں کو سکھلائی گئی ہے :-

وَاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِينَ إِمَامًا (۲۵/۷۴)

اے خدا تو ہمیں متقین کا امام بنا دے -

کہا یہ جاتا ہے کہ "متقین کی امامت اسلامی مملکت میں ایک بلند ترین منصب ہے جب

دُعا کے ذریعے اس کی خواہش کی جاسکتی ہے تو دوسرے مناصب کو کس طرح شجرِ ممنوعہ قرار دیا جاسکتا ہے۔"

اس کا جواب ہم اپنی طرف سے نہیں دیتے بلکہ تفہیم القرآن کے حاشیہ پر ہی اکتفا کریں گے۔

"یعنی ہم تقویٰ اور طاعت میں سب سے بڑھ جائیں۔ بھلائی اور نیکی میں سب سے آگے نکل جائیں۔ محض نیک ہی نہ ہوں بلکہ نیکوں کے پیشوا ہوں اور ہماری بدولت دُنیا بھر میں نیکی پھیلے۔ اس چیز کا ذکر بھی یہاں دراصل یہ بتانے کے لیے کیا گیا ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں جو مال و دولت اور شوکت و حشمت میں نہیں بلکہ نیکی و پرہیزگاری میں ایک دوسرے سے بڑھ جانے کی کوشش کرتے ہیں مگر ہمارے زمانے میں کچھ اللہ کے بندے ایسے ہیں جنھوں نے اس آیت کو بھی امامت کی اُمیدواری اور ریاست کی طلب کے لیے دلیلِ جواز کے طور پر استعمال کیا ہے۔ ان کے نزدیک اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ "یا اللہ، متقی لوگوں کو ہماری رعیت اور ہم کو ان کا حکمران بنا دے"۔ اس سخن فہمی کی داد "اُمیدواروں" کے سوا اور کون دے سکتا ہے؟

بعض دوسرے لوگ اس آیت سے یہ استدلال کرتے ہیں کہ مملکت کے تمام حکام کا متقی ہونا ضروری ہے۔ اور امیر یا سربراہ تو بہت ہی زیادہ متقی ہونا چاہیئے۔ گویا یہ آیت امارت کی اہلیتوں میں سے ایک اہم اہلیت پر دلالت کرتی ہے۔"

تیسری دلیل

تیسری آیت جس سے استدلال کیا جاتا ہے وہ یوں ہے:۔

وَاجْعَلْ لِّي مِنْ لَّدُنْكَ سُلْطٰنًا نَّصِيْرًا۔ (۱۷/۸)

اور اپنی طرف سے ایک اقتدار کو میرا مددگار بنا دے۔

حقیقت یہ ہے کہ اسلام دنیا میں جو اصلاح چاہتا ہے وہ صرف وعظ و تذکیر سے ناممکن ہے۔ اس کے لیے سیاسی اقتدار کے حصول سے کیسے انکار ہو سکتا ہے اور اسلام کی سربلندی، اقامتِ دین، نفاذ شریعت اور حدود اللہ کے اجرا کے لیے سیاسی اقتدار کے حصول کی خواہش رکھنا جائز ہی نہیں عین مطلوب ہے اور اسی لیے اللہ نے خود یہ دُعا حضور کو سکھائی۔

یہ آیت سورۂ بنی اسرائیل کی ہے جو مکّی دَور کے آخر میں نازل ہوئی۔ جبکہ اسلام ابھی کمزور تھا اور اسلامی ریاست قائم نہیں ہوئی تھی۔ مکّی دَور میں ہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دعا بھی فرمائی تھی "اے اللہ ہر دو عمر میں سے (عمر بن الخطاب اور عمر بن الحکم یعنی ابو جہل) کسی ایک عمر کو

مسلمان کر کے اسلام کی مدد فرما"۔ چنانچہ آپ کی یہ دُعا قبول ہوئی۔ اسی طرح آیت کا مفہوم واضح ہے کہ یا تو خود مجھے اقتدار عطا کر یا کسی حکومت کو میرا مددگار بنا دے تاکہ اسلام سربلند ہو سکے۔ اور اگر یہی خواہش جاہ طلبی اور مفاد پرستی پر مبنی ہو تو گناہ بن جاتی ہے جیسا کہ بے شمار احادیث سے ثابت ہے۔ جن کا ذکر پہلے گزر چکا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ مندرجہ بالا آیات سے جو طلب عہدہ کی درخواست کا جواز ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہ حضرت علیؓ کے اس قول سے مناسبت رکھتی ہے جو آپ نے "تحکیم قرآن" کے سلسلہ میں خوارج کے متعلق کہی۔ آپ نے فرمایا تھا۔ کلمۃ الحقّ ارید بہ الباطل یعنی بات سچی ہے لیکن اسے غلط معنی پہنائے جا رہے ہیں۔

طلب عہدہ سے متعلق احادیث پر اعتراض

ہمارے جمہوریت نواز دوستوں نے یہ انکشاف بھی فرمایا ہے کہ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جس جس مقام پر بھی طلب عہدہ سے منع کیا ہے تو اس کی وجہ یہ تھی کہ آپؐ اس شخص کو کسی نہ کسی سبب سے اس کا اہل نہ سمجھتے تھے۔ مثال کے طور پر صرف ایک حدیث پیش کرتے ہیں جو یہ ہے:۔

یا اباذرّ انك ضعيف وانها امانة وانها يوم القيمة خزيٌ و ندامةٌ الامن اخذ بحقها وادى الذى عليه (مسلم کتاب الامارۃ)

اے ابوذر! تو ایک ضعیف آدمی ہے اور امارت ایک امانت ہے۔ جو قیامت کو رسوائی اور ندامت کا باعث ہوگی۔ مگر جس نے اس کی ذمہ داریوں کو پوری طرح نبھایا۔ اور اس کے سب حقوق ادا کیے۔

ساتھ ہی ساتھ یہ ارشاد بھی فرماتے ہیں کہ ایسی احادیث جن میں طلب عہدہ سے منع کیا گیا ہے خبرِ واحد ہیں۔ اور خبرِ واحد کی بنا پر قرآنی آیات واحکام کو مقید نہیں کیا جا سکتا۔ یا اگر تعارض پیدا ہو تو نصِ قرآنی کے مقابلہ میں خبرِ واحد کا ترکِ اولیٰ ہے۔

امتناعِ طلبِ امارت کے متعلق بے شمار صحیح احادیث موجود ہیں۔ ان میں سے نہایت اختصار کے ساتھ ہم نے صرف پانچ احادیث درج کی ہیں۔ انھیں ایک بار پھر پڑھ لیجئے کہ ان احادیث میں سائل کی کون کون سی کمزوری کا ذکر ہے۔ نیز یہ بھی ملاحظہ فرمائیے کہ ان احادیث میں جاہ طلبی، اس کی خواہش اور درخواست سے کس شدت سے منع کیا گیا ہے۔

اور یہ خبر واحد کا نکتہ بھی خوب رہا۔ یہ نکتہ اگر دوسرے موضوعات سے متعلق متواتر اور صحیح احادیث پر آپ اگر فٹ کرنے لگیں تو شاید ہمارے دین کا حلیہ ہی بگڑ کر کچھ کا کچھ بن جائے۔

اگر اسی طرح پہلے آیات کی من مانی تاویل کی جائے۔ پھر احادیث کو خبر واحد قرار دے کر ان کو درخورِ اعتنا نہ سمجھا جائے تو پھر بیچارے مرزائیوں کا کیا قصور ہے اور پرویزی کیوں موردِ الزام ٹھہرتے ہیں۔ وہ بھی اس سے زیادہ تو کچھ نہیں کرتے۔ ہم ایک بار پھر یہ دُعا کرتے ہیں۔

رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا (۳/۸)

اے پروردگار! جب تو نے ہمیں ہدایت بخشی ہے تو اس کے بعد ہمارے دلوں میں ٹیڑھ نہ پیدا کر۔

چند استفسارات اور ان کا جواب

بحث کے آخر میں چند سوالوں کا جواب دینا ضروری ہے۔ پہلا سوال یہ ہے کہ آیا شوریٰ کی رکنیت کوئی منصب ہے بھی یا نہیں۔ اور کیا شوریٰ کے علاوہ دوسرے مناصب مثلاً منصفی، ججی، ڈپٹی کمشنری، تحصیلداری، کلرکی، چوکیداری وغیرہ سب کے لیے درخواست دینا ممنوع قرار پائے گا۔

اس سوال میں بڑی ہوشیاری سے خلط مبحث کیا گیا ہے۔ آپ حضرات تو اسمبلی کی وکالت کر رہے ہیں لہٰذا بات بھی اسی کی ہونی چاہیئے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ فی الواقعہ ایک منصب ہے۔ اسمبلی کے ارکان قومی خزانہ سے تنخواہ اور کئی طرح کے الاؤنس وصول کرتے ہیں۔ نیز ان سے حلفِ وفاداری بھی لیا جاتا ہے[۱] کیا پھر بھی اس کے منصب ہونے میں کوئی شک رہ جاتا ہے۔ رہا شوریٰ کی رکنیت کا مسئلہ تو بلا خوفِ تردید ہم یہ کہتے ہیں کہ یہ بھی ایک منصب[۲] ہے۔ بالکل اسی طرح جس طرح کہ خلافت ایک منصب ہے۔

---

[۱] تحریک آزادی و دستورِ پاکستان از فاروق اختر نجیب ص ۴۵۲۔

[۲] ایک دفعہ حضرت عمرؓ نے اہلِ شوریٰ سے خطاب کرتے ہوئے کہا:
"تمہیں عوام نے اس منصب پر فائز نہیں کیا بلکہ اس منصب کے لیے تمہیں اس لیے اہل تصوّر کیا گیا ہے کہ تمہارا تعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے قریبی تھا اور حضور اکرمؐ بھی تمہیں عزیز رکھتے تھے۔ (طبری۔ بحوالہ واقعہ کربلا از ابوبکر غزنویؒ)

جو لوگ اولوالامر کی تعریف میں آسکتے ہیں ان سب کے لیے درخواست دینا ممنوع ہے۔ اولوالامر کو ہم اپنی زبان میں "حکام" کہہ سکتے ہیں اور یہ وہ لوگ ہیں جو شوریٰ، انتظامیہ اور عدلیہ کی کلیدی اسامیوں پر فائز ہوتے ہیں۔ کلرک، تحصیلدار اور چپڑاسی وغیرہ حاکم نہیں ہوتے۔ اولوالامر سے مراد آج کے دور میں سپریم کورٹ اور ہائی کورٹ کے جج، انتظامیہ میں کلیدی اسامیوں پر براجمان افسر ہیں۔ جن کا چناؤ (SELECTION) آج بھی صدرِ مملکت اپنی صوابدید پر کرتا ہے۔ وہ اپنے مشیروں سے مشورہ ضرور لیتا ہے۔ مگر اس مشورہ کو قبول کرنے کا پابند نہیں۔ ایسے حکام نہ خود درخواست کرتے ہیں نہ ان سے درخواست طلب کی جاتی ہے۔

البتہ یہ بات حیران کُن ضرور ہے کہ کلرک اور چپڑاسی تک تو اس کے منصب کے مطابق اس کی اہلیتوں کو دیکھا اور پرکھا جاتا ہے مگر ایک قانون ساز ادارہ کے لیے فرد کے لیے اس کے سوا کسی اہلیت کا ذکر نہیں ملتا کہ وہ ۲۵ سال سے کم عمر کا نہ ہو۔ اس کا نام فہرست میں درج ہو اور پچھلے ۵ سالوں میں کسی عدالت سے سزا یافتہ نہ ہو؟ کیا اس منصب کے لیے اتنی اہلیت یا نااہلیت کا کافی ہے۔ فیا للعجب۔

کسی دوست نے یہ نکتہ بھی اُٹھایا تھا کہ آج کل نمائندگی کی درخواست میں نام کوئی دوسرا پیش کرتا ہے اور تائید بھی کسی اور کی طرف سے ہوتی ہے۔ اور یہی کچھ حضرت ابوبکرؓ کی خلافت کے وقت ہوا۔ نام حضرت عمرؓ نے پیش کر دیا۔ تائید حضرت ابوعبیدہ بن الجراح اور پھر دوسروں نے کی۔ اب اگر حضرت ابوبکرؓ کی خلافت درست اور جائز ہے تو درخواست دہندہ کی یہ کارروائی کیسے ناجائز ہوئی؟

اسی طرح ایک اور صاحب نے خلفائے راشدین کے انتخاب پر تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا کہ:

حضرت عمرؓ کی نامزدگی ہوئی اور چند افراد سے مشورہ کیا گیا۔ اس کے بعد حضرت عثمانؓ کا انتخاب چھ نامزد کردہ آدمیوں سے ہوا۔ حضرت علیؓ کا انتخاب برسرِعام ہوا۔ اگر تدریجی ارتقاء جاری رہتا تو تھوڑی ہی مدت بعد انتخاب یہی شکل اختیار کر لیتا۔ جو آج کل پایا جاتا ہے۔

پہلے سوال کے جواب میں تو ہم یہ عرض کریں گے آج کل معاملہ صرف نام پیش کرنے اور تائید کرنے تک محدود نہیں۔ عہدہ کی خواہش۔ درخواست (از طرف نمائندہ) نشان، کنویسنگ، تشہیر، بے پناہ اخراجات، اُمیدواری کا حلف نامہ، ضمانت، الیکشن ایجنٹ اور پولنگ ایجنٹ

کا تقرر اور اس دوران ہر طرح کے جائز و ناجائز حربے استعمال کیے جاتے ہیں۔ تو کیا یہ سب کچھ حضرت عمرؓ کے نام پیش کرنے اور ابوعبیدہ بن الجراحؓ کی تائید سے جائز ثابت ہو جاتا ہے؟

آج کل مسجدوں میں مسجد کی انتظامیہ کمیٹی کے انتخابات بھی بالکل سادہ اور فطری طریقہ سے ہوتے ہیں۔ ایک شخص صدارت کے لیے نام پیش کرتا ہے۔ کوئی دوسرا اس کی تائید کر دیتا ہے تو وہ صدر نامزد ہو جاتا ہے۔ نہ کوئی درخواست نہ تشہیر نہ ووٹوں کی گنتی، نہ ہی دوسرے دھندے ہوتے ہیں۔ اسی طرح سیکرٹری اور دوسرے عہدہ داروں کا انتخاب عمل میں آتا ہے۔ یہی طریقۂ انتخاب فطری اور شریعت کے عین مطابق ہے۔ اب اس طریقِ انتخاب اور موجودہ الیکشن سسٹم میں جو فرق ہے وہ ہر کوئی سمجھ سکتا ہے۔ ع

ببیں تفاوت ایں از کجاست تا بہ کجا

اور دوسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ واقعات کو گول مول کر کے پیش کرنا تو درکنار یہ تبصرہ نگار صاحب خلافتِ راشدہ کی پہلی اور آخری کڑی (یعنی حضرت ابوبکرؓ اور حضرت حسنؓ کا انتخاب) کا ذکر چھوڑ گئے۔ کیونکہ ایسا کرنے سے ان کا یہ نظریۂ ارتقا باطل قرار پاتا تھا۔ اسی سے آپ کی دیانت کا پتہ چل جاتا ہے۔

حصّہ دوم

مشورہ کی اہمیّت

مشورہ اور اس کے متعلقات

قرآن کریم میں مسلمانوں کی ایک صفت یہ بھی بیان کی گئی ہے:-

وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ (۴۲/۳۸)

اور وہ اپنے معاملات باہمی مشورہ سے طے کرتے ہیں۔

اور سورۂ آلِ عمران میں (جو جنگِ اُحد میں نازل ہوئی تھی) حضورِ اکرم کو یہ حکم دیا گیا کہ

وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ (۳/۱۵۹)

اور اپنے کاموں میں ان سے مشورہ لیا کرو اور جب کسی کام کا عزم کرلو تو اللہ پر بھروسہ رکھو۔

حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مکی دور سے ہی مسلمانوں سے اکثر مشورہ کیا کرتے تھے۔ جنگِ اُحد کے بعد دوبارہ اس لیے تاکید فرمائی گئی کہ جنگِ اُحد کے دوران مسلمانوں سے چند غلطیاں سرزد ہوئی تھیں۔ تو اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ ان کی غلطیوں کو معاف کیجئے اور دل میں کوئی بات نہ لایئے بلکہ ان سے حسبِ دستور مشورہ کا عمل جاری رکھیے اور مشورہ کی اہمیت تو اسی بات سے واضح ہوجاتی ہے کہ جس آیت میں مسلمانوں سے مشورہ کی صفت کو بیان کیا گیا ہے۔ اس سورہ کا نام ہی "شوریٰ" رکھا گیا۔

مشورہ سے متعلق درج ذیل اُمور تفصیل طلب ہیں:-

۱۔ مشورہ طلب اُمور اور ان کی نوعیت۔
۲۔ مشورہ کی غرض وغایت۔
۳۔ مشیر کی اہلیت
۴۔ مشیروں کی تعداد
۵۔ مشورہ کا طریق
۶۔ طریق فیصلہ

اب ہم ان اُمور کو ذرا تفصیل سے بیان کریں گے۔

۱۔ مشورہ طلب اُمور

مشورہ کی ضرورت عموماً اس وقت پیش آتی ہے۔ جب کسی معاملہ کے دو یا اس سے زیادہ پہلو نظروں کے سامنے ہوں اور دونوں پہلوؤں میں فائدے اور نقصان دونوں باتوں کا احتمال ہو۔ ایسے معاملات انفرادی قسم کے بھی ہو سکتے ہیں اور اجتماعی قسم کے بھی۔ تشریعی اُمور بھی ہو سکتے ہیں اور انتظامی قسم کے بھی۔ تشریعی اُمور میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم صحابہؓ سے مشورہ کرنے کے پابند نہیں تھے کیونکہ وہ شارع ہیں۔ جیسے صلح حدیبیہ کے وقت آپ نے کسی سے مشورہ نہیں فرمایا۔ جب کہ اس صلح کی شرائط اکثر صحابہؓ کو ناپسند تھیں۔ اسی طرح آپ نے حضرت زینبؓ کا نکاح کرتے وقت بھی کوئی مشورہ نہیں کیا۔ یہ نکاح عرب کے دستور کے خلاف تھا لہٰذا عین ممکن ہے کہ اگر مشورہ کیا جاتا تو کثرتِ رائے اس کے خلاف ہوتی۔

تاہم جہاں آپ مناسب سمجھتے تشریعی اُمور میں بھی مشورہ فرما لیتے تھے جب کہ خدا کی طرف سے کوئی واضح ہدایت نہ ملتی تھی جیسا کہ اذان کی ابتدا کا معاملہ ہے اس مشورہ کا ذکر بھی ہم شاملِ کتاب کر رہے ہیں۔ یہ معاملہ خالص تشریعی نوعیت کا تھا۔ تاہم اس میں بھی آپ نے مشورہ فرمایا۔

تشریعی اُمور کے علاوہ انتظامی اُمور میں آپ بھی مشورہ کے پابند تھے۔ جیسے آپؐ نے جنگِ بدر میں لڑائی کے میدان کے انتخاب میں اور جنگِ بدر کے قیدیوں کے سلسلہ میں پھر جنگِ اُحد کے متعلق کہ مدینہ سے باہر رہ کر لڑی جائے یا شہر میں رہ کر، یا جنگِ خندق کے موقع پر صحابہ کرام سے مشورے کیے۔ ان میں دو مجالس مشورت بابت "اساریٰ بدر" اور "جنگِ اُحد کے لیے جگہ کا انتخاب" ہم اس کتاب میں شامل کر رہے ہیں۔

انفرادی اُمور میں بھی مسلمانوں کو یہی حکم ہے کہ آپس کے ذاتی اور نجی معاملات میں بھی ایک دوسرے سے مشورہ کر لیا کریں۔

۲۔ مشورہ کی غرض وغایت

کسی معاملہ میں مشورہ سے مقصد یہ ہوتا ہے کہ اس معاملہ کے تمام تر پہلو سامنے آجائیں۔ پھر ان جملہ پہلوؤں کو سامنے رکھ کر یہ معلوم کیا جائے کہ کونسا پہلو اقرب الی الحق ہے۔ اور کتاب وسنّت سے زیادہ مطابقت رکھتا ہے گویا مجلسِ مشاورت منعقد کرنے کی غایت یہ ہے کہ کونسا اقدام اللہ کی مرضی ومنشا کے

مطابق ہو سکتا ہے۔ مختصر الفاظ میں ہم اسے "دلیل کی تلاش" کہہ سکتے ہیں۔

۳۔ مشیر کی اہلیت

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔
المستشارُ مُؤْتَمَنٌ (متفق علیہ)

جس سے مشورہ کیا جاتا ہے۔ وہ امین بنایا گیا ہے۔

گویا مشیر کے لیے یہ ضروری ہے کہ وُہ نہایت دیانتداری سے مشورہ لینے والے کی خیرخواہی کو ملحوظ رکھ کر بہتر سے بہتر مشورہ دے۔ اگر وہ ایسا نہیں کرے گا تو گویا اس نے امانت میں خیانت کی اور اگر اس معاملہ میں صحیح مشورہ سے اس کا اپنا مفاد مجروح ہوتا ہو تب بھی اس کے ذمّہ یہی واجب ہے کہ اپنے فائدہ کو نظر انداز کرتے ہوئے بھی صحیح مشورہ دینے میں کوتاہی نہ کرے۔

مشیر کی دوسری صفت یہ ہونی چاہیئے کہ وہ عالم اور سمجھدار ہو۔ جاہل اور بے وقوف نہ ہو۔ ورنہ اس سے مشورہ لینے میں فائدہ کے بجائے نقصان کا زیادہ احتمال ہے: ارشادِ باری ہے:۔

فَاسْئَلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ (۱۶/۴۳)

ترجمہ: اگر تم لوگ نہیں جانتے تو یاد رکھنے والوں[1] سے پُوچھ لو۔

اور اس کی تیسری صفت یہ ہونی چاہیئے کہ وہ تجربہ کار اور عقلمند ہو۔ کسی معاملہ کی تہہ تک پہنچنے یا اس سے نتیجہ برآمد کرنے کی اہلیت رکھتا ہو۔ ارشادِ باری ہے:۔

وَاِذَا جَآءَهُمْ اَمْرٌ مِّنَ الْاَمْنِ اَوِ الْخَوْفِ اَذَاعُوْا بِهٖ وَلَوْ رَدُّوْهُ اِلَى الرَّسُوْلِ وَاِلٰٓى اُولِى الْاَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِيْنَ يَسْتَنْۢبِطُوْنَهٗ مِنْهُمْ (۴/۸۲)

اور جب ان کے پاس امن یا خوف کی کوئی خبر پہنچتی ہے تو اسے مشہور کر دیتے ہیں اور اگر اس کو رسول اور اپنے حاکموں کے پاس لے جاتے تو تحقیق کرنے والے[2] اسکی تحقیق کر لیتے۔

۴۔ مشیروں کی تعداد

کتاب و سنّت میں مشیروں کی تعداد کے متعلق کوئی قید نہیں۔ لہٰذا مناسب یہی ہے کہ اگر معاملہ انفرادی نوعیت کا ہو تو ایک دو مشیروں سے اکٹھے یا علیحدہ مشورہ کرنا چاہیئے اور اگر اجتماعی نوعیّت کا ہو تو پھر زیادہ مشیروں کی ضرورت ہے۔ البتہ یہ خیال رکھنا چاہیئے کہ اگر مشیر متعدد ہوں تو ان کی آپس میں کسی قسم کی چپقلش نہ ہونی چاہیئے۔ ورنہ اس مشاورت کا نتیجہ اُلجھاؤ اور تنازعہ کے سوا کچھ برآمد نہ ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ آج کل کی اسمبلیوں میں اکثر

---

[1] اہلِ ذکر سے مراد وُہ عالم باعمل ہے جسے ہر وقت اللہ کی یاد رہتی ہو۔

[2] استنباط کے معنی کسی بات کو سُن کر اس کی تہہ تک پہنچنا اور اس سے نتیجہ برآمد کرنا ہے۔

تنازعات برپا ہوتے اور نوبت ہاتھا پائی تک پہنچ جاتی ہے کیونکہ وہاں حزبِ اقتدار کے علاوہ حزبِ اختلاف کا وجود لازمی ہوتا ہے اور ان دونوں کے نظریات الگ الگ اور آپس میں منافرت ہوتی ہے۔ حزبِ اختلاف کبھی حزبِ اقتدار کو دیانتداری سے اور اس کی خیرخواہی کو ملحوظ رکھ کر مشورہ نہیں دے سکتا۔ کیونکہ اس سے اس کے اپنے مفادات اور نظریات پر زَد پڑتی ہے۔ بحمداللہ اسلامی مجلسِ شوریٰ کا دامن ایسی بے ہودگیوں سے پاک ہوتا ہے۔

۵۔ مشورہ کا طریق

مشورہ کا طریق کار بھی معاملہ کی نوعیت پر منحصر ہے۔ اگر کوئی معاملہ اہم اور تھوڑے وقت میں حل طلب ہو تو ایک ہی مجلس میں اس کا فیصلہ کر لینا چاہیئے جیساکہ جنگِ اُحد کے معاملہ میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا۔ اور اگر مسئلہ اہم بھی ہو اور مستقل نوعیت کا حامل بھی، تو اس میں الگ الگ مشورے بھی لیے جا سکتے ہیں۔ بعد میں سب کو اکٹھا کر کے بھی، دوبارہ بھی، سہ بارہ بھی مشورہ کیا جا سکتا ہے۔ جیساکہ حضرت عمرؓ نے عراق کی زمینوں کو بیت المال کی تحویل میں لینے کے بارے میں کیا۔ یا طاعون والے علاقے میں داخل ہونے یا واپس چلے آنے کے بارے میں کیا۔ ان تنازعات کی تفصیل آئندہ مذکور ہے۔

۶۔ طریقِ فیصلہ

کسی معاملہ پر مختلف آراء اور بحث وتمحیص کے بعد فیصلہ کیسے ہو؟ یہی معاملہ سب سے زیادہ اہمیت کا حامل ہے۔ اسلام نے فیصلہ کا اختیار میرِ مجلس کو دیا ہے۔ ارشاد باری ہے :۔

وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ (۳/۱۵۹)

اور اپنے کاموں میں ان سے مشورہ لیا کرو۔ پھر جب کام کا عزم کر لو۔ تو اللہ پر بھروسہ رکھو۔

اس آیت میں عَزَمْتَ کے الفاظ سے یہ بالکل واضح ہے کہ آخری فیصلہ کا اختیار آپ کو دیا گیا ہے۔

فیصلہ کے لیے دو ہی بنیادیں ہو سکتی ہیں۔ کسی دلیل کی قوت، یا کثرت رائے۔ اسلامی مجلسِ مشاورت میں فیصلے دلیل کی بنیاد پر ہوتے ہیں جیساکہ خلافتِ ابوبکرؓ کے موقع پر تمام انصار نے حضور اکرمؐ کے ارشاد کے آگے سر جھکا دیا۔ یا عراق کی مفتوحہ زمینوں کا معاملہ بالآخر (وَالَّذِيْنَ جَاءُوْ مِنْۢ بَعْدِهِمْ ۵۹/۱۰) کی دلیل سے طے پایا۔ یہ تو خیر نص قطعی کا معاملہ ہے۔ اگر نص نہ مل سکے تو امیرِ مجلس ایسی رائے کو اختیار کرے ۔ جو اسے منشائے الٰہی سے قریب تر معلوم ہو۔ اس پر

فیصلہ دے سکتا ہے۔ جیسا کہ حضرت عمرؓ نے طاعون زدہ علاقہ سے واپسی کے معاملہ میں فیصلہ دیا حتیٰ کہ اگر ساری شوریٰ بھی ایک طرف ہو اور امیر کو یہ وثوق ہو کہ اس کی رائے اقرب الی الحق ہے تو ساری شوریٰ کے خلاف بھی فیصلہ دے سکتا ہے۔ جیسا کہ حضرت ابوبکرؓ نے مانعینِ زکوٰۃ سے جنگ کرنے کے بارے میں فیصلہ کیا۔ (ان تمام واقعات کی تفصیل آگے آتی ہے)

کثرتِ رائے کا یہ فائدہ ضرور ہے کہ جب کوئی نص قطعی نہ مل سکے اور عقلی دلائل دونوں طرف برابر ہوں یا دونوں طرف عقلی دلائل سرے سے موجود ہی نہ ہوں تو صرف قطع نزاع کے لیے فیصلہ کثرتِ رائے کے مطابق کر دیا جاتا ہے۔ اس سے تنازعہ تو ختم ہو جاتا ہے لیکن وضوحِ حق کو اس سے کوئی تعلق نہیں ہوتا اور اس کی مثال ایسی ہی ہے جیسے قرعہ کے ذریعے کسی تنازعہ کا فیصلہ کر دیا جاتا ہے۔

یہاں یہ ذکر کر دینا بے جا نہ ہوگا کہ جمہوریت کا بنیادی اصول ہی چونکہ کثرتِ رائے کے مطابق فیصلہ ہوتا ہے۔ لہٰذا جمہوریت نواز عموماً ہر واقعہ کو توڑ موڑ کر پیش کر کے یا غلط تاویل کر کے یہ تاثر دینے کی کوشش کرتے ہیں کہ یہ فیصلہ بھی کثرت رائے کے مطابق ہوا اور وہ فیصلہ بھی کثرت رائے سے ہوا اور جہاں کوئی گنجائش نہ مل سکے اس کی کچھ اور توجیہ پیش کر دیتے ہیں۔ ہمیں صرف یہ کہنا مقصود تھا کہ اگر اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں فیصلہ میرِ مجلس کے بجائے کثرت رائے کی بنیاد پر درست ہوتا تو آیت مذکورہ کے الفاظ مندرجہ ذیل دو صورتوں میں سے کسی ایک طرح پر نازل ہونے چاہئیں تھے۔

۱۔ وشاورهم فی الامر فاذا عَزَمُوا فَتَوَکل علی اللہ۔

۲۔ وشاورهم فی الامر واتبع اکثرهم وتوکل علی اللہ۔

بلکہ اس سے بھی آگے مجھے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ اگر کثرت رائے ہی معیارِ حق ہوتا تو انبیاءؑ کی بعثت کی ضرورت ہی نہ تھی۔ کیونکہ وہ مامور من اللہ ہوتے ہیں۔ کثرتِ رائے کے تابع نہیں ہوتے۔

کثرت رائے کے معیارِ حق ہونے کا اصول ان لوگوں کا وضع کردہ ہے جن کے ہاں سے دلیل گم ہو گئی تھی۔ آسمانی تعلیمات میں تحریف اور ردّ و بدل کی وجہ سے اور پھر اپنے مذہبی رہنماؤں کی اجارہ داری سے تنگ آکر جمہوریت کی راہ اختیار کی۔ اندریں صورت انھیں کثرتِ رائے کا اصول وضع کرنے کے بغیر کوئی چارہ ہی نہ تھا۔ ورنہ حزبِ اقتدار اور حزب اختلاف کی باہمی کش مکش میں کسی بھی امر کا فیصلہ ہونا ناممکن تھا۔

چند مشہور مجالسِ مشاورت

۱۔ بدر کے قیدیوں کے متعلق آنحضرتؐ کا صحابہ سے مشورہ

جنگِ بدر میں قریش کے ستر بڑے بڑے آدمی گرفتار ہوکر دربارِ نبوت میں پیش کئے گئے تو آپ نے حسبِ عادت مجلسِ شوریٰ طلب کی اور یہ مسئلہ زیرِ بحث آیا کہ ان کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے۔

یہ واقعہ مختصراً صحیح مسلم (کتاب الجہاد۔ باب اباحۃ الغنائم) میں بروایت حضرت عمرؓ بن الخطاب یوں مذکور ہے :۔

فلما اُسِروا الأُسارى قال رسول الله صلى الله عليه وسلم لابى بكر وعمر "ما ترون فى هٰؤلاء الأُسارىٰ؟ فقال ابوبكرؓ : يانبى الله هم بنوعم والعشيرة ارىٰ ان تاخذ منهم فدية فتكون لنا قوة على الكفار فعسى الله ان يهديهم للاسلام" فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم "ما ترى يا ابن الخطاب !" قال "قلت لا والله يارسول الله ما ارىٰ راى ابى بكرٍ ولكنى ارىٰ ان تمكنّا فنضرب اعناقهم فيمكّن عليًّا من عقيل فيضرب عنقه وتمكنّى من فلان نسيبًا لعمر فاضرب عنقه فان هٰؤلاء ائمةُ الكفر وصناديدها" فهوِى رسول الله صلى الله عليه وسلم ما قال ابوبكر ولم يهْوَ ما قلتُ۔

فلما كان من الغد جئتُ فاذا رسول الله صلى الله عليه وسلم وابوبكر قاعدين وهما يبكيان - قلت " يارسول الله ! اخبِرنى من اى شىءٍ تبكى انت وصاحبك، فان وجدت بكاءً بكيتُ وان لم اجد بكاءً تباكيت لبكائكما" فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم

ابکی الذی عرض علی اصحابك من اخذ هم الفداء لقد عرض علی عذابهم ادنیٰ من هذه الشجرة شجرة قریبة من نبی صلی الله علیه وسلم فانزل الله عزوجل :-

مَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗٓ اَسْرٰى حَتّٰى يُثْخِنَ فِي الْاَرْضِ تُرِيْدُوْنَ عَرَضَ الدُّنْيَا۔ وَاللّٰهُ يُرِيْدُ الْاٰخِرَةَ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ لَوْ لَا كِتٰبٌ مِّنَ اللّٰهِ سَبَقَ لَمَسَّكُمْ فِيْمَآ اَخَذْتُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ۔ (۶۷-۶۸)

ترجمہ : جب قیدی گرفتار کرلیے گئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ سے پوچھا۔ ان قیدیوں کے متعلق تمھاری کیا رائے ہے ؟ حضرت ابوبکرؓ نے کہا :-

اے اللہ کے نبی ! یہ ہمارے خویش واقارب اور بھائی بند ہیں۔ میری رائے یہ ہے کہ :-

۱۔ قرابتداری کا لحاظ رکھتے ہوئے انھیں فدیہ لے کر چھوڑ دیا جائے۔
۲۔ اس رقم کو ہم جہاد اور دوسرے دینی اُمور میں لاکر قوت حاصل کر سکتے ہیں۔
۳۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ان کی اولاد کو اللہ تعالیٰ اسلام کی توفیق عطا کرے۔

پھر حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمرؓ سے ان کے بارے میں رائے پوچھی انھوں نے کہا۔ اے اللہ کے رسولؐ میری رائے قطعاً ابوبکرؓ کے مطابق نہیں میری رائے یہ ہے کہ ان کو تہ تیغ کیا جائے (یہی نہیں بلکہ ہر ایک اپنے قریبی رشتہ دار کو قتل کرے) علی عقیل کی گردن اڑائیں اور مَیں اپنے فلاں رشتہ دار کی اُڑاؤں گا۔ کیونکہ یہ لوگ کفر کے امام اور مشرکین کے سردار ہیں۔"

حضرت عمرؓ کہتے ہیں کہ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوبکرؓ کی رائے پسند کی اور میری رائے کو پسند نہ کیا۔

پھر جب میں دوسرے دن آیا تو حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور ابوبکرؓ کھڑے رو رہے تھے۔ مَیں نے کہا۔ یارسولؐ اللہ ! مجھے بتلایئے آپؐ اور آپ کا ساتھی کیوں روتے ہیں ؟ ایسی ہی بات ہے تو مجھے بھی رونا چاہیئے۔ ورنہ میں آپ دونوں کو روتا دیکھ کر رونا شروع کردوں گا۔"

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ”ہمیں اس بات نے رلایا ہے جو فدیہ لینے کی وجہ سے تیرے ساتھیوں پر پیش کی گئی۔ مجھ پر مسلمانوں کے لیے عذاب اس درخت سے بھی قریب پیش کیا گیا ہے۔ یہ درخت حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ہی تھا۔ اللہ تعالیٰ نے یہ آیات نازل فرمائی ہیں۔

نبی کو شایاں نہیں کہ اس کے قبضے میں قیدی آئیں اور وہ انھیں تہ تیغ نہ کر دے۔ تم دُنیا کے مال کے طالب ہو اور اللہ آخرت (کی بھلائی) چاہتا ہے اور اللہ غالب حکمت والا ہے۔ اگر خدا کا حکم پہلے نہ ہو چکا ہوتا تو جو (فدیہ) تم نے لیا ہے۔ اس کے بدلے تم پر بڑا عذاب نازل ہوتا۔“

اتنی بات پر تو تمام روایاتِ حدیث متفق ہیں کہ اس بارہ میں مختلف آراء پیش کی گئیں مگر یہ پتہ نہیں چل سکا کہ اس مجلس کے کل ارکان کتنے تھے۔ صرف پانچ صحابہؓ کی موجودگی کا علم ہو سکا ہے۔ حضرت ابوبکرؓ صدیق، حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ، حضرت عبداللہؓ بن رواحہ اور حضرت سعد بن معاذؓ۔

تاہم اصل اختلاف حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کی آراء میں تھا۔ حضرت سعد بن معاذ حضرت عمرؓ کے ہم رائے تھے۔ اور عبداللہ بن رواحہ کی رائے حضرت عمرؓ سے بھی سخت تر تھی۔ آپ نے کہا: ”یارسول اللہ! میری رائے تو یہ ہے کہ ان سب کو کسی ایسی وادی میں داخل کیا جائے جہاں سوختہ زیادہ ہو اور پھر اس میں آگ لگا دی جائے۔“

حضرت عبداللہ بن عباس کی روایت ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کو مخاطب کر کے فرمایا:۔

لَوِاجْتَمَعَا مَاعَصَيْتُكُمَا اگر تم دونوں کسی ایک رائے پر متفق ہو جاتے تو میں اس کے خلاف نہ کرتا (درمنثور ج ۳ ص ۲۰۲)

بہر حال آپ یہ مختلف آراء سُن کر گھر تشریف لے گئے۔ کوئی کہتا تھا کہ آپ حضرت ابوبکرؓ کی رائے پسند کریں گے اور کوئی کہتا تھا کہ حضرت عمرؓ کی رائے قبول کی جائے گی۔“

یہاں یہ بات قابلِ غور ہے کہ علامہ شبیر احمد عثمانیؒ کی تحقیق کے مطابق کثرت آراء حضرت ابوبکرؓ کے ساتھ تھی کیونکہ خود حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بھی اپنی فطری نرمی اور شفقت کی بناء پر حضرت ابوبکرؓ کے ہم خیال تھے۔ اور حاضرینِ مجلس میں بھی اکثر کی رائے یہی تھی۔ گو ان

یں سے بعض کی نظر صرف مالی منفعت تک محدود تھی۔ جیساکہ قرآنِ کریم کے الفاظ "تُرِیْدُوْنَ عَرَضَ الدُّنْیَا" سے واضح ہے (حاشیہ آیت مذکورہ ۸/۶۷)

اور مفتی محمد شفیع کی تحقیق کے مطابق کثرت آراء حضرت عمرؓ کے ساتھ تھی کیونکہ جن پانچ اکابر صحابہ کا اُوپر ذکر کیا ہے ان میں سے صرف حضرت ابوبکرؓ فدیہ لینے کے حق میں تھے۔ باقی سب حضرت عمرؓ کے ساتھ تھے (اسلام میں مشورہ کی اہمیت ص۱۶۰) تاہم اس بات پر سب متفق ہیں کہ فیصلہ کثرت و قلت کی بنیاد پر نہیں بلکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی صوابدید پر ہوا تھا۔

کچھ دیر بعد آپ گھر سے واپس آئے اور ایک مختصر تقریر فرمائی جس میں فریقین کی دلجوئی کے الفاظ تھے اور فیصلہ بالآخر حضرت ابوبکرؓ کی رائے کے مطابق دے دیا تو اس کے بعد جو وحی نازل ہوئی اس سے ظاہر ہے کہ اندریں حالات فدیہ لے کر چھوڑ دینا مسلمانوں کی زبردست اجتہادی غلطی تھی۔

نتائج | اس واقعہ مشاورت سے مندرجہ ذیل اُمور پر روشنی پڑتی ہے:۔

۱۔ مشورہ کرتے وقت کثرت رائے کے بجائے مشیر کی اہلیت کو بڑا دخل ہوتا ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان کہ اگر حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ ہم رائے ہو جاتے (اور باقی خواہ سب صحابی دوسری طرف ہوتے) تو انھیں کی رائے کے مطابق فیصلہ کرتا" اس بات پر واضح دلیل ہے۔

۲۔ مختلف آراء سُننے کے بعد حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم گھر تشریف لے گئے تو صحابہؓ نے کسی ایک رائے کی موافقت میں آراء کو شمار کرنے کی بجائے یہی خیال کیا کہ "دیکھیں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابوبکرؓ کی رائے کو ترجیح دیتے ہیں یا حضرت عمرؓ کی رائے کو" سے بھی یہی بات ثابت ہوتی ہے کہ فیصلہ کثرت آراء کی بجائے امیر کی صوابدید پر منحصر ہوتا ہے یہاں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ اللہ تعالیٰ کا فیصلہ حضرت عمرؓ کی رائے کے موافق ہوا۔

تو یہ محض وقتی مصلحت کا تقاضا تھا کیونکہ بالآخر شرعی حکم وہی قرار پایا جو حضرت ابوبکرؓ کی رائے تھی۔ سورۂ محمد جو آلِ عمران سے بعد نازل ہوئی اس میں یہ حکم یوں ہے:۔

فَاِذَا لَقِیْتُمُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا فَضَرْبَ الرِّقَابِ حَتّٰۤى اِذَاۤ اَثْخَنْتُمُوْهُمْ فَشُدُّوا الْوَثَاقَ فَاِمَّا مَنًّۢا بَعْدُ وَ اِمَّا فِدَآءً (۴۷/۴)

جب تم کافروں سے بھڑ جاؤ تو ان کی گردنیں اُڑا دو۔ یہاں تک کہ جب ان کو خوب قتل کر چکو (تو جو زندہ پکڑے جائیں ان کو) مضبوطی سے قید کر لو۔ پھر یا تو احسان رکھ کر چھوڑ دینا چاہیے یا مال لیکر۔

۲۔ مشاورت متعلقہ اذان

نماز باجماعت کے لیے اذان کی ابتدا کیونکر ہوئی - یہ قصّہ بخاری، مسلم (باب الاذان) میں مجملاً یوں مذکور ہے :-

عن ابن عمر قال: کان المسلمون حین قدموا المدینۃ یجتمعون فیتعیّنون للصلوٰۃ ولیس ینادی بھا احد۔ فتکلموا یومًا فی ذٰلک: فقال بعضھم: اتخذوا مثل ناقوس النصارٰی" وقال بعضھم: قرنًا مثل قرن الیھود: فقال عمر۔ اولا تبعثون رجلاً ینادی بالصلوٰۃ فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: قم یا بلال فناد بالصلوٰۃ۔

حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ جب مسلمان ہجرت کرکے مدینہ میں آئے تو جمع ہوکر وقت کا اندازہ کرتے اور ایک وقت معین کر دیتے تھے اور ان کا کوئی منادی نہ تھا پس ایک روز اس مسئلہ پر مشورہ کیا۔ بعض نے کہا نصاریٰ کا سا ناقوس لے لو۔ بعض نے کہا یہودؔ سا قرنا لے لو۔ حضرت عمرؓ نے کہا۔ کوئی آدمی کیوں نہ مقرر کردو جو نماز کا بلاوا دے آیا کرے پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ بلال کھڑے ہوجاؤ اور نماز کی منادی کردو۔

بعض دوسری احادیث کتب مثلاً ابوداؤد، دارمی، دارقطنی اور ترمذی کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ اس پہلی مجلس میں اذان کی صحیح شکل اور کلمات متعین نہیں ہوئے تھے یعنی صرف حی علی الصلوٰۃ کے الفاظ سے منادی کر دی جاتی تھی۔ حضرت عبداللہ بن زید بن عبدِ ربہ کہتے ہیں کہ :-

مجھے خواب میں ایک شخص ملا جو ناقوس بیچ رہا تھا۔ مَیں نے کہا: ناقوس بیچ رہے ہو؟ اس نے کہا: ہاں لیکن تمھیں اس سے کیا غرض"؟ مَیں نے کہا۔ اس سے لوگوں کو نماز کے لیے بلائیں گے"۔ اس نے کہا میں تجھے اس سے بہتر چیز نہ بتلادوں؟ میں نے کہا" ہاں" تو اس نے کہا: اللہ اکبر اللہ اکبر ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ آخر تک اذان کے کلمات کہے۔

صبح ہوئی تو میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور اپنا خواب بیان کیا۔ آپ نے فرمایا: "انشاء اللہ یہ خواب حق ہے۔ تم بلال کے ساتھ کھڑے ہوکر اسے یہ کلمات بتلاؤ اور وہ اذان کہے کیونکہ وُہ تجھ سے بلند آواز ہے"۔ پس میں بلال کے ساتھ

کھڑا ہوا اور انھیں اذان کے کلمات بتلانے لگا اور وہ اذان کہتے رہے۔
جب حضرت عمرؓ نے گھر میں اذان کی آواز سُنی تو چادر گھسیٹتے (جلدی میں) گھر سے آئے اور آکر عرض کیا "یا رسول اللہ میں نے بھی بالکل ایسا ہی خواب دیکھا ہے"۔ تو اس پر آپؐ نے اللہ کا شکر ادا کیا"

نتائج اس مجلسِ مشاورت سے مندرجہ ذیل اُمور پر روشنی پڑتی ہے:-

۱۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بعض تشریعی اُمور میں بھی صحابہؓ سے مشورہ فرمایا کرتے تھے جب کہ بذریعہ وحی کوئی واضح دلیل موجود نہ ہوتی تھی۔
۲۔ مختلف آراء سُننے کے بعد کسی رائے کا اقرب الی الحق یا رضائے الٰہی ہونا پسندیدگی کا معیار تھا۔ مشیروں کی تعداد نہیں گنی جاتی تھی۔
۳۔ کسی رائے کی پسندیدگی امیر کی صوابدید پر منحصر ہے۔
۴۔ اس تشریعی امر کا فیصلہ بھی بالآخر بذریعہ الہام ہی ہوا نہ کہ صحابہ کے مشورہ سے۔

۳۔ مشاورتِ متعلقہ غزوۂ اُحد

جب ابوسفیان اور مشرکین مکہ تین ہزار کا لشکر جرار لے کر مدینہ کے پاس پہنچ گئے۔ تو آپؐ نے اس امر میں صحابہؓ سے مشورہ فرمایا کہ جنگ مدینہ میں رہ کر مدافعانہ طور پر کی جائے یا شہر سے باہر نکل کر کھلے میدان میں مقابلہ کیا جائے؟

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اپنی رائے یہ تھی کہ مدینہ میں رہ کر جنگ لڑی جائے۔ وجہ یہ تھی کہ حضورؐ نے دو تین خواب دیکھے تھے۔

۱۔ گزشتہ رات آپؐ نے خواب دیکھا کہ ایک گائے ذبح کی گئی ہے۔
۲۔ آپؐ نے یہ بھی خواب دیکھا تھا کہ آپ کی تلوار کی تھوڑی سی دھار گر گئی ہے۔
۳۔ آپؐ نے یہ بھی دیکھا تھا کہ آپؐ نے ایک زرہ میں ہاتھ ڈال دیا ہے۔

ان میں سے مذکورہ پہلے دو خواب بخاری کتاب التعبیر میں مذکور ہیں اور پھر یہ تینوں خواب البدایۃ والنہایہ ج ۴ ص۱۲ پر بھی مذکور ہیں۔ مختصراً یہ کہ ان خوابوں کی تعبیر میں مسلمانوں کی شہادت اور آپؐ کے زخمی ہونے کے اشارات پائے جاتے تھے۔ لہٰذا آپؐ مدینہ میں رہ کر مدافعانہ جنگ لڑنا چاہتے تھے۔ صحابہ کرامؓ میں سے اہل الرائے اور بزرگ بھی آپ کے ہم رائے تھے۔ مسلمانوں کا کل لشکر ایک ہزار پر مشتمل تھا جن میں تین سو افراد عبداللہ بن اُبی منافق

کے ساتھی تھے۔عبداللہ بن اُبی کی بھی رائے یہی تھی کہ جنگ مدینہ میں رہ کر لڑی جائے ۔ لیکن کچھ جوشیلے نوجوانوں کا طبقہ جو بدر میں شامل نہ ہو سکا تھا۔اس حق میں تھا کہ جنگ کھلے میدان میں لڑی جائے۔اب اس پس منظر میں حافظ ابن کثیر صاحب البدایۃ والنہایۃ کی زبان سے اس مشورہ کا حال سُنیئے :۔

وقال الذین لم یشهدوا بدرًا "کنا نتمنّی هذا الیوم وندعوا الله فقد ساقه الله الینا وقرب السیر، وقال رجل من الانصار: متی نقاتلهم یارسول الله اذا لم تُقاتلیهم عند شعبنا"؟ وقال رجال" ماذا تمنع اذا لم تمنع الحرب بروع ؟ وقال رجال صدقوا وامضوا علیه منهم حمزه بن عبد المطلب قال : والذی انزل علیك الکتاب لنجادلنّهم". وقال نعیم بن مالك بن ثعلبه وهو احد بنی سالم: یانبی الله لاتحرمنا الجنة" فو الذی نفسی بیده لادخلنّها." فقال له رسول الله صلی الله علیه وسلم: "بِمَ"؟ قال :" بانّی اُحِبُّ الله ورسوله ولا اُفِرُّ یوم الزحف" فقال له رسول الله صلی الله علیه وسلم : صدقتَ واستشهد یومئذٍ - وابی کثیر اًمن الناس الا الخروج الی العدوّ ولم یتناهوا الی قول رسول الله صلی الله علیه وسلم ورایه ولو رضوا بالذی امرهم کان ذلك ولکن غلب القضاء والقدر وعامة من اشار علیه بالخروج رجال لم یشهدوا بدرًا قد علموا الذی سبق لاصحاب بدر من الفضیلة۔

فلما صلی رسول الله صلی الله علیه وسلم الجمعة وعظ الناس وذکرهم وامرهم بالجهد والجهاد ثم انصرف من خطبته و صلوٰته فدعا بلأمته فلبسها ثمّ اذّن فی الناس بالخروج۔

فلما رای ذلك رجال من ذوی الرأی قالوا : امرنا رسول الله صلی الله علیه وسلم ان تمکث بالمدینة وهو اعلم بالله وما یرید ویاتیه الوحی من السماء فقالوا : یارسول الله ! امکث کما اَمَرْتَنا"

فقال: "ماینبغی لنبی اذا اخذ لأمۃ الحرب واذّن بالخروج الی الله وان یرجِعَ حتیٰ یقاتل وقد دعوتکم الی ھذا الحدیث فابیتھم الی الخروج فعلیکم بتقوی الله والصبر عند الباس اذا لقیتم العدوّ وانظروا الی ما امرکم الله بہ فافعلوا۔"

(البدایۃ والنھایہ ج ۴ ص ۱۲-۱۳)

ترجمہ: اور وہ لوگ جو جنگِ بدر میں شریک نہ ہوئے تھے۔ کہنے لگے: ہم آج کے دن کی تمنّا کرتے اور اللہ سے دُعا مانگتے تھے۔ سو اللہ تعالیٰ اسے ہماری طرف لے آیا اور فاصلہ قریب کر دیا۔ انصار میں ایک شخص نے کہا! یا رسول اللہ! ہم اس وقت ایک مضبوط جماعت ہیں۔ اگر اب ان سے لڑائی نہ کی تو اور کب کریں گے۔

اور کچھ لوگوں نے کہا: کیا ہم لڑائی کے خوف سے رُکے رہیں؟

اور کچھ لوگوں نے، جن میں حمزہ بن عبدالمطلب بھی تھے اور انھوں نے اپنی بات سچ کر دکھائی اور اسی راستہ پر چلے۔ کہا: اس ذات کی قسم جس نے آپ پر قرآن اتارا ہم ضرور لڑائی کریں گے اور نعیم بن مالک بن ثعلبہ نے جو بنی سالم کے یکتا نوجوان تھے، کہا اے اللہ کے نبی! ہمیں جنت سے محروم نہ کیجئے۔ خدا کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے میں ضرور جنّت میں داخل ہوں گا۔" اس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا۔ "کیسے" اس نے کہا۔ کیونکہ میں اللہ اور اس کے رسولؐ سے محبت رکھتا ہوں۔ میں لڑائی کے دوران فرار کی راہ اختیار نہ کروں گا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے کہا: تو نے سچ کہا اور وہ اس دن شہید ہو گیا۔

علاوہ ازیں بہت سے لوگوں نے دشمن کی طرف نکل کر لڑنے کی رائے دی۔ اور رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بات اور رائے کی پروا نہ کی۔ اگر وہ اس رائے سے راضی ہو جاتے تو ایسا ہی ہوتا۔ لیکن کی تقدیر غالب ہوئی اور وہ لوگ جو بدر میں شریک نہ ہو سکے اور انھیں اس کی فضیلت معلوم ہوئی تو باہر نکل کر لڑنے کی طرف ہی اشارہ کرتے تھے۔

پھر جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جمعہ کی نماز پڑھائی تو لوگوں کو وعظ فرمایا انھیں نصیحت کی اور کوشش اور جہاد کا حکم دیا پھر خطبہ اور نماز سے فارغ ہو کر گھر

چلے گئے۔ پھر لڑائی کے ہتھیار منگوائے انھیں زیبِ تن کیا اور باہر نکلنے کا اعلان کر دیا۔

جب لوگوں نے یہ صورتِ حال دیکھی تو کچھ اہل الرائے ایک دوسرے سے کہنے لگے۔ ہمیں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ میں ٹھہرنے کا حکم دیا اور جو کچھ اللہ چاہتا ہے وہ اسے خوب جانتے تھے اور ان پر آسمان سے وحی آتی ہے تو کہنے لگے: اے اللہ کے رسول! مدینہ میں ہی ٹھہریے جیسے آپؐ نے ہمیں حکم دیا ہے۔" تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:-

نبی کو یہ لائق نہیں کہ اسلحہ جنگ زیبِ تن کرے اور دشمن کی طرف نکلنے کا اعلان کرے تو اس سے لڑے بغیر واپس ہو۔ میں نے تمھیں یہی بات کہی تھی تو تم نے اسے تسلیم نہ کیا اور باہر نکل کر لڑنے پر اصرار کیا۔ اب تم پر لازم ہے کہ اللہ سے ڈرو اور جب دشمن سے مقابلہ ہو تو جنگ میں ثابت قدم رہو اور اس بات کا خیال رکھو کہ جیسے اللہ نے تمھیں حکم دیا ہے۔ اسی طرح کرو۔

نتائج | اس مشاورت سے مندرجہ ذیل نتائج اخذ کیے جا سکتے ہیں:-

۱۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان جوشیلے نوجوانوں کی رائے پر فیصلہ فرمایا جو جنگِ بدر میں شریک نہ ہو سکے تھے اور جہاد کی انتہائی آرزو رکھتے تھے تو محض یہ ان کی دلجوئی کی خاطر فیصلہ کیا گیا تھا۔

۲۔ کل لشکر کی تعداد ایک ہزار تھی۔ جس میں ۳۰۰ عبداللہ بن اُبی کے ساتھی بھی حضورؐ کے ہم رائے تھے۔ اور وہ بزرگ صحابہ جو جنگِ بدر میں پچھلے ہی سال شریک ہوئے وہ بھی آپ کے ہم رائے تھے۔ ان کی تعداد ۳۰۰ کے لگ بھگ تھی۔ لہٰذا من حیث المجموع ان نوجوانوں کی اکثریت ثابت نہیں ہوتی اور متن میں جو کثیراً من الناس کے الفاظ آئے ہیں تو اس سے مراد سو یا دو سو بھی ہو سکتے ہیں۔ اتنے لوگوں پر بھی یہی لفظ استعمال ہوگا۔ ان لوگوں کی تعداد بہر حال ۴۰۰ سے کم ہی ہو سکتی ہے۔ جبکہ مجموعی تعداد ایک ہزار تھی۔

۳۔ اگر یہ فرض کر بھی لیا جائے کہ وہ فی الواقعہ کثرت میں تھے۔ تو انہی لوگوں نے جنگ سے پہلے ہی اپنے ارادہ کو بدل کر معذرت پیش کی لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس "کثرت" کی بات تسلیم نہیں کی۔

نتیجہ واضح ہے کہ فیصلہ امیر کی صوابدید پر ہوتا ہے۔ وہ اکثریت کے ہاتھوں میں کھلونا نہیں ہوتا۔

۴۔ مانعینِ زکوٰۃ سے متعلق حضرت ابوبکرؓ کا مشورہ

حضرت عبداللہ بن عمرؓ کہتے ہیں کہ جب حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہو گئی تو مدینہ میں نفاق پھیل گیا۔ عرب قبائل مرتد ہونے لگے۔ کچھ قبائل نے زکوٰۃ دینے سے انکار کر دیا۔ ادھر جیش اُسامہ کی روانگی کا مسئلہ بھی سامنے تھا۔ جس کو خود حضور اکرمؐ نے اپنی زندگی میں ترتیب دیا تھا۔ ان حالات کے پیشِ نظر حضرت ابوبکرؓ نے پہلے جیش اسامہ کی روانگی کے متعلق مشورہ کیا تو ان نازک حالات میں شوریٰ فوری طور پر لشکر کی روانگی کے خلاف تھی لیکن حضرت ابوبکرؓ نے اپنا دوٹوک فیصلہ ان الفاظ میں فرمایا:۔

والذی نفس ابی بکر بیدہ، لو ظننت انّ السبّاع تخطفنی لانفذت بعث اسامۃ کما امر بہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، ولو لم یبق فی القرٰی غیری لَاَنْفَذْتُہٗ۔ (طبری جلد ۳ ص ۲۲۵)

اس ذات کی قسم! جس کے ہاتھ میں ابوبکرؓ کی جان ہے۔ اگر مجھے یہ یقین ہو کہ درندے آکر مجھے اُٹھا لے جائیں گے تو بھی میں اسامہ کا لشکر ضرور بھیجوں گا۔ جیسا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا تھا۔ اور اگر ان آبادیوں میں میرے سوا کوئی شخص بھی باقی نہ رہے تو بھی میں یہ لشکر ضرور روانہ کروں گا۔

چنانچہ یہ لشکر بھیجا گیا جو چالیس دن کے بعد ظفریاب ہو کر واپس آگیا۔ اب مانعین زکوٰۃ کے متعلق حضرت ابوبکرؓ نے مہاجرین وانصار کو جمع کیا اور فرمایا:۔

"آپ کو معلوم ہے کہ عرب نے زکوٰۃ ادا کرنی چھوڑ دی اور وہ دین سے مرتد ہو گئے اور عجم نے تمہارے لیے نہاوند تیار کر رکھا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ مسلمان جس شخص کی وجہ سے ہمیشہ فتحیاب ہوتے تھے وہ تو گزر چکا۔ اب موقع ہے کہ مسلمانوں کو مٹا دیا جائے۔ آپ مجھے مشورہ دیں کہ اس حالت میں کیا کرنا چاہیئے۔ کیونکہ میں بھی تمہیں میں سے ایک شخص ہوں اور مجھ پر تمہاری نسبت اس مصیبت کا بوجھ زیادہ ہے۔"

اس تقریر سے مجمع پر سکتہ طاری ہو گیا۔ طویل خاموشی کے بعد حضرت عمرؓ نے فرمایا:۔

"اے خلیفہ رسولؐ! میری رائے تو یہ ہے کہ آپ اس وقت عرب سے نماز ادا

کرنے ہی کو غنیمت سمجھیں اور زکوٰۃ چھوڑنے پر مواخذہ نہ کریں۔ یہ لوگ ابھی ابھی اسلام میں داخل ہوئے ہیں۔ آہستہ آہستہ یہ تمام اسلامی فرائض و احکام کو تسلیم کر کے سچے مسلمان بن جائیں گے۔ اللہ تعالیٰ اسلام کو قوت دے دے گا تو ہم ان کے مقابلہ پر قادر ہو جائیں گے لیکن اس وقت تو مہاجرین اور انصار میں تمام عرب و عجم کے مقابلہ کی سکت نہیں۔"

حضرت عمرؓ کی رائے سننے کے بعد حضرت ابوبکرؓ حضرت عثمانؓ کی طرف متوجہ ہوئے۔ انھوں نے بھی حرف بحرف حضرت عمرؓ کی رائے کی تائید کی۔ پھر حضرت علیؓ نے بھی اسی کی تائید کی۔ ان کے بعد تمام انصار و مہاجرین اسی رائے کی تائید میں یک زبان ہو گئے۔

یہ سن کر حضرت ابوبکرؓ منبر پر چڑھے اور فرمایا :-

واللہ لا ابرح اقوم بامر اللہ و اجاھد فی سبیل اللہ حتّٰی ینجز اللہ تعالیٰ و یفیٔ لنا عھدہ فیقتل من قتل منا شھیدا فی الجنۃ ویبقیٰ من بقی خلیفۃ اللہ فی ارضہ ووارث عبادہ الحق فان اللہ قال و لیس لوعدہ خلف" وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ " واللہ لو منعونی عقالاً کانوا یعطون رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ثم اقبل معھم الشجر والمدر والجن والانس لجاھدتھم حتّٰی تلحق روحی باللہ ان اللہ لم یفرق بین الصلوٰۃ والزکوٰۃ ثم جمعھما[1] (کنز جلد ۳ ص ۱۴۲)

ترجمہ: "خدا کی قسم! میں برابر امرِ الٰہی پر قائم رہوں گا اور خدا کی راہ میں جہاد کروں گا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اپنا وعدہ پورا فرمادے اور ہم میں سے جو قتل ہو وہ شہید ہو کر جنت میں جائے اور جو زندہ رہے وہ خدا کی زمین میں اس کا خلیفہ اور اس کے بندوں کا وارث ہو کر رہے۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے اور اس کا وعدہ کبھی خلاف نہیں ہوتا کہ " اللہ تعالیٰ نے نیک عمل کرنے والے مسلمانوں سے وعدہ کیا ہے کہ وہ ان

---

[1] ایک روایت میں یہ الفاظ بھی مذکور ہیں کہ حضرت ابوبکرؓ نے حضرت عمرؓ کو کہا، تمھیں کیا ہو گیا۔ تم کفر کی حالت میں تو بہت جری اور دلیر تھے۔ اب اسلام میں آکر کمزوری دکھاتے ہو۔

کو خلیفہ بنائے گا جیسا کہ ان سے پہلے لوگوں کو خلیفہ بنایا تھا۔ خدا کی قسم! اگر یہ لوگ جو زکوٰۃ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو دیتے تھے اس میں سے ایک رسی بھی روکیں گے تو مَیں ان سے برابر جہاد کرتا رہوں گا حتیٰ کہ میری روح خدا تعالیٰ سے جا ملے۔ خواہ ان لوگوں کی مدد کے لیے ہر درخت اور پتھر اور جن وانس میرے مقابلہ کے لیے جمع ہو جائیں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے نماز اور زکوٰۃ میں کوئی فرق نہیں فرمایا۔ بلکہ دونوں کو ایک ہی سلسلہ میں ذکر کیا ہے۔"

یہ تقریر ختم ہوتے ہی حضرت عمرؓ اللہ اکبر پکار اُٹھے اور فرمایا "جس کام کے لیے اللہ تعالےٰ نے ابوبکرؓ کا شرح صدر فرمایا میرا بھی اسی طرح پر شرح صدر ہو گیا۔

اسی واقعہ کو امام بخاریؒ نے نہایت اختصار اور تھوڑے سے اختلاف کے ساتھ یوں بیان فرمایا ہے:۔

ان اباھریرۃ قال: لما توفّی النبی صلی اللہ علیہ وسلم واستخلف ابوبکر وکفر من کفر من العرب قال عمر: یا ابابکر! کیف تقاتل الناس وقد قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم" امرت ان اقاتل الناس حتّٰی یقولوا لا الہ الا اللہ فمن قال لا الہ الا اللہ عصَمَ مِنّی ماله ونفسه الا بحقه وحسابه علی اللہ"

قال ابوبکر: واللہ لاُقاتلنّ من فرق بین الصلوٰۃ والزکوٰۃ فان الزکوٰۃ حق المال، واللہ لو منعونی عناقًا کانوا یؤدونھا الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لقاتلتھم علی منعھا"

قال عمر: فواللہ ما ھو الا ان رأیت ان قد شرح اللہ صدر ابی بکر للقتال فعرفت انه الحق (بخاری۔ کتاب استتابۃ المرتدین)

ترجمہ: "حضرت ابوہریرۃؓ نے فرمایا: جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا انتقال ہو گیا اور حضرت ابوبکرؓ خلیفہ بن گئے اور عرب کے کچھ لوگ کافر ہو گئے تو حضرت عمرؓ نے حضرت ابوبکرؓ سے کہا: آپ ان لوگوں سے کیسے لڑیں گے حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: مجھ کو لوگوں سے اس وقت تک لڑنے کا حکم ہے جب تک وہ لا الٰہ الّا اللہ نہ کہیں پھر جس نے لا الٰہ الّا اللہ کہہ لیا اس نے اپنا مال اور

اپنی جان مجھ سے بچا لیے اِلّا یہ کہ اس کے کیے کے بدلے میں اس کے مال یا جان کا نقصان ہو اور جو اس کے دل میں ہے تو اس کا حساب اللہ پر ہے۔"

حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا" خدا کی قسم! میں اس شخص سے ضرور لڑوں گا جو نماز اور زکوٰۃ میں فرق کرے گا۔ اس لیے کہ زکوٰۃ مال کا حق ہے (جیسے نماز جسم کا) خدا کی قسم! اگر یہ لوگ مجھے ایک بکری کا بچہ بھی نہ دیں گے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دیا کرتے تھے تو میں اس کی عدم ادائیگی پر ان سے ضرور لڑوں گا۔"

حضرت عمرؓ نے کہا۔ خدا کی قسم! اس کے بعد میں سمجھ گیا کہ ابوبکرؓ کے دل میں جو لڑائی کا ارادہ ہوا ہے یہ اللہ تعالیٰ نے ان کے دل میں ڈالا ہے اور میں پہچان گیا کہ حضرت ابوبکرؓ کی رائے حق ہے۔"

چنانچہ حضرت ابوبکرؓ مانعینِ زکوٰۃ کے خلاف جہاد کا عزمِ مصمّم کر کے نکل کھڑے ہوئے۔ مقام ذی القصہ تک پہنچ گئے تو حضرت علیؓ نے آگے بڑھ کر گھوڑے کی باگ تھام لی اور فرمایا:
" اے خلیفۂ رسولؐ! آج میں آپ سے وہی بات کہتا ہوں جو آپ نے غزوۂ اُحد کے دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کہی تھی۔ یعنی :-

شم سیفك ولا تفجعنا بنفسك فوالله لئن اصبنا بك لا یکون للاسلام بعدك نظاما ابدًا (کنز ج ۳۔ ص ۱۴۳)

اپنی تلوار کو میان میں کیجیے اور ہمیں اپنی ہستی سے محروم نہ کیجیے۔ خدا کی قسم اگر آپ کے قتل کی مصیبت ہم پر پڑ گئی تو پھر آپ کے بعد اسلام کا نظام کبھی درست نہ ہو گا۔

حضرت علیؓ کے اصرار پر حضرت ابوبکرؓ خود تو واپس مدینہ تشریف لائے۔ اپنی جگہ حضرت خالد بن ولید کو سپہ سالار بنا کر بھیج دیا اور جہاد کا کام جاری رکھا تاآنکہ مرتد قبائل کو راہِ راست پر نہیں لے آئے۔

مندرجہ بالا واقعات کثرت رائے کے معیار حق ہونے کے ابطال پر دو ٹوک اور قطعی فیصلہ کر دیتے ہیں۔ جہاں خلیفہ وقت تمام شوریٰ کی متفقہ رائے کو ناقابلِ تسلیم قرار دے کر اپنی رائے کے مطابق فیصلہ کرتا اور اسے نافذ بھی کر دیتا ہے اور شوریٰ نے بھی اعتراف کیا اور واقعات نے بھی ثابت کر دیا کہ واقعتہً اکیلے خلیفہ کی رائے اقرب الی الحق تھی۔

۵۔ مشاورت متعلقہ حضرت عمرؓ کا خود سپہ سالار بن کر عراق جانا

(ماخوذ از طبری جلد ۳ صفحہ ۴۸۰ تا ۴۸۲)

حضرت عمرؓ حج بیت اللہ سے فارغ ہوکر مدینہ منورہ واپس تشریف لائے تو ملک کے ہر حصے سے لوگوں کے گروہ آنا شروع ہوئے اور دیکھتے ہی دیکھتے تمام میدان مدینہ آدمیوں سے پُر نظر آنے لگا۔ فاروق اعظمؓ نے حضرت طلحہؓ کو ہراول کا سردار مقرر فرمایا۔ زبیر بن العوام کو میمنہ پر اور عبدالرحمٰن بن عوفؓ کو میسرہ پر مقرر فرماکر خود سپہ سالار بن کر اور فوج لے کر روانگی کا عزم فرمایا۔ حضرت علیؓ کو مدینہ میں اپنا قائم مقام بنایا اور فوج لے کر مدینے سے روانہ ہوئے اور چشمہ صرار پر آکر قیام کیا۔ تمام فوج میں لڑائی کے لیے بڑا جوش پیدا ہو گیا تھا۔ کیونکہ خلیفہ وقت خود اس فوج کا سپہ سالار تھا۔

حضرت عثمانؓ نے فاروقِ اعظم کی خدمت میں حاضر ہوکر عرض کیا کہ آپ کا خود عراق کی طرف جانا مناسب معلوم نہیں ہوتا۔

فاروقِ اعظمؓ نے تمام سردارانِ فوج اور عام لشکری لوگوں کو ایک جلسہ عظیم میں مخاطب کر کے مشورہ طلب کیا تو کثرتِ رائے خلیفہ وقت کے ارادے کے موافق ظاہر ہوئی۔ لیکن حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے فرمایا کہ میں اس رائے کو ناپسند کرتا ہوں۔ خلیفہ وقت کا خود مدینہ منورہ سے تشریف لے جانا خطرہ سے خالی نہیں۔ کیونکہ اگر کسی سردار کو جنگ میں ہزیمت حاصل ہو تو خلیفہ وقت بآسانی اس کا تدارک کر سکتے ہیں لیکن خدانخواستہ خود خلیفہ وقت کو میدانِ جنگ میں کوئی چشم زخم پہنچے تو پھر مسلمانوں کے کام کا سنبھلنا دشوار ہو جائے گا۔

یہ سُن کر حضرت علیؓ کو مدینہ منورّہ سے بُلا لیا گیا اور تمام اکابر صحابہ سے مشورہ کیا گیا۔ حضرت علیؓ اور تمام جلیل القدر صحابہؓ نے حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ کی رائے کو پسند کیا۔

فاروق اعظمؓ نے دوبارہ اجتماع عام کو مخاطب کر کے فرمایا کہ "میں خود تمہارے ساتھ عراق جانے کو تیار تھا لیکن صحابہ کرام کے تمام صاحب الرائے حضرات میرے جانے کو ناپسند کرتے ہیں۔ لہٰذا میں مجبور ہوں۔ اب کوئی دوسرا شخص سپہ سالار بن کر تمہارے ساتھ جائے گا۔

اب صحابہ کرام کی مجلس میں یہ مسئلہ پیش کیا گیا کہ کس کو سپہ سالار بنا کر عراق بھیجا جائے۔

حضرت علیؓ نے انکار فرمایا۔ حضرت ابوعبیدہؓ اور خالد شام میں مصروف پیکار تھے۔ بالآخر حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف نے سعدؓ بن ابی وقاص کا نام پیش کیا۔ سب نے اس کی تائید کی اور حضرت عمرؓ نے بھی پسند فرمایا۔ حضرت سعدؓ بن ابی وقاص ان دنوں صدقات کی وصولی پر مامور تھے۔ چنانچہ انھیں بلاکر سپہ سالار مقرر کیا گیا اور خود حضرت عمرؓ مدینہ منورہ واپس تشریف لے آئے۔"

اس واقعہ مشاورت سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ صرف متعدد صاحب الرائے اشخاص کی رائے عوام کی بھاری اکثریت کی رائے سے زیادہ وزنی ہوتی ہے۔ حضرت عمرؓ نے تمام فوج اور فوج کے سرداروں اور خود اپنی خواہش کے مطابق ایک معاملہ طے کیا۔ لیکن صرف چند اہل الرائے کے مشورہ کو قبول کرتے ہوئے اکثریت کی رائے کو رد کر دیا۔

۶۔ مشاورت عمرؓ ـــــ طاعون سے متعلق

عن عبداللہ بن عباس ان عمر بن الخطاب خرج الی الشام حتّٰی اذا کان بسرغ لقیہٗ اھل الاجناد ابوعبیدۃ بن الجراح واصحابہٗ واخبروہ انّ الوباء قد وقع بالشام۔ قال ابن عباس فقال عمر اُدع لی المھاجرین الاولین" فدعوتھم فاستشارھم واخبرھم ان الوبا وقع بالشام۔ فاختلفوا۔ فقال بعضھم: قد خرجت لامرٍ ولا نری ان ترجع عنہ۔ وقال بعضھم معك بقیۃ الناس واصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ولا نری تقدمھم علی ھذا الوباء۔ قال اِرْتَفِعُوْا عَنِّیْ۔

ثم قال: اُدع لی الانصار" فدعوتھم لہ فاستشارھم فسلکوا سبیل المھاجرین واختلفوا کاختلافھم فقال ارتفعوا عنّی۔

ثم قال: اُدع لی من کان ھھنا من مشیخۃ قریش من المھاجرۃ قبل الفتح۔ فدعوتھم فلم یختلف علیہ رجلان۔ فقالوا: نریٰ ان ترجع بالناس فلا تقدمھم علی ھذا الوباء

قال فنادی عمر فی الناس انی مصبحٌ علی ظھرٍ فاصبحوا علیہ"

فقال ابو عبیدۃ بن الجراح : افراراً من قدر اللہ ؟

فقال عمر : "لو غیرك قالها یا ابا عبیدۃ" وکان عمر یکرہ خلافه نعم نفِرُّ من قدر اللہ الی قدر اللہ - ارایت ان کانت اِبِلٌ فهبطت وادیاً له عدوتان احدهما خیسبة والاخری جدبة الیس ان رعیت الخیسبة لقدر اللہ ؟ وان رعیت الجدبة رعیتها لقدر اللہ ؟

قال جاء عبدالرحمٰن بن عوف مُتَغَیِّبًا فی بعض حاجته فقال : ان عندی علمًا سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم یقول : اذا سمعتم به بارض فلا تقدموا علیه، واذا وقع بارض وانتم بها فلا تخرجوا منه فراراً "

قال : فحمد اللہ عمر بن الخطاب ثم انصرف ۔

(مسلم ۔ کتاب السلام ۔ باب الطاعون)

ترجمة : "عبداللہ بن عمر کہتے ہیں کہ حضرت عمرؓ شام کی طرف نکلے اور جب مقام سرغ پر پہنچے تو اسلامی حکام فوجی سردار (ابو عبیدہ بن جراحؓ (جو اس وقت شام کے گورنر تھے) یہاں آکر ملے اور خبر دی کہ آج کل شام میں وباء (طاعون) پھیلی ہوئی ہے ۔ ابنِ عباس کہتے ہیں مجھے حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ "مہاجرین اولین کو بلاؤ" میں نے انھیں بلایا تو انھیں شام میں وبا پھیلنے کی اطلاع دی ۔ اور اس کے متعلق ان سے مشورہ طلب کیا ۔ ان کا آپس میں اختلاف ہوا ۔ بعض کہتے تھے کہ "آپ دینی کام کے لیے نکلے ہیں ۔ ہم مناسب نہیں سمجھتے کہ آپ اسے چھوڑ کر واپس جائیں ۔ اور بعض کہتے تھے " آپ کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی اور بہت سے دوسرے لوگ ہیں ۔ ہم مناسب نہیں سمجھتے کہ آپ انھیں وبا میں جھونک دیں ۔" حضرت عمرؓ نے فرمایا ۔ "میرے پاس سے اب چلے جاؤ ۔"

پھر حضرت عمرؓ نے مجھے کہا ۔ "اب انصار کو بلاؤ" میں انھیں بلا لایا ۔ پھر ان سے مشورہ کیا ۔ انھوں نے بھی مہاجرین کی طرح اختلاف کیا ۔ آپ نے انھیں بھی یہی کہا کہ "چلے جاؤ"

پھر مجھے کہا ۔ اب ان قریشی مہاجرین بزرگوں کو جمع کرو ۔ جنھوں نے فتح مکہ سے

پہلے ہجرت کی تھی۔" میں انھیں بلا لایا۔ ان میں سے دو آدمیوں نے بھی اختلاف نہ کیا اور کہنے لگے: ہم یہی مناسب سمجھتے ہیں کہ "آپ لوگوں کو اس وبا میں نہ جھونکیں۔

اب حضرت عمرؓ نے اعلان کر دیا کہ "میں علی الصبح واپس مدینہ چلا جاؤں گا۔ اور لوگ بھی واپس لوٹ آئے۔"

یہ اعلان سن کر ابو عبیدہؓ بن الجراح حضرت عمرؓ سے کہنے لگے: کیا آپ تقدیرِ الٰہی سے بھاگتے ہیں۔"

حضرت عمرؓ کہنے لگے: "کاش یہ بات ابو عبیدہ کے سوا کوئی اور کہتا۔" (کیونکہ حضرت عمرؓ ان کے خلاف بات کو پسند نہ کرتے تھے) کہنے لگے۔" ہاں! ہم اللہ کی تقدیر سے اللہ ہی کی تقدیر کی طرف بھاگتے ہیں۔ (پھر فرمایا) بھلا دیکھو تو! اگر آپ اپنے اونٹ کسی وادی میں چرانے کو لے جائیں جس کا ایک حصّہ خراب اور قحط زدہ ہو اور دوسرا سبزہ زار تو کیا یہ صحیح نہیں کہ اگر خراب حصّہ میں سے چرائیں گے وہ بھی اللہ کی تقدیر کے مطابق ہوگا اور اگر سبزہ زار سے چرائیں گے تو وہ بھی اللہ کی تقدیر کے مطابق ہوگا

ابن عباس کہتے ہیں کہ اتنے میں عبدالرحمٰنؓ بن عوف آگئے جو اپنے کسی کام کی وجہ سے غیر حاضر تھے۔ کہنے لگے۔" مجھے اس کا شرعی حکم[1] معلوم ہے۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے:" جب سنو کہ کسی شہر میں طاعون ہے تو وہاں مت جاؤ۔ اور اگر ایسی جگہ طاعون پھیل جائے جہاں تم پہلے سے موجود ہو وہاں سے مت بھاگ نکلو۔"

حضرت عمرؓ نے یہ سن کر اللہ کا شکر ادا کیا اور واپس ہو گئے۔

نتائج اس حدیث سے مندرجہ ذیل امور پر روشنی پڑتی ہے:

۱۔ جن لوگوں سے مشورہ لیا جائے۔ ان کے فرق مراتب کا لحاظ رکھا جائے۔ جو لوگ اللہ کے دین کی سربلندی اور اس کی رضا جوئی میں پیش پیش ہوں۔ مشورہ کے سب سے زیادہ حقدار وہی لوگ۔ پھر علیٰ قدر مراتب دوسرے لوگ ہوتے ہیں۔

۲۔ مشورہ کے لیے یہ ضروری نہیں کہ سب اصحابِ مشورہ ایک ہی مجلس میں اکٹھے ہوں۔ مشورہ علیحدہ علیحدہ بھی لیا جا سکتا ہے۔

---

[1] حدیث میں لفظ علم ہے۔ اس زمانہ میں علم کا اطلاق عموماً سنتِ رسولؐ یا حدیث پر ہوتا تھا۔

۳۔ مشورہ کے بعد رائے شماری یا اکثریت فیصلہ کا کوئی معیار نہیں ہے۔

۴۔ مشورہ کے بعد فیصلہ امیر کی صوابدید پر ہے۔ جب تک حضرت عمرؓ کو دلی اطمینان یا انشراحِ صدر نہیں ہوا آپ مجلس شوریٰ بدلتے رہے۔ اگر پہلی ہی پر اطمینان حاصل ہو جاتا تو دوسری یا تیسری مجلس کی ضرورت ہی نہ تھی۔

۵۔ دلی اطمینان کی وجہ یہ نہ تھی کہ تیسری مجلس نے بالاتفاق ایک ہی رائے دی اور اس میں اختلاف نہ ہوا بلکہ یہ تھی کہ ان کا اپنا اجتہاد (یا دلیل) بھی وہی کچھ تھا۔ جو تیسری مجلس نے رائے دی تھی۔ اور اسی دلیل سے آپ نے حضرت ابو عبیدہ بن الجراح کو بھی مطمئن کیا۔ اور اس بات پر اللہ کا شکر ادا کیا کہ آپ کا اجتہاد سُنت کے مطابق درست نکلا۔

۷۔ عراق کی مفتوحہ زمینوں کے متعلق

حضرت عمرؓ کی مجلسِ مشاورت

(یہ واقعہ چونکہ مالیات سے تعلق رکھتا ہے لہٰذا درج ذیل اقتباسات کتاب الخراج الامام ابو یوسف عنوان متعلقہ میں درج احادیث و روایات سے ماخوذ ہیں۔)

جب عراق اور شام کو مسلمانوں نے فتح کر لیا اور ان زمینوں پر قبضہ ہو گیا تو امرائے فوج نے اصرار کیا کہ مفتوحہ مقامات ان کے صلہ فتح کے طور پر انھیں بطور جاگیر عنایت کئے جائیں۔ اور باشندوں کو ان کی غلامی میں دیا جائے۔ حضرت عمرؓ نے عراق کی فتح کے بعد سعد بن وقاصؓ کو وہاں کی مردم شماری کے لیے بھیجا۔ کل باشندوں اور اہل فوج کی تعداد کا موازنہ کیا گیا تو ایک ایک مسلمانوں کے حصے میں تین تین آدمی پڑتے تھے۔ اسی وقت حضرت عمرؓ کی یہ رائے قائم ہو چکی تھی۔ کہ زمین باشندوں کے قبضے میں رہنے دی جائے اور ان کو ہر طرح آزاد چھوڑ دیا جائے۔

اکابر صحابہؓ میں حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف اہل فوج کے ہم زبان تھے۔ اموالِ غنیمت کے علاوہ زمینوں اور قیدیوں کی تقسیم پر بھی مُصِر تھے اور حضرت بلالؓ نے تو اس قدر جرح کی کہ حضرت عمرؓ نے دِق ہو کر فرمایا:

اللّٰھم اکفنی بلالاً۔

اے اللہ مجھ کو بلال سے نجات دے۔

حضرت عمرؓ یہ استدلال پیش کرتے تھے کہ اگر ممالک مفتوحہ علاقے فوج میں تقسیم کر دیے جائیں تو

آئندہ افواج کی تیاری، بیرونی حملوں کی مدافعت، ملک کے امن و امان قائم رکھنے کے لیے مصارف کہاں سے آئیں گے اور یہ مصلحت بھی ان کے پیشِ نظر تھی کہ اگر زمین افواج میں تقسیم کر دی گئی تو وہ جہاد کی طرف سے غافل اور جاگیرداری میں مشغول ہو جائیں گے۔ لہٰذا اموالِ غنیمت تو فوج میں تقسیم کر دینے چاہئیں اور زمین بیت المال کی ملکیت قرار دی جانی چاہیئے۔ کیونکہ اتنی کثیر مقدار میں اموال اور زمین اس کے بعد مسلمانوں کے ہاتھ لگنے کی توقع کم ہی نظر آ رہی تھی۔

حضرت عبدالرحمٰن بن عوف کہتے تھے کہ جن تلواروں نے ملک کو فتح کیا ہے۔ انہی کو زمین پر قبضے کا بھی حق ہے۔ آئندہ نسلیں اس میں مفت میں کیسے شریک ہو سکتی ہیں ؛ لیکن حضرت عمرؓ اس بات پر مُصر تھے کہ جب وسائل موجود ہیں تو مملکتِ اسلامیہ کو ایک فلاحی مملکت بنانا ضروری ہے اور اس میں جملہ مسلمانوں کا خیال رکھنا چاہیئے جیسا کہ بخاری کی درج ذیل حدیث سے بھی واضح ہے۔

قال عمر: لولا اٰخر المسلمین ما افتتحت قریۃً الا قَسَمْتُها بین اهلها کما قسم النبی صلی الله علیه وسلم خیبر۔ (بخاری کتاب الجهاد والسیر۔ باب الغنیمة لمن شهد الوقعة)

ترجمہ: حضرت عمرؓ نے کہا: "اگر مجھے پچھلے مسلمانوں کا خیال نہ ہوتا تو میں جو بستی فتح کرتا اسے فتح کرنے والوں میں بانٹ دیتا جیسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خیبر کو بانٹ دیا تھا۔"

جہاں تک اسلامی مملکت کے استحکام اور جملہ مسلمانوں کی خیر خواہی کا تعلق تھا۔ حضرت عمرؓ کو اپنی رائے کی اصابت کا مکمل یقین تھا لیکن وہ کوئی ایسی نص قطعی پیش نہ کر سکے تھے جس کی بنیاد پر وہ مجاہدین، حضرت عبدالرحمٰن بن عوف یا حضرت بلال کو قائل کر سکیں۔

چونکہ دونوں طرف دلائل موجود تھے۔ لہٰذا حضرت عمرؓ نے فیصلہ کے لیے مجلسِ مشاورت طلب کی۔ یہ مجلس دس افراد پر مشتمل تھی۔ پانچ قدماء مہاجرین میں اور پانچ انصار (قبیلہ اوس اور خزرج) میں سے اس مجلس میں شریک ہوئے۔ حضرت عثمان، حضرت علیؓ اور حضرت طلحہؓ نے حضرت عمرؓ کی رائے سے اتفاق کیا۔ تاہم کوئی فیصلہ نہ ہو سکا۔ کئی دن تک یہ بحث چلتی رہی۔

حضرت عمرؓ کو دفعتاً قرآن مجید کی ایک آیت یاد آئی جو بحث کو طے کرنے کے لیے نص قاطع تھی۔ اس آیت کے ابتدائی فقرے وَالَّذِيْنَ جَآءُوْ مِنْۢ بَعْدِهِمْ" (سورہ حشر) سے حضرت عمرؓ نے یہ استدلال کیا کہ فتوحات میں آئندہ نسلوں کا بھی حق ہے۔ لیکن اگر اسے فاتحین میں تقسیم کر دیا جائے تو آنے والی نسلوں کے لیے کچھ باقی نہیں رہتا۔ اب حضرت عمرؓ نے کھڑے ہو کر نہایت پُرزور تقریر فرمائی: جس میں آپ نے زکوٰۃ، غنیمت اور فے کی تقسیم کے بارے میں یوں وضاحت فرمائی۔

عن مالك بن اوس قال قرأ عمر بن الخطاب اِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَآءِ وَالْمَسَاكِيْنَ حتّٰى بلغ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ۔

ثُمَّ قَرَأَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَلِلرَّسُوْلِ حتّٰى بلغ وابن السبيل ثم قال هذه لهٰؤُلاءِ۔

ثم قرأ مَآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ مِنْ اَهْلِ الْقُرٰى حتّٰى بلغ للفقراء ...... وَالَّذِيْنَ جَآءُوْ مِنْۢ بَعْدِهِمْ" ثُمَّ قال هذه استوعبت المسلمين عامّةً فلئن عشت فليأتين الراعي وهو بسرو وحمير نصيبه منها لم يعرق فيها جبينهٗ۔ رواه في شرح السنة (بحواله مشكوٰة۔ باب الفئ)

مالک بن اوسؓ سے روایت ہے: کہ حضرت عمر بن الخطابؓ نے یہ آیت پڑھی اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ وَالْمَسٰكِيْنَ .... یہاں تک کہ علیمٌ حکیمٌ تک پہنچے۔ پھر یہ آیت پڑھی۔ واعلموا انما غنمتم من شیءٍ .... ابن السبیل تک پھر کہا یہ ان لوگوں کا حصہ ہے۔

پھر یہ آیت پڑھی: جو چیز اللہ نے بستیوں میں اپنے رسول کے ہاتھ لگا دی یہاں تک کہ پہنچے واسطے فقیروں کے ...... اور ان لوگوں کے جو ان کے پیچھے آنے والے ہیں۔ پھر کہا اس آیت نے تمام مسلمانوں کو شامل کر دیا ہے۔ پس اگر میں زندہ رہا۔ تو سرو اور حمیر کے اس چرواہے کو بھی اس میں سے حصہ پہنچے گا جس کی پیشانی پر پسینہ نہیں آیا (یعنی جس نے جہاد کے سلسلہ میں کچھ بھی محنت نہ کی ہو)۔

اس پر سب لوگوں نے یک زبان ہو کر کہا ۔ بلاشبہ آپ کی رائے صحیح ہے :-

نتائج اس واقعہ سے درج ذیل اُمور پر روشنی پڑتی ہے :-

۱۔ امیر فیصلہ کرتے وقت کثرت رائے کا پابند نہیں ۔ اس کا اپنا دلی اطمینان یا انشراح صدر فیصلہ کی اصل بنیاد ہے ۔ مجلس مشاورت کے انعقاد سے پہلے فوج کے سب اراکین حضرت عبدالرحمانؓ بن عوف اور حضرت بلالؓ جیسے صحابہ اس حق میں تھے ۔ کہ زمینیں اور کاشتکار غازیوں میں تقسیم کر دیے جائیں ۔ لیکن حضرت عمرؓ اس رائے کے بہت سے نقصانات دیکھ رہے تھے ۔ لہٰذا کثرتِ رائے کو قبول نہیں فرمایا ۔

۲۔ امیر محض اپنی مرضی اور رائے بھی عوام پر ٹھونس نہیں سکتا ۔ ورنہ آپ یہ نہ فرماتے ۔ "اے اللہ! مجھے بلالؓ سے نجات دے" لہٰذا آپ نے دس اکابر صحابہ (پانچ مہاجر ۔ پانچ انصار) کی مجلس مشاورت بلائی ۔ حضرت عثمانؓ ، حضرت علیؓ اور حضرت طلحہؓ جیسے صحابی آپ کے ہم خیال تھے ۔ لیکن دوسری طرف صحابہ کی کثیر تعداد تھی ۔ علاوہ ازیں عہدِ نبوی کی نظیر (جنگِ خیبر میں یہودیوں کی زمین کی غازیوں میں تقسیم) بھی ان کے حق میں جاتی تھی ۔ لہٰذا کوئی فیصلہ نہ ہو سکا ۔

۳۔ حضرت عمرؓ دین کی سربلندی کے لیے جو انتہائی ذہنی کاوش کرتے رہتے تھے ۔ اس کے نتیجہ میں اللہ کی توفیق سے آپ کو ایک آیت یاد آگئی ۔ جو آپ کی رائے کے عین مطابق تھی ۔ اس دلیل کی بنا پر آپ نے بڑی شد و مد سے اپنا فیصلہ صادر فرما دیا جس کے آگے سب نے سرِ تسلیم خم کر دیا ۔ جس سے ثابت ہوتا ہے کہ فیصلہ کی اصل بنیاد کثرتِ رائے نہیں بلکہ دلیل کی قوت ہے اور شرطِ میرِ مجلس کا انشراح صدر !

ضمنی مباحث

کیا کثرت رائے معیارِ حق ہے؟

ہم پہلے اسلامی نقطۂ نظر سے یہ ثابت کر چکے ہیں کہ دلیل کے مقابلہ میں کثرتِ رائے کی کوئی حیثیت نہیں۔ اب جمہوریت پرستوں کی مجبوری یہ ہے کہ جمہوری نظام "کثرت رائے بطور معیار حق"، کے اُصول کے بغیر ایک قدم بھی نہیں چل سکتا۔ پھر اس اُصول کو برقرار رکھنے کے لیے اس نظام کو یہ سہارا بھی لینا پڑا ——— ہر بالغ ——— مرد ہو یا عورت ——— کے ووٹ (رائے عقل و دانش) کی قیمت یکساں قرار دی جائے۔ اس اصول کو سیاسی مساوات کا نام دیا گیا۔

ہر ووٹ کی یکساں قیمت

اس طرزِ انتخاب میں ہر چھوٹے اور بڑے، اچھے اور بُرے، عالم اور جاہل، نیک اور بدکردار کے ووٹ یا رائے کی قیمت یکساں قرار پاتی ہے۔ یہ نظریہ بھی قرآنی آیات کے صریح خلاف ہے۔ مثلاً:۔

ا۔ نیک اور بدکردار کے ووٹ کی قیمت یکساں نہیں ہے۔ ارشاد باری ہے:۔

اَفَمَنْ کَانَ مُؤْمِنًا کَمَنْ کَانَ فَاسِقًا لَا یَسْتَوٗنَ (۳۲/۱۸)

بھلا جو مومن ہے وہ اس شخص کی طرح ہو سکتا ہے۔ جو نافرمان ہو؟ دونوں برابر نہیں ہو سکتے۔

ب۔ اسی طرح وہ شخص جو کسی نمائندہ یا سربراہ کے انتخاب پر اس کی اہلیتوں اور ذمہ داریوں سے واقف ہے۔ اس کی رائے کی قدر و قیمت اتنی ہی قرار پانا جتنی ایک ان معاملات سے بالکل بے شعور آدمی کی ہے۔ یہ سخت ناانصافی کی بات ہوتی ہے۔ ارشادِ باری ہے:۔

هَلْ یَسْتَوِی الَّذِیْنَ یَعْلَمُوْنَ وَالَّذِیْنَ لَا یَعْلَمُوْنَ (۳۹/۹)

ترجمہ: کیا عالم اور جاہل برابر ہو سکتے ہیں؟

دوسرے مقام پر فرمایا:۔

هَلْ يَسْتَوِى الْاَعْمٰى وَالْبَصِيْرُ (۱۳/۱۶)

کیا اندھا اور آنکھوں والا برابر ہیں ؟

ج - اسی طرح اچھے اور بُرے میں تمیز نہ کرنا بھی ناانصافی کی بات ہے۔ ارشاد باری ہے :-

قُلْ لَّا يَسْتَوِى الْخَبِيْثُ وَالطَّيِّبُ وَلَوْ اَعْجَبَكَ كَثْرَةُ الْخَبِيْثِ (۵/۱۰۰)

کہہ دیجیے - ناپاک اور پاک برابر نہیں ہوسکتے ۔ خواہ ناپاک (چیزوں یا لوگوں) کی کثرت آپ کو بھلی معلوم ہو۔

کثرت رائے پر فیصلہ

یہ تو ایک ضمنی بحث چل نکلی - بات کثرت رائے سے متعلق ہو رہی تھی - ہاں تو جمہوریت میں فیصلہ کا طریق کار یہ ہوتا ہے ۔ کہ معاملہ خواہ کوئی ہو، انتخاب ہو یا قومی اسمبلی میں قانون سازی کا کام یا اور کوئی مشورہ، آراء کی گنتی کر کے اکثریت کی بنیاد پر حق و باطل یا ٹھیک اور غلط کا فیصلہ کر دیا جاتا ہے ۔ جب ان سے یہ کہا جاتا ہے کہ اسلامی نظر سے یہ اُصول غلط ہے اور قرآن کریم میں تقریباً ۹۱ آیات ایسی ہیں ۔ جن میں لوگوں کی اکثریت کو ظالم، فاسق، جاہل، مشرک وغیرہ قرار دیا گیا ہے (جنھیں طوالت کی وجہ سے ہم یہاں درج نہیں کر رہے) نیز حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کو اکثریت کے تتبع سے سختی سے منع کیا گیا ہے تو ان آیات کے متعلق سیاسی قائدین اور جمہوریت نواز یہ جواب دیا کرتے ہیں کہ "ایسی سب آیات کافروں سے متعلق ہیں" حالانکہ ان کا مخاطب معاشرہ ہے نہ کہ محض کفار ۔ پھر یہ بات بھی سوچنے کے قابل ہے کہ کیا مسلمانوں میں فاسق، ظالم، جاہل یا مشرک نہیں ہوسکتے ۔ اس رفع التباس کے لیے ہم ذیل میں دو ایسی آیات درج کرتے ہیں جن کے مخاطب صرف مسلمان ہیں ۔ مثلاً ارشادِ باری ہے :-

وَمَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ اَكْثَرُهُمْ اِلَّا وَهُمْ مُّشْرِكُوْنَ (۱۲/۱۰۶)

اور اکثر لوگ خدا پر ایمان لاتے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ شرک بھی کرتے ہیں ۔

اسی طرح دوسری آیت صحابہؓ کرام سے متعلق ہے ۔ معرکہ حنین کے موقع پر صحابہ کرام اپنی کثرت کی وجہ سے اترانے لگے ۔ تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا :-

وَيَوْمَ حُنَيْنٍ اِذْ اَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ فَلَمْ تُغْنِ عَنْكُمْ شَيْئًا وَّ ضَاقَتْ عَلَيْكُمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ (۹/۲۵)

اور جنگِ حنین کے دن جب تم کو (اپنی جماعت کی) کثرت پر ناز تھا تو وہ تمہارے کچھ بھی کام نہ آئی اور زمین اپنی فراخی کے باوجود تم پر تنگ ہو گئی۔

اکثریت کی گمراہی کو جائز بنانے کے لیے یہ جواب بھی دیا جاتا ہے کہ سب اوامر و نواہی تو قرآن و سنت میں موجود ہیں۔ مشورہ صرف مباح امور میں ہوتا ہے۔ اور صرف مباح اُمور میں مشورہ سے گمراہی کا امکان ختم ہو جاتا ہے۔

مَیں کہتا ہوں کہ مشورہ مباح اُمور میں ہو یا انتظامی اُمور میں، دیکھنا تو یہ ہے کہ مشیروں کی ذہنیت کیا ہے اور ان کی اہلیت کیسی ہے؟ اب دیکھیے کہ موجودہ جمہوریت اور اسلام میں صرف "مشورہ" ایک قدرِ مشترک ہے۔ لیکن مشورہ کے طریق کار، غرض و غایت، فیصلہ کا طریق، امیر کا اختیار کئی ایسے ضمنی مباحث ہیں جن میں اختلاف ہے اور دونوں راہیں الگ الگ ہو جاتی ہیں۔ (یہی مباحث کتاب کا اصل موضوع ہیں) لیکن اس کے باوجود جمہوریت نواز اس طرزِ انتخاب کو اسلام کے عین مطابق قرار دے رہے ہیں۔ اور اسلام ہی کے احکامات اور تاریخی واقعات کی من مانی تعبیر کر کے اور حقائق کو مسخ کر کے اپنے دعویٰ کا ثبوت بھی پیش کر رہے ہیں۔ تو پھر اس کے بعد ایسا کونسا مباح مشورہ طلب امر باقی رہ جائے گا۔ جسے حل تو عوامی خواہشات اور کثرت رائے سے کر لیا جائے اور اس کا ثبوت اسلام سے پیش نہ کیا جا سکے۔ لہٰذا جب تک مشیر متقی اور علوم اسلامیہ سے واقف نہ ہوں گے۔ مباح اُمور میں مشورہ بھی ضلالت کی طرف ہی لے جائے گا۔

مشورہ کا فیصلہ اور میر مجلس کا اختیار

ہم بالوضاحت ثابت کر چکے ہیں کہ اسلامی شوریٰ میں آخری فیصلہ کا اختیار میر مجلس کو ہوتا ہے اور اس فیصلہ میں وہ کثرت آراء کا پابند نہیں بلکہ دلیل کی قوت پر انحصار کرتا ہے۔ اگر فریقین کے پاس کوئی دلیل نہ ہو یا مساوی وزن کے دلائل ہوں۔ یا دلائل کی قوت میں صحیح اندازہ نہ لگایا جا سکے۔ تو قطع نزاع کے لیے آخری اور مجبوری شکل کثرت رائے کی بنیاد پر میر مجلس فیصلہ کر دیتا ہے۔ لیکن جمہوری نظام میں کثرتِ رائے ہی معیارِ حق اور اسی کے مطابق سب فیصلے سرانجام پاتے ہیں۔ میر مجلس مجبور محض ہوتا ہے۔ یا زیادہ سے زیادہ اس کے ووٹ کی قیمت دو ووٹوں کے برابر سمجھی جاتی ہے اور یہ اس نظام کی مجبوری ہے۔ جس کی طرف ہم پہلے اشارہ کر چکے ہیں۔

اب میرِ مجلس کو بے اختیار اور کثرت رائے کو معیارِ حق ثابت کرنے کے لیے جو عقلی اور نقلی دلائل پیش کیے جاتے ہیں وہ بھی ملاحظہ فرمالیجیے۔

کثرت رائے کے حق میں دلائل

کہا یہ جاتا ہے کہ "مشورہ طلب کرنے کے بعد اگر امیر مختار ہو چاہے تو اسے قبول کرلے اور چاہے تو رد کرے یہ روحِ مشورہ کے خلاف ہے۔ مشاورت میں فیصلہ کا قدرتی اصُول کثرتِ رائے کا اصُول ہی ہے۔ اس لیے امیر کو کوئی حق نہیں کہ وہ شوریٰ کی اکثریت کے فیصلہ کو ٹھکرا دے۔ مشورہ طلب کرنا اور اسے قبول نہ کرنا ایک لغو اور فضول بات ہے[۱] ایسی صورت میں مشورہ طلب کرنے یا مشورہ دینے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ یہ صورتِ حال امیر کو منزہ عن الخطا قرار دینے اور مقامِ خداوندی پر فائز کر دینے کے مترادف ہے۔"

یہاں فیصلہ طلب امر صرف یہ ہے کہ آیا "مشاورت میں کثرت رائے کا اصُول" فی الواقعہ قدرتی ہے بھی یا نہیں۔ ہمارے خیال میں یہ مفروضہ ہی سرے سے غلط ہے۔ اس کا عقلی جواب تو یہ ہے کہ ایک طرف دس آدمی عام عقل کے ہوں اور دوسری طرف صرف ایک ہی تجربہ کار اور پختہ کار تو آپ اپنے ذاتی مشورہ کے لیے یقیناً اس ایک سمجھدار اور تجربہ کار آدمی کی طرف رجوع کریں گے۔ اور آپ ذرا غور فرمائیں تو معلوم ہو جائے گا کہ اس کائنات کا پورا نظام ہی اس اصُول پر قائم ہے کہ کسی پختہ کار اور سمجھ دار آدمی کی طرف رجوع اور اس کا اتباع کیا جائے مگر پارلیمنٹ کا یہ حال ہے کہ اگر ۱۰۰ سے ۵۱ آدمی شراب کے حق میں ووٹ دے دیں تو وہ جائز قرار پاتی ہے۔

اور نقلی جواب یہ ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجلسِ "مشاورت متعلقہ اُساریٰ بدر" کے بھرے مجمع میں حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کو مخاطب کر کے فرمایا تھا۔

لو اجتمعتما ما عصیتکما (درمنثور)

اگر یہ دونوں ہم رائے ہو جاتے تو میں ان کا خلاف نہ کرتا۔

گویا آپ کے نزدیک ان دو بزرگوں کی رائے باقی سارے مجمع پر بھاری تھی اور جیش اُسامہ کی روانگی اور مانعینِ زکوٰۃ کے بارے میں اکیلے حضرت ابوبکرؓ کی رائے ساری شوریٰ پر بھاری تھی۔

---

[۱] یہ خالص جمہوری ذہن کی عکاسی ہے۔ اہلِ شوریٰ کے ذہن اس سے بالکل مختلف ہوتے ہیں۔

کثرتِ رائے کے متعلق فقہائے کے ارشادات

۱- خلفائے راشدین ہر فرد سے مشورہ نہیں کرتے تھے بلکہ ان لوگوں سے مشورہ کرتے تھے، جن سے خطاب کرتے ہوئے ایک بار عمرؓ نے فرمایا تھا :-

"تمھیں عوام نے اس منصب پر فائز نہیں کیا۔ بلکہ اس منصب کے لیے تمھیں اس لیے اہل قرار دیا گیا ہے کہ تمھارا تعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے قریبی تھا اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بھی تمھیں عزیز رکھتے تھے" (طبری - بحوالہ واقعہ کربلا - ابوبکر غزنوی)

۲- امام شافعیؒ فرماتے ہیں :-

"حاکم کو مشورے کا حکم صرف اس لیے دیا جاتا ہے کہ مشیر اس کو ان امور سے آگاہ کرے جس کی طرف اس کا دھیان نہیں گیا اور اس کی دلیل سے اس کو مطلع کرے۔ یہ حکم اس لیے نہیں دیا گیا کہ حاکم مشیر کے مشورہ یا بات کی پیروی کرے کیونکہ اللہ اور اللہ کے رسول کے سوا کسی کی بھی پیروی کرنا فرض نہیں" (فتح الباری باب قولہ تعالیٰ وامرھم شوریٰ بینھم)

۳- امام ابن تیمیہ کہتے ہیں :-

"اگر شورائیہ کے کسی فرد نے کتاب وسُنّت اور اجماع کے مسئلہ کی کوئی واضح دلیل پیش کردی تو اس وقت خواہ کتنی بڑی جمعیت ایک طرف ہوجائے اور اس سے کتنے بڑے بھونچال کا خطرہ ہو تو بھی اسے خاطر میں نہ لایا جائے۔ اگر دلائل کے لحاظ سے بھی اختلاف پیدا ہوجائے تو میر مجلس کو اس رائے پر فیصلہ کرنا چاہیئے جو کتاب وسنت کے زیادہ قریب اور مشابہ ہو۔ (السیاستہ والشرعیہ)

اسلامی مشاورت کا امیر مطلق العنان نہیں ہوتا بلکہ دلیل اور آراء کا محتاج ہوتا ہے۔ وہ خود بھی ذہنی کاوش کرکے معاملہ مطلوبہ میں وہ پہلو اختیار کرتا ہے جو اقرب الی الحق ہو۔ محض اس بنا پر کہ اسے ترجیحی پہلو اختیار کرنے کا حق شریعت نے دیا ہے۔ اسے "منزہ عن الخطاء اور مقام خداوندی پر فائز" کے القاب سے نوازنا کہاں تک درست ہے؟

ہمارا دستور اور امیر کا اختیار

حیرت کی بات یہ ہے کہ موجودہ دستور جو خالص جمہوری قدروں پر ترتیب دیا گیا ہے، نے بھی سربراہِ مملکت کو مشورہ قبول کرنے کا پابند قرار نہیں دیا ہے۔ یہاں ہم تحریک آزادی و دستور پاکستان (مؤلفہ

فاروق اختر نجیب) کے چوتھے ایڈیشن سے چند اقتباس پیش کرتے ہیں :-

۱۔ " وزراء کا دوسرا کام حکومت کی پالیسی کی تشکیل میں صدر کو مشورے دینا ہے۔ اس سلسلہ میں صدر جب چاہے ان سے مشورہ طلب کر سکتا ہے مگر وہ ان کے مشورے کو قبول کرنے کا پابند نہیں " (ص ۴۴۴)

۲۔ " صدر سپریم کورٹ کے چیف جسٹس اور اس کے مشورے سے دوسرے ججوں کا تقرر کرتا ہے۔ اسی طرح وہ سپریم کورٹ کے چیف جسٹس اور متعلقہ صوبہ کے گورنر کے مشورہ سے ہائی کورٹوں کے چیف جسٹس ۔۔۔ اور سپریم کورٹ کے چیف جسٹس، متعلقہ صوبہ کے گورنر اور متعلقہ ہائی کورٹ کے چیف جسٹس کے مشورہ سے ہائی کورٹ کے ججوں کا تقرر کرتا ہے۔ گویا متذکرہ افراد سے وہ صرف مشورہ کرنے کا پابند ہے۔ اس مشورہ کو قبول کرنے کا پابند نہیں " (ص ۴۳۴)

تو ایک ایسا ملک جہاں انتخابات سے لے کر قانون سازی تک تمام فیصلے اکثریت کی بنیاد پر طے پاتے ہیں۔ اس کے دستور میں بھی سربراہ مملکت کو مشورہ کرنے کا پابند تو بنایا گیا ہے مگر اسے قبول کرنے کا پابند نہیں بنایا گیا تو پھر ہمارے یہ جمہوریت نواز دوست پہلے اپنے گھر کی خبر کیوں نہیں لیتے ؟ ان مشیروں سے صدرِ مملکت مشورہ ہی کیوں طلب کرتا ہے جب کہ وہ ان مشوروں کو قبول کرنے کا پابند ہی نہیں۔

اکثریت کے معیارِ حق ہونے کے دلائل

اکثریت کے معیارِ حق ہونے کی دلیل میں مندرجہ ذیل دو آیات پیش کی جاتی ہیں۔

پہلی دلیل : یَاأَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا أَطِيْعُوا اللّٰهَ وَأَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنْكُمْ فَإِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ إِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ (۴/۵۹)

اے ایمان والو ! خدا اور اس کے رسولؐ کی فرمانبرداری کرو اور جو تم میں سے صاحبِ حکومت ہیں ان کی بھی اور اگر کسی بات میں تم میں اختلاف واقع ہو تو اس میں خدا اور اس کے رسول (کے حکم) کی طرف رجوع کرو۔

اس آیت سے یہ ثابت کیا جاتا ہے کہ امیر کا فیصلہ قطعی اور حتمی نہیں ہو سکتا وہ مختارِ محض نہیں۔ اس سے اختلاف کیا جا سکتا ہے۔ اندریں صورت قرآن و سنت کی طرف رجوع کرنا چاہیئے۔

اس آیت میں امیر سے اختلاف کی گنجائش تک تو بات درست ہے مگر یہ تو نہیں کہا گیا کہ اندریں صورت امیر کو چاہیئے کہ وہ کثرتِ رائے کا احترام کرے۔ پھر بھی قرآن وسنت کی طرف رجوع کرنے، اللہ کی رضا معلوم کرنے اور اس سے مطابق فیصلہ کرنے کی ہدایت کی گئی ہے اور یہ جھگڑا امیر اور کسی ایک فرد کا بھی ہو سکتا ہے اور امیر اور شوریٰ یا بہت سے افراد کا بھی۔ اور خلافتِ راشدہ کے دَور میں ایسے کئی واقعات ملتے ہیں کہ امیر اور عامۃ الناس کے درمیان جھگڑا ہوا۔ پھر اس کا فیصلہ قرآن وسُنّت کے مطابق ہوا۔ مثلاً :۔

۱۔ **امیر اور فرد کا جھگڑا**۔ حضرت عمرؓ اپنے دورِ خلافت میں مسجد نبوی کی توسیع کرنا چاہتے تھے۔ حضرت ابی بن کعبؓ کا مکان اس توسیع میں حائل تھا۔ آپ نے حضرت ابی بن کعب کو کہا کہ اس مکان کی قیمت لے کر فروخت کر دیں تاکہ توسیع کے سلسلہ میں رکاوٹ نہ ہو۔ لیکن حضرت ابی بن کعبؓ نہیں مانتے تھے۔ معاملہ نے طول کھینچا تو بالآخر فریقین نے حضرت زید بن ثابتؓ کو ثالث تسلیم کر لیا (ثالث بھی عدالت کے قائم مقام ہوتا ہے۔ ایسے تنازعات میں عدالت کی طرف بھی رجوع کیا جا سکتا ہے اور ثالث کی طرف بھی) حضرت زید بن ثابتؓ نے فریقین کے دلائل سُن کر فیصلہ حضرت عمرؓ کے خلاف دے دیا[1]۔ جب فیصلہ ہو چکا تو حضرت ابی بن کعب نے یہ یہ مکان قیمتاً دینے کی بجائے فی سبیل اللہ ہی دے دیا۔

۲۔ **امیر اور شوریٰ کا جھگڑا**۔ عراق کی مفتوحہ زمینوں کے بارے میں ہوا۔ دونوں طرف دلائل قوی تھے اور معاملہ ختم ہونے میں نہ آتا تھا۔ حضرت عمرؓ اس معاملہ میں کئی دن تک سخت پریشان رہے۔ اور قرآن وسنت میں ذہنی کاوش کرتے رہے۔ بالآخر بتوفیقِ الٰہی ان کو ایک ایسی آیت یاد آگئی جو ان حالات پر فٹ بیٹھتی تھی اور حضرت عمرؓ کے دلائل کے حق میں نص قطعی کا حکم رکھتی تھی۔ آپ نے بھرے مجمع میں یہ آیت سُنائی اور اپنا فیصلہ صادر کر دیا۔ جس کے آگے سب نے سرِ تسلیم خم کر دیا۔

یہ تھا "ردوہ الی اللہ والرسول" کا مطلب۔ افراد کی آزادیٔ حق گوئی اور امیر کی غیر مطلق العنانی۔ پھر ہم تو یہ سمجھنے سے بھی قاصر ہیں کہ یہ آیت جمہوریت نوازوں کے حق میں ہے یا ان کے مخالف؟ یہاں تنازعات کے لیے دلیل کی طرف رجوع کیا جائے گا نہ کہ اِسے کثرتِ رائے

---

[1] بیہقی، السنن کبریٰ ج ۱ ص ۱۳۶ ۔ دائرۃ المعارف حیدرآباد دکن۔ طبع اوّل ۱۲۵۵ھ

کے سپرد کیا جائے گا۔

دوسری دلیل

مندرجہ ذیل آیت بھی اس ضمن میں پیش کی جاتی ہے :۔

وَمَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى وَ يَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَنُصْلِهٖ جَهَنَّمَ وَ سَآءَتْ مَصِيْرًا ۔ (۴/۱۱۵)

ترجمہ : اور جو شخص سیدھا راستہ معلوم ہونے کے بعد پیغمبر کی مخالفت کرے اور مومنوں کے رستے کے سوا اور رستے پہ چلے تو جدھر وہ چلتا ہے ہم اسے ادھر ہی چلنے دیں گے اور (قیامت کے دن) جہنم میں داخل کریں گے اور وہ بُری جگہ ہے۔

کہا یہ جاتا ہے اس آیت سے جہاں اجماع کی حجیت ثابت ہوتی ہے۔ وہاں یہی آیت اکثریت کے فیصلے کے واجب الاتباع ہونے پر بھی دلائل کرتی ہے۔ پھر اس ضمن میں حدیث علیکم بالسواد الاعظم بھی پیش کی جاتی ہے کہ یہ حدیث بھی اکثریت کی رائے کے واجب الاتباع ہونے پر نص قطعی ہے۔

ہمیں یہ تسلیم ہے کہ فی الواقع اس آیت سے اجماع کی حجیت ثابت ہوتی ہے۔ مگر اس سے اکثریتی فیصلہ کو واجب الاتباع قرار دینا بہت بڑا فریب اور قطعاً غلط ہے جس کی وجوہ درج ذیل ہیں :۔

۱۔ اجماع کے معنی اتفاق رائے ہے۔ کثرت رائے نہیں۔

۲۔ اجماع صرف صحابہ کا حجت ہے۔ اس کے بعد کے ادوار میں اُمت کے اجماع کا حجت ہونا بذاتِ خود مختلف فیہ مسئلہ ہے۔

۳۔ بعد کے ادوار کا اجماع ثابت کرنا اور ثابت ہونا فی نفسہٖ بہت مشکل امر ہے (یہ مفصل بحث موجودہ طرزِ انتخاب کے اجماع سکوتی" میں ملاحظہ فرمائیے)

پھر اگر معاملہ ایسا ہی ہے جیسا یہ لوگ کہتے ہیں تو کیا اسمبلیوں میں اکثریتی فیصلے کے خلاف ووٹ دینے والے سب جہنمی ہوتے ہیں؟ حزبِ اختلاف حزبِ اقتدار کے فیصلے کو دل سے کبھی تسلیم نہیں کرتا کیونکہ ان کا اپنا سیاسی عقیدہ الگ ہوتا ہے اس کے متعلق کیا خیال ہے؟

آیت کا مطلب صاف ہے۔ اکثریتی رائے سے اختلاف کرنے میں کوئی حرج نہیں۔

مگر جب اس اختلاف میں عصبیت پیدا ہوجاتی ہے ــــ خواہ یہ اختلاف مذہبی ہو یا سیاسی۔پھر اس عصبیت کے تحت جماعت کے راستہ کے علاوہ دوسرے راستہ پر چل پڑے اور اُمت واحد کے انتشار وافتراق کا ذریعہ بنے تو اس کی سزا جہنم ہے گویا یہ سزا اصل میں تعصب کی ہوتی ہے۔ نہ کہ محض اختلاف کی۔

مندرجہ ذیل ارشادِ نبوی اس بات پر پوری طرح روشنی ڈالتا ہے :۔

عن ابی هريرة عن النبی صلی الله عليه وسلم انه قال : من خرج عن الطاعة وفارق الجماعة فمات مات مَيْتَةً جاهلية ومن قاتل تحت راية عِمِيَّةٍ يغضبُ لعصبيةٍ اويدعوالی عصبة اوينصرعصبة فقتل فقتلةٌ جاهلية ۔ (مسلم ۔ كتاب الامارة باب وجوب ملازمة جماعة المسلمين)

حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا : جو شخص امیر کی اطاعت سے نکلا اور مسلمانوں کی جماعت سے الگ ہوا پھر مر گیا تو وہ جاہلیت کی موت مرا۔ اور جو شخص کسی اندھا دھند نشان کے تحت لڑائی کرتا ہے۔ عصبیت کے لیے غصہ دلاتا، عصبیت کے لیے پکارتا یا عصبیت کی مدد کرتا ہے سو مر گیا تو وہ جاہلیت کی موت مرا۔

اس حدیث سے ضمناً یہ بات بھی ثابت ہوگئی کہ حضرت سعدؓ بن عبادہ یا بنو ہاشم ــــ جنھوں نے حضرت ابوبکرؓ کی سقیفہ بنی ساعدہ میں بیعت نہیں کی تھی ــــ کی لغزش قابلِ مواخذہ نہیں۔ کیونکہ حکومتِ وقت کے وقت ان کی کوئی کارروائی ثابت نہیں۔ البتہ ایسی روایات ضرور ملتی ہیں جن سے ان کی اخوت اور اتحاد کا ثبوت ملتا ہے۔ جیسا کہ درج ذیل روایت سے واضح ہے :۔

”جب حضرت ابوبکرؓ کی خلافت منعقد ہوگئی تو حضرت ابوسفیانؓ کو بھی یہ عصبیت ہی کی بناء پر ناگوار محسوس ہوئی۔ انھوں نے حضرت علیؓ سے جاکر کہا ۔

قریش کے سب سے چھوٹے قبیلے کا آدمی کیسے خلیفہ بن گیا۔ تم اُٹھنے کے لیے تیار ہو تو میں وادی کو سواروں اور پیادوں سے بھر دوں“ مگر علیؓ نے یہ جواب دے کر ان کا منہ بند کر دیا کہ تمھاری یہ بات اسلام اور اہلِ اسلام کی دشمنی پر دلالت

کرتی ہے۔ میں ہرگز نہیں چاہتا کہ تم سوار اور پیادے لاؤ۔ مسلمان سب ایک دوسرے کے خیر خواہ اور ایک دوسرے سے محبت کرنے والے ہوتے ہیں۔ خواہ ان کے دیار اور اجسام ایک دوسرے سے کتنے ہی دُور ہوں۔ البتہ منافقین ایک دوسرے کی کاٹ کرنے والے ہوتے ہیں۔ ہم ابوبکرؓ کو اس منصب کا اہل سمجھتے ہیں۔ اگر وہ اہل نہ ہوتے تو ہم لوگ کبھی انھیں اس منصب پر مامور نہ ہونے دیتے۔" (کنز العمال ج ۵ ص ۲۳۷۴، طبری جلد ۲ ص ۴۴۹)

اگر کثرت آراء اور سوادِ اعظم ایک ہی بات ہے تو حضرت ابوبکرؓ نے مانعین زکوٰۃ سے جنگ کرنے کے سلسلہ میں جو شوریٰ منعقد کی تھی۔ اس میں آپ نے اس پُورے سوادِ اعظم کی مخالفت کیوں کی تھی؟ ان کے متعلق کیا خیال ہے؟

یہاں بھی یہ لوگ فریب کاری سے باز نہیں آتے۔ کہہ دیا جاتا ہے کہ "مانعین زکوٰۃ سے جنگ کرنا شریعت کا حکم تھا اور لشکر اُسامہ کو خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنی زندگی میں ترتیب دے چکے تھے لہٰذا اس کا بھی خلاف نہیں کیا جا سکتا تھا۔

اب سوال یہ ہے کہ اگر مانعینِ زکوٰۃ سے جنگ کرنا شریعت کا واضح حکم تھا۔ تو شوریٰ بلانے کی ضرورت ہی کیا تھی؟ اور ساری مجلس نے اس کے خلاف کیوں رائے دے دی؟

اور حقیقت یہ ہے کہ اختلاف اس بات میں نہ تھا کہ مانعینِ زکوٰۃ سے جنگ کی جائے یا نہ کی جائے؟ بلکہ اختلاف یہ تھا کہ ایسے ہنگامی حالات میں فوری طور پر یہ اقدام کرنا چاہیئے۔ یا ابھی کچھ دیر کے لیے ملتوی کر دینا چاہیئے"؟ (جیسا کہ یہ واقعہ تفصیل سے ہم ذکر کر آئے ہیں) لیکن اصل حقیقت کو یار لوگ اس لیے گول کر جاتے ہیں کہ اس سے کثرتِ رائے کی حجیت پر کاری ضرب پڑتی ہے۔

پھر کچھ ایسے واقعات بھی پیش کیے جاتے ہیں جہاں کثرتِ رائے کے مطابق فیصلہ ہوا۔ مثلاً:۔

جنگِ اُحد کے موقع پر مقابلہ شہر سے باہر نکل کر کرنا یا حضرت عمرؓ کا جنگِ نہاوند کے موقع پر کثرتِ رائے کا احترام کرتے ہوئے فوج کی کمان خود سنبھالنے کا ارادہ ترک کرنا وغیرہ وغیرہ۔

جنگِ اُحد میں جس "اکثریت" (اگر فی الواقعہ اکثریت تھی) نے باہر نکل کر لڑنے کی رائے دی۔ لیکن آپ نے اس "اکثریت" کی رائے کو ردّ کر دیا۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ امیر چاہے تو اکثریت

کی رائے قبول کرلے۔ ورنہ وہ کثرت آرا کے سامنے کھلونا نہیں ہے۔

اور جنگِ نہاوند میں حضرت عمرؓ نے اکثریت کی رائے کا احترام کرتے ہوئے فوج کی کمان سنبھالنے کا ارادہ تو کیا تھا۔ لیکن یہ ارادہ ترک تو صرف چند اہلِ شوریٰ کے رائے کے مطابق کیا۔ گویا آپ نے کثرتِ رائے کو صرف چند اہلِ شوریٰ کی رائے پر قربان کر دیا۔

تیسری دلیل ہمارے بعض دوست اکثر شکایت کرتے ہیں کہ عوام کی اکثریت کو خواہ مخواہ بدنام کیا جاتا ہے۔ عوام کی اکثریت نے جب بھی کوئی فیصلہ کیا، ٹھیک اور درست ہی کیا۔ اور اپنے ووٹ کا صحیح استعمال کیا ہے۔ مثال کے طور پر پاکستان بننے سے متعلق، یا تحریکِ ختمِ نبوت یا تحریک نظامِ مصطفیٰ کے متعلق عوام کی اکثریت صحیح فیصلہ کرتی رہی۔ لہٰذا یہ کہنا کہ عوام کالانعام کو ریاست و سیاست کا شعور نہیں ہوتا غلط نظریہ ہے۔

عوام کے فیصلہ اور شعور کی درستی یا نادرستی کی بات کا فیصلہ کرنے سے پہلے ہمیں بہرحال یہ تسلیم کرلینا چاہیئے کہ ہمارے عوام کو اسلام سے والہانہ عقیدت ہے۔ جو مثالیں اُوپر پیش کی گئی ہیں۔ ان سب میں یہی جذبہ کارفرما تھا۔ عوام کو یہ یقین دلایا گیا تھا کہ پاکستان بن گیا تو وہاں اسلامی نظامِ خلافت رائج ہوگا۔ یہی صورت تحریکِ ختمِ نبوت اور تحریک نفاذِ نظامِ مصطفیٰ کی تھی۔

دوسری حقیقت یہ ہے کہ عوام بے چارے فی الواقعہ سادہ لوح ہوتے ہیں۔ ہمارا عیار سیاستدان ہمیشہ ان کو فریب اور چکمہ دے کر اپنا مطلب حل کرتا رہا ہے۔ جب پاکستان بنا تو اسلام کے نام پر بنا۔ لیکن بعد میں مقتدر طبقہ اس سے فرار کی راہیں سوچنے لگا۔ مثلاً تحریکِ نظامِ مصطفیٰ کے دوران سیاستدانوں نے مل کر قومی اتحاد قائم کیا اور اسی اسلام کے نام پر عوام کو خطرناک قسم کا دھوکا دیا۔ یعنی انھیں یقین دلایا کہ یہاں نظامِ مصطفیٰ قائم کیا جائے گا۔ سادہ لوح عوام ان کے بھرے میں آگئے۔ زبردست تحریک چلی۔ عوام نے قربانیاں پیش کیں۔ یہاں تک کہ تحریک کو اللہ تعالیٰ نے کامیابی سے ہم کنار کر دیا۔

مگر ہمارے عیار سیاستدانوں کا اصل مقصد وزیرِ اعظم بھٹو کو اقتدار سے الگ کرنا اور نئے انتخابات کا انعقاد تھا۔ جب یہ مقصد حل ہوگیا تو ایک ممتاز سیاست دان کا بیان اخبارات میں شائع ہوا۔ کہ اس اتحاد کا مقصد محض بھٹو کو راستہ سے ہٹانا تھا۔ اور وہ حاصل ہوچکا ہے۔ اسلامی نظام کی ترویج ہمارے پروگرام میں شامل نہیں۔ چنانچہ سب سے پہلے وہ اتحاد سے نکلے بعد میں باری باری دوسرے بھی رخصت ہونے لگے۔ یہ تو اللہ کی مہربانی تھی۔

کہ اس نے ایک ایسا بندہ بروقت بھیج کر پاکستان کی مدد فرمائی جو اسلام کا شیدائی تھا۔ ورنہ ان سیاست دانوں نے تو قوم سے بدترین قسم کی غداری کی۔

اور حقیقت یہی ہے کہ عوامی رائے کو سنوارنے یا بگاڑنے، جمع کرنے یا منتشر کرنے میں ہمیشہ سیاستدانوں کا ہاتھ ہی کام کرتا رہا ہے اور کرتا رہے گا۔ عوام کی رائے سے فائدہ اُٹھانے کا فن انہیں خوب آتا ہے۔ عوام کی اپنی کوئی رائے نہیں ہوتی وُہ تو فی الواقع سادہ لوح، کالانعام اور ان شعبدہ بازوں کے آلہ کار ہوتے ہیں اسمبلیوں میں نااہل افراد کا انتخاب بھی تو آخر انہیں کے کارنامے ہیں۔

مشورہ کا مقام مختلف نظاموں میں

اب ہم یہ دیکھیں گے کہ مختلف نظام ہائے حکمرانی میں مشورہ کا مقام کیا ہے؟ ملوکیت کو عموماً استبدادی (خود رائے یا خودسر) حکومت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ چنگیز اور ہلاکو جیسے آمر بھی مشورہ کیا کرتے تھے۔ قرآن مجید میں ایسے مشوروں کا بھی ذکر موجود ہے۔

قَالَتْ يٰۤاَيُّهَا الْمَلَؤُا اَفْتُوْنِیْ فِیْۤ اَمْرِیْ مَا كُنْتُ قَاطِعَةً اَمْرًا حَتّٰى تَشْهَدُوْنِ ۝ قَالُوْا نَحْنُ اُولُوْا قُوَّةٍ وَّ اُولُوْا بَاْسٍ شَدِیْدٍ وَّ الْاَمْرُ اِلَیْكِ فَانْظُرِیْ مَا ذَا تَاْمُرِیْنَ (۲۹ / ۳۲-۳۳)

ملکہ سبا بلقیس کہنے لگی۔ اے درباریو! میرے اس معاملہ میں مجھے مشورہ دو۔ جب تک تم حاضر نہ ہو اور صلاح نہ دو میں کسی کام کو فیصل کرنے والی نہیں۔ وہ بولے (اگر جنگ کا خیال ہے تو) ہم بہت زور آور اور سخت جنگجو ہیں لیکن حکم آپ کے اختیار میں ہے۔ سو جو حکم دیں اس پر نظر کر لیجیے گا۔

حتیٰ کہ فرعون جیسا ڈکٹیٹر بھی اپنے درباریوں سے مشورہ کیا کرتا تھا۔ بموجب ارشاد باری تعالیٰ

وَجَآءَ رَجُلٌ مِّنْ اَقْصَا الْمَدِیْنَةِ یَسْعٰى قَالَ یٰمُوْسٰۤى اِنَّ الْمَلَاَ یَاْتَمِرُوْنَ بِكَ لِیَقْتُلُوْكَ فَاخْرُجْ اِنِّیْ لَكَ مِنَ النّٰصِحِیْنَ (۲۸ / ۲۰)

اور شہر کی پرلی طرف سے ایک شخص دوڑتا ہوا آیا اور کہنے لگا: اے موسیٰ! (فرعون کے) درباری تمہارے قتل کے متعلق مشورہ کر رہے ہیں۔ تم یہاں سے نکل جاؤ۔ میں تمہارا خیر خواہ ہوں۔

نظامِ خلافت میں بھی مشورہ کا حکم ہے اور جمہوریت بھی" اصولِ حکومت مشورہ" کی علمبردار ہے۔ اب ہمیں معلوم کرنا چاہیئے کہ ان میں فرق کیا ہے:۔ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اختلاف صرف دو باتوں میں ہے۔

۱۔ مشیر کون اور کیسے لوگ ہیں۔ ۲۔ مشورہ کا فیصلہ کیونکر طے پاتا ہے۔

ملوکیت میں مشورہ نہایت محدود سطح پر ہوتا ہے۔اگر اس مشورہ کا تعلق ولیعہدی سے ہو تو شاہی خاندان کے قریبی افراد سے مشورہ لیا جاتا ہے اور اگر انتظامی اُمور سے ہو تو اہلِ سرکار و دربار سے مشورہ کے بعد اس کا فیصلہ قطعی طور پر بادشاہ کے اختیار میں ہوتا ہے۔جیسا کہ مذکورہ آیت ۱؎ سے ظاہر ہے۔

جمہوریت میں ریاست کے ہر بالغ شہری کو حتیٰ کہ عورتوں کو بھی مشورہ میں شمولیت کا حقدار سمجھا جاتا ہے۔انتظامی سہولت کی خاطر پہلے نمائندوں کا انتخاب کیا جاتا ہے۔پھر یہ لوگ صدرِ مملکت کا بھی انتخاب کرتے اور مشورہ سے دوسرے قوانین بھی بناتے ہیں اس میں مشورہ کے دائرہ کو تاحدالامکان وسیع کر دیا گیا ہے۔پھر ہر شخص کی رائے کو ہم وزن قرار دیا جاتا ہے خواہ وہ مشورہ طلب امر کو سمجھ بھی نہ سکتا ہو اور فیصلہ کی بنیاد کثرتِ رائے ہے۔مشیر کی اہلیت اور تجربہ کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔مشیر کا کسی خاندان، مذہب یا نسل سے متعلق ہونا ضروری نہیں۔

خلافت میں اعتدال کی راہ اختیار کی گئی ہے۔صرف ان لوگوں سے مشورہ لیا جاتا ہے جو معاملہ کو سمجھنے اور مشورہ دینے کی اہلیت و تجربہ رکھتے ہیں۔اسلامی نقطۂ نظر سے مشورہ دینا "حق" نہیں بلکہ ایک ذمہ داری اور بوجھ ہے جو مشیر کے سر پر پڑتا ہے کہ وہ سمجھ سوچ کر نہایت دیانتداری اور خیر خواہی سے مشورہ دے، ورنہ وہ عنداللہ مسئول ہوگا۔مشورہ طلب امر میں فیصلہ کے لیے دلیل کی تلاش ہوتی ہے۔اگر فردِ واحد بھی دلیل پیش کر دے تو ساری شوریٰ کو سرِ تسلیم خم کرنا پڑتا ہے۔اگر دلیل نہ ہو یا دونوں طرف برابر وزن کے دلائل ہوں تو فیصلہ کثرتِ رائے سے ہوگا۔دلائل کو پرکھنے اور آخری فیصلہ کا اختیار امیر کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔شوریٰ کے ممبر کا کسی خاندان یا نسل سے متعلق ہونا ضروری نہیں۔البتہ یہ ضروری ہے کہ مسلمان ہی ہو۔متقی اور صاحب فہم و بصیرت ہونا اس کے لیے ضروری ہوتا ہے۔

جمہوریت نوازوں کے مطابق خلافت و جمہوریت میں "مشورہ" قدرِ مشترک تو ضرور ہے لیکن مندرجہ بالا دو باتیں موجودہ جمہوریت اور اسلامی جمہوریت میں ایک واضح خطِ امتیاز کھینچ دیتی ہیں۔

کثرتِ رائے کے معیارِ حق ہونے کے نقصانات

اب تک تو ہم ان اعتراضات کا جائزہ لے رہے تھے جو جمہوریت پرست میرِ مجلس کے فیصلہ پر مختار ہونے پر کرتے ہیں۔اب ہمیں یہ بھی دیکھنا چاہیئے کہ کثرتِ رائے کا اُصول جس پر یہ لوگ اِسقدر فریفتہ ہیں — فی نفسہٖ کیا اور کیسا ہے؟

کثرتِ رائے کو معیارِ حق قرار دینا ایک ایسی اُصولی غلطی ہے جو لاتعداد غلطیوں اور بے شمار جرائم کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے۔الیکشن کے ایام میں جو طوفانِ بدتمیزی بپا ہوتا ہے وہ صرف اس لیے ہوتا ہے کہ ہر نمائندہ کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ ووٹ حاصل کر سکے۔اب اس کوشش میں جو بھی جائز

اور ناجائز حربے استعمال کیے جاتے ہیں جس طرح فریق ثانی کی ذات پر سوقیانہ حملے کیے جاتے ہیں کینوسنگ اور جلسے جلوسوں پر جس بے دردی سے سرمایہ برباد ہوتا ہے۔ پھر انتخابی مہم انسان کے اخلاق پر کس قسم کے ناپاک اثرات چھوڑتی ہے۔ اس کی تفصیل ہم کسی دوسری جگہ درج کر چکے ہیں۔ کہیں ووٹوں کی خرید و فروخت ہوتی ہے، کہیں تعلقات کے دباؤ، کہیں غنڈہ گردی اور دھمکیوں سے، کہیں پولیس کے تعاون اور ہنگاموں سے ووٹ حاصل کیے جاتے ہیں اور بالآخر کامیابی سے وہ صاحب ہمکنار ہوتے ہیں جنھوں نے پیسہ بے دریغ خرچ کیا ہو۔ یا پھر کوئی ایسا بڑا بدمعاش اس معرکہ میں کامیاب ہوتا ہے جس کو ووٹ نہ دینے کی صورت میں تعلقات بگڑنے کی صورت میں لوگ اس سے مرعوب اور دہشت زدہ ہوں اور جو صاحب ہمہ صفت موصوف ہوں یعنی سرمایہ دار بھی ہوں اور عیار بھی تو ان کی کامیابی پر شک نہ کرنا چاہیئے۔

یہ کچھ تو الیکشن کے دوران ہوتا ہے۔ الیکشن ختم ہو جاتا ہے لیکن اس کے باقیات الصالحات باہمی خانہ جنگیاں، عداوتیں، بغض و عناد وغیرہ ابھی دلوں میں باقی ہوتے ہیں کہ دوسرے الیکشن کی آمد ہو جاتی ہے۔ اس طرح یہ سلسلہ کبھی ختم ہونے میں نہیں آتا۔

موجودہ اور مروجہ جمہوریت میں کامیاب ہونے والے ممبروں کے تفصیلی حالات کا جائزہ لیا جائے تو اس جمہوری حکومت کا خود سرامیر یا تو روپیہ نکلے گا۔ یا جبر و استبداد اور مکر و فریب۔ کیونکہ جب کثرتِ رائے کا پردہ فاش ہوتا ہے تو اس کی تہ میں یہی چیزیں کارفرما نظر آتی ہیں۔

یہ کچھ تو اسمبلیوں سے باہر ہوتا ہے۔ اب اسمبلیوں میں پھر جماعتوں کو اسی 'کثرت رائے' کی ضرورت پیش آتی ہے تو آپس میں جوڑ توڑ اور گٹھ جوڑ کا سلسلہ چل نکلتا ہے۔ اور کوئی مشورہ یا بحث شروع ہو تو بسا اوقات لڑائی جھگڑے یا ہاتھا پائی تک نوبت پہنچ جاتی ہے۔ اجلاس ہنگامہ آرائی کی وجہ سے ملتوی کر دیے جاتے ہیں۔

پھر یہ نمائندے ووٹوں کی کثرت کی بنا پر اسمبلیوں میں پہنچتے ہیں۔ عموماً خود غرض، ہوا پرست اور نااہل قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ جو لوگوں کے جان و مال کے مالک بن بیٹھتے ہیں جن کی نیت اور ہمت ابتدا ہی سے اس کے سوا کچھ نہیں ہوتی کہ انھیں حکومت کی کرسی مل جائے۔ پھر مخلوقِ خدا آرام سے رہے یا تباہ ہو۔ ان کی بلا سے۔ اور جب کوئی معاملہ زیر بحث آتا ہے۔ تو ان میں سے اکثر کو یہ معلوم ہی نہیں ہوتا کہ کس معاملہ کے متعلق رائے طلب کی جا رہی ہے۔ بس ان کا کام صرف اتنا ہوتا ہے جس طرف زیادہ ہاتھ اُٹھتے نظر آئیں ادھر ہی اپنے بھی کھڑے کر دیے۔ یا پھر اپنی پارٹی کے مفادات کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس رائے وہی میں پارٹی کے احکام کی تعمیل کرتے ہیں۔

ان تمام تر خرابیوں کی ذمہ داری صرف کثرتِ رائے کو معیارِ حق قرار دینے پر ہے۔ اگر اختلاف رائے کے وقت فیصلہ امیر مجلس کے سپرد ہو تو ان میں سے اکثر مفاسد کی جڑ کٹ جاتی ہے۔

حِصّہ سوم

خلافت و جمہوریّت کے تقابلی مباحث

(۱)

فرانس کا منشور جمہوریّت اور اسلامی جمہوریّت

جمہوریت کا موجودہ دَور انقلاب فرانس ۱۷۸۹ء سے شروع ہوتا ہے۔ واقعہ باسٹیل کے بعد ۴ راگست ۱۷۸۹ء کی شب کو جمعیت وطنیت فرانس نے اپنا مشہور منشور انقلاب شائع کیا تھا۔ جس نے تاریخ میں اوّلین فرمانِ حریت کے لقب سے جگہ پائی۔ مشہور فرانسیسی مورخ حال (CH. SEGNOBOS) نے اپنی تاریخ انقلاب میں اس منشور کا خلاصہ درج ذیل پانچ دفعات میں پیش کیا ہے:

۱۔ استیصالِ حکم ذاتی۔ یعنی حق حکم وارادہ اشخاص کی جگہ افراد کے ہاتھ میں جائے۔ شخص، ذات اور خاندان کو تسلط وحکم میں کوئی دخل نہ ہو۔ یعنی ملک ہی پریذیڈنٹ کا انتخاب کرے۔ اسی کو حقِ عزل ونصب ہو۔

۲۔ مساواتِ عامہ۔ جس کی بہت سی قسمیں ہیں۔

مساواتِ جنسی، مساواتِ خاندانی، مساواتِ مالی (حقِ ملکیت) مساواتِ قانونی، مساواتِ ملکی وشہری وغیرہ وغیرہ۔ اس بنا پر بھی پریذیڈنٹ کو عام باشندگانِ ملک پر کوئی تفوق وترجیح نہ ہو۔

۳۔ خزانہ ملکی۔ ملک کی ملکیت ہو۔ اس پر پریذیڈنٹ کو کوئی ذاتی تصرف نہ ہو۔

۴۔ اصُولِ حکومت "مشورہ" ہو۔ اور قوتِ حکم وارادہ افراد کی اکثریت کو ہو۔ نہ کہ ذات وشخص کو۔

۵۔ حریت۔ رائے وخیال اور مطبوعات (پریس) کی آزادی اسی کے تحت ہے۔

جیسا کہ ہم پہلے عرض کر چکے ہیں کہ موجودہ جمہوریت ملوکیت کی دوسری انتہا اور اس کی عین ضد ہے۔ اب ان پانچوں دفعات کی تحصیل کیجیے تو آخر میں صرف ایک ہی عنصر بسیط باقی رہے گا۔ یعنی قوت حکم و ارادہ اشخاص و ذات کے ہاتھ میں نہ ہو بلکہ جماعت و افراد کے تسلط میں ہو۔

مختصر الفاظ میں اس کی تعبیر اس ایک جملہ میں ہوسکتی ہے۔" نفی حکم ذاتی و مطلق" باقی چار دفعات میں جو امور بیان کیے گئے ہیں وہ سب کے سب اسی کے ذیل میں آجاتے ہیں۔ مساوات حقوق مالی و قانونی، اساس مشورہ و انتخاب، عدم اختیار و تصرف خزانہ ملکی و حریت آرا و مطبوعات وغیرہ سب" نفی حکم ذاتی و مطلق" ہی کی تفسیر ہیں۔

مندرجہ بالا دفعات کا مطالعہ کرنے سے یہ واضح ہو جاتا ہے۔ کہ بادشاہت کی دشمنی کے جوش میں اگر کچھ بادشاہت کے اصول اچھے بھی تھے تو جمہوریت پسندوں نے اس کی بھی مخالفت کو اپنا فرض سمجھ کر افراد کو بے لگام قسم کی آزادی کی بشارت دے دی۔

حقیقی جمہوریت اور عوامی حقوق

اس اعلان اور اس کی دفعات پر تبصرہ کرنے سے پیشتر یہ متعین کر لینا ضروری ہے کہ حقیقی جمہوریت ہے کیا ؟ کاروبارِ مملکت میں عوام کی عدم مداخلت کا نام شخصی حکومت یا ملوکیت ہے اور جس حکومت میں عوام کی مداخلت جس قدر بڑھتی جائے گی۔ اسی قدر ہی وہ جمہوری حکومت کہلانے کی مستحق ہوگی۔ بالفاظِ دیگر رئیس مملکت کے (اور اسی طرح دوسرے حکام یا اولوالامر کے) اختیارات و امتیازات —— خواہ معاشرت سے تعلق رکھتے ہوں یا معیشت سے —— جس قدر زیادہ ہوں گے اسی قدر وہ حکومت مائل بہ ملوکیت سمجھی جائے گی اور اس میں عوام کے حقوق کم ہوتے جائیں گے اور رئیس مملکت کے اختیارات جس قدر محدود ہوں گے۔ وہ حکومت مائل بہ جمہوریت سمجھی جائے گی۔ اور اس میں عوام کے حقوق کی نگہداشت زیادہ ہوگی۔

اب اسی معیار پر ہم مذکورہ منشور کی دفعات کا ترتیب وار جائزہ لیں گے جس سے :۔

۱۔ خلافت، جمہوریت اور ملوکیت کا فرق واضح ہوگا۔

۲۔ ہر صاحبِ فکر آدمی یہ اندازہ کر سکے گا کہ حقیقی جمہوریت کا علمبردار اسلام ہے یا

موجودہ مغربی جمہوریت۔
۳۔ اور یہ بھی واضح ہو جائے گا کہ عوام کے حقوق کی نگہداشت کس نظام میں سب سے زیادہ ہے۔

۱۔ استیصال حکم ذاتی | اس دفعہ کی پہلی شق یہ ہے کہ "حق حکم و ارادہ اشخاص کی جگہ افراد کے ہاتھ میں آجائے"

یہ شق ملوکیت کے عین برعکس ہے اور اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی ریاست کے تمام شہری صدرِ مملکت کے انتخاب میں یکساں حق رکھتے ہوں۔ خواہ وہ اس حق کو بالواسطہ استعمال کریں یا بلا واسطہ۔ یہیں سے جمہوریت کا مشہور سیاسی حق ـــــ حق بالغ رائے دہی (بشمول خواتین) ـــــ جنم لیتا ہے۔ اور پھر اس کے بعد ہر ووٹ کی قیمت یکساں قرار پاتی ہے۔

اسلام اس لامحدود حق کا قائل نہیں۔ اللہ تعالیٰ کے فرمان کے مطابق چونکہ معاشرہ کی اکثریت جاہل، فاسق اور ظالم لوگوں پر مشتمل ہوتی ہے وہ نہیں چاہتا کہ ریاست کے اطراف واکناف سے کوڑا کرکٹ اکٹھا کرکے مرکز میں لاکر ڈھیر کر دیا جائے[۱]۔ اسلام ایک نورِ ہدایت اور روشنی ہے جو مرکز سے نمودار ہوکر ریاست کے اطراف واکناف میں اُجالا کرتی ہے۔ اسلام میں خلیفہ کو انتخاب کرنے کا حق صرف ان لوگوں کو ہے جو اس کے نظریۂ توحید و رسالت اور آخرت پر پختہ یقین رکھتے ہیں۔ ان رائے دہندگان کے دیگر اوصاف اپنے مقام پر تفصیلاً ذکر کر دیے گئے ہیں۔

اس کی دوسری شق یہ ہے کہ: "شخص، ذات یا خاندان کو تسلط و حکم میں دخل نہ ہو۔ یعنی ملک ہی پریذیڈنٹ کا انتخاب کرے۔ اسی کو حق عزل و نصب ہو"۔

ملوکیت میں تو ظاہر ہے کہ سربراہ ایک مخصوص ـــــ شاہی ـــــ خاندان سے تعلق رکھتا ہے اور جمہوریت میں ہر شخص کو یہ سیاسی حق دیا گیا ہے کہ وہ سربراہِ مملکت بن سکے۔ خواہ کسی مذہب سے تعلق رکھتا ہو۔ لیکن اسلام میں مملکت کا سربراہ صرف مسلمان ہی ہو سکتا ہے۔ دوسرا شخص صدرِ مملکت تو کجا کسی کلیدی آسامی پر بھی فائز نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ اسلام ایک نظریاتی مملکت کا تصور پیش کرتا ہے۔

گویا پہلی دفعہ کی دونوں شقوں میں اسلام اعتدال کی راہ اختیار کرتا ہے۔

---

[۱] مشہور سیاست دان (LUCKY) اس حقیقت کا ان الفاظ میں اعتراف کرتا ہے "جمہوریت سب سے زیادہ جاہل اور نااہل لوگوں کی حکومت ہے جو لازمی طور پر تعداد میں سب سے زیادہ ہوتے ہیں"۔ (اصول سیاسیات ص ۲۱۰ از صفدر رضا ایم اے سیاسیات)

۲۔ مساواتِ عامہ

"اور اس کی بہت سی قسمیں ہیں: مساواتِ جنسی، مساواتِ خاندانی، مساواتِ مالی، مساواتِ قانونی، مساواتِ ملکی و شہری وغیرہ وغیرہ۔"

ا۔ مساواتِ جنسی سے مُراد یہ ہے کہ عورت بھی مرد کے برابر حقوق رکھتی ہے۔ خواہ یہ سیاسی حقوق جیسے حق رائے دہی، حق نمائندگی، حق منصب و عہدہ اور سیاسی جماعت بنانے کا حق یا دوسرے قانونی اور معاشرتی حقوق ہوں۔

ملوکیت میں تو سیاسی حقوق ہوتے ہی نہیں۔ جمہوریت نے اس کو لامحدود کر دیا اور اس میدان میں عورت کو بھی لاگھسیڑا ہے حتیٰ کہ وہ صدر مملکت بھی بن سکتی ہے۔ جو اسلامی نقطۂ نگاہ سے کسی صورت میں درست نہیں۔ اور یہ بحث ہم "عورت کا ووٹ" کے تحت درج کر آئے ہیں۔ رہے قانونی اور معاشرتی حقوق۔ تو ان میں اسلام عورت اور مرد میں کوئی امتیاز روا نہیں رکھتا۔

اور اس کا دوسرا مطلب یہ ہے کہ زندگی کی دوڑ میں عورتیں بھی مردوں کے دوش بدوش چلیں۔ سیاسی کے علاوہ معاشی اور دوسرے میدانوں میں بھی۔ موجودہ تہذیب نے "مساواتِ مرد و زن" کے نعرہ سے جو خاندانی مسائل پیدا کر دیے ہیں۔ اور پھر جوانی و رعنائی کے بعد عورت کو جس کس مپرسی کے میدان میں جا پھینکا ہے۔ اس کی تفصیل ہم پہلے دے چکے ہیں۔ گویا اس مسئلہ میں موجودہ تہذیب افراط اور تفریط دونوں طرح کی مضرتوں کا شکار ہے۔ جب کہ اسلام نے اس معاملہ میں اعتدال کی راہ اختیار کی ہے۔

ب۔ مساواتِ خاندانی کا ایک مفہوم تو یہ ہے کہ سربراہِ مملکت کسی بھی خاندان سے ہو سکتا ہے اور اس منشور میں غالباً یہی مطلب لیا گیا ہے۔

اب ملوکیت میں تو یہ عہدہ محض ایک مخصوص خاندان سے تعلق رکھتا ہے جمہوریت اور اسلام دونوں میں خاندان کی کوئی قید نہیں۔ تاہم اسلام ساتھ ہی ساتھ یہ پابندی ضرور لگاتا ہے کہ وہ مسلمان بھی ہو اور متقی بھی۔

اور اس کا دوسرا مطلب یہ ہے کہ معاشرہ میں بلاامتیاز ہر خاندان کی یکساں قدر و منزلت ہو۔ ملوکیت میں تو شاہی خاندان بہرحال شاہی ہوتا ہے۔ دوسرے خاندان اس

کی گرد کو بھی نہیں پہنچ سکتے۔ جمہوریت اس مساوات کی دعویدار ضرور ہے۔ مگر اس پر عمل کم دیکھا گیا ہے۔

ج۔ معاشرتی مساوات

اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ آج کے جمہوری اور مہذب ترین ممالک میں گورے اور کالے کے جھگڑے بدستور موجود ہیں۔ امیر اور غریب کے مسائل بھی بدستور ہیں۔ عبادت گاہوں میں امراء کو تو کرسیاں ملیں اور بے چارے غریب فرش پر بیٹھیں۔ حد یہ ہے کہ بعض جگہ امرا کے گرجے ہی الگ الگ ہیں۔ اور ہندوستان جیسے جمہوری ملک میں تو آج تک ذات پات کی تمیز قائم ہے۔ شودروں کی عبادت گاہیں الگ ہونا تو درکنار۔ ان کے سایہ سے ہی برہمن ناپاک ہو جاتا ہے۔ اسلام نے گورے کالے اور امیر غریب کی تمیز ختم کر کے سب کو ایک صف میں لا کھڑا کیا ہے۔ حتیٰ کہ امیر اور غلام ایک صف میں کھڑے ہیں اور جو جہاں کھڑا ہے اسے وہاں سے دوسرا ہٹا نہیں سکتا۔ یہاں شرف کا معیار ہے تو تقویٰ ہے۔ یہاں بلال حبشی جیسے پست قد، کالے رنگ اور موٹے ہونٹوں والے صحابہ کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اکثر فرمایا کرتے تھے۔

اَرِحْنَا یا بلال ——— اے بلال ہمیں (اذان کہہ کر) راحت پہنچایئے۔
اور جن کو آپ نے دنیا میں ہی جنت کی بشارت دے دی تھی۔

اور اس معاشرتی مساوات کا سبق خود اللہ تعالیٰ نے آپ کو دیا تھا۔ آپؐ چند سرداران قریش کو اسلام کے متعلق سمجھا رہے تھے کہ اتنے میں ایک نابینا صحابی ابن مکتوم آئے اور آکر ایک آیت کا مطلب پوچھنے لگے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ بات ناگوار محسوس ہوئی اور انقباض کے اثرات چہرہ پر نمودار ہونے لگے تو اللہ تعالیٰ نے عتاب نازل فرمایا تو اس کی وجہ محض یہ تھی کہ اس نابینا صحابی کی طلبِ صادق کی قدر و منزلت اللہ تعالیٰ کے ہاں قریش کے کافر سرداروں سے بہت زیادہ تھی۔

معاشرہ کی مساوات کا دوسرا پہلو "بڑائی کی نخوت" کا خاتمہ ہے۔ ایک دنیا دار معاشرہ میں وقار کا مسئلہ (QUESTION OF PRESTIGE) ایک عام بیماری ہوتی ہے۔ ماتحت کا یہ حق ہے کہ وہ بہرحال افسر کو سلام کرے۔ چاہے ماتحت بیٹھا کام کر رہا ہو اور صاحب بہادر باہر سے تشریف لائیں ورنہ ان کا وقار مجروح ہوتا ہے۔ اس طرح یہ رواج بھی عام

ہے کہ کمتر درجہ کے لوگ بڑوں کو سلام کریں ۔ یا خاندان کے افراد سربراہ خاندان کو سلام کریں ۔ اسلام نے چند ضابطے مقرر کر کے اس نخوت اور معاشرتی عدم مساوات کا علاج کر دیا ہے ۔ وہ یہ کہ ہر آنے والا بیٹھے ہوئے کو سلام کرے ۔ اسی طرح ہر سوار پر لازم ہے کہ وہ پیدل چلنے والے کو سلام کرے ۔ سربراہ خاندانہ پر لازم ہے کہ وہی گھر میں داخل ہو کر اپنے بال بچوں کو سلام کہے ۔ افسروں پہ لازم ہے کہ جب وہ دفتر میں تشریف لائیں تو اپنے ملازموں کو وہ سلام کریں ۔ اسی طرح سوار لوگوں کی نخوت کا یہ علاج ہے کہ وہ پیدل چلنے والے کو سلام کریں ۔ بزرگوں کی بزرگی کے مقامات اور بھی بہت سے ہیں ۔ اسلام نے سلام کے یہ ضابطے مقرر کر کے ان کی نخوت کا علاج اور وقار کے مسئلہ کا حل پیش کیا ہے ۔

حکام سلطنت کی بود و باش

معاشرتی مساوات کا تیسرا پہلو یہ ہے کہ حکام اپنے آپ کو برتر مخلوق سمجھتے ہوئے عوام پر اپنے دروازے بند نہ کر دیں ۔ نظام خلافت میں امیر اور حکام سے مسجد میں ملاقات کی جا سکتی ہے اور بر سر عام بازاروں میں بھی ۔ ان سے التجا بھی کی جا سکتی ہے ۔ سوال بھی اور ان پر تنقید بھی ۔ حضرت عمرؓ جب کسی کو عامل مقرر کرتے تو اس سے مندرجہ ذیل باتوں کا عہد لیا جاتا تھا ۔

۱۔ ترکی گھوڑے پر سوار نہ ہوگا ۔
۲۔ باریک کپڑے نہ پہنے گا ۔
۳۔ چھنا ہوا آٹا نہ کھائے گا ۔
۴۔ دربان نہ رکھے گا ۔ اہلِ حاجت کے لیے دروازے ہمیشہ کھلے رکھے گا ۔

یہ شرطیں اکثر پروانہ راہداری میں درج کی جاتی تھیں اور ان کو مجمع عام میں پڑھ کر سنایا جاتا تھا ۔

مندرجہ بالا شرائط میں سے پہلی تین شرائط تو معاشرتی مساوات سے تعلق رکھتی ہیں ۔ اور چوتھی عوام کے بنیادی حقوق اور معاشرتی مساوات سے متعلق ۔

عمال سے احتساب

ایک بار حضرت عمرؓ بازار میں پھر رہے تھے ۔ ایک طرف سے آواز آئی کہ "عمر ! کیا عاملوں کے لیے چند قواعد مقرر کر دینے سے تم عذابِ الٰہی سے بچ جاؤ گے ؟ تم کو یہ خبر ہے کہ عیاض بن غنم جو مصر کا عامل ہے ۔ باریک کپڑے پہنتا ہے اور دروازے پر دربان مقرر ہے ۔

حضرت عمرؓ نے محمد بن مسلمہ (انصاری) کو بلایا (یہ اکابر صحابہ میں سے تھے۔ تمام غزوات میں شریک رہے اور ایک دفعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک مہم پر تشریف لے گئے تو ان کو مدینہ میں اپنا نائب مقرر کیا تھا۔ انہی وجوہ کی بنا پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے انھیں عاملوں کے شکایات کی تحقیقات پر مقرر کیا تھا) اور کہا۔ عیاض کو جس حال میں پاؤ۔ ساتھ لے آؤ۔ محمد بن مسلمہؓ نے وہاں پہنچ کر دیکھا تو واقعی دروازے پر دربان بھی تھا۔ اور باریک کپڑے کا کرتہ پہنے بیٹھے تھے۔ اسی ہیئت اور لباس میں ساتھ لے کر مدینہ آئے۔ حضرت عمرؓ نے وُہ کرتہ اُترواکر کمبل کا کرتہ پہنایا اور بکریوں کا ایک گلّہ منگواکر حکم دیا کہ "جنگل میں جا کر چراؤ۔"

عیاض بار بار یہ کہتے تھے کہ "اس سے تو مر جانا بہتر ہے۔" حضرت عمرؓ نے فرمایا "تجھے اس سے عار کیوں ہے؟" تیرے باپ کا نام غنم اسی وجہ سے پڑا تھا کہ وہ بکریاں چرایا کرتا تھا۔"

غرض عیاض نے دل سے توبہ کی اور جب تک زندہ رہے اپنے فرائض نہایت خوبی سے سرانجام دیتے رہے۔

اسی طرح کا دوسرا واقعہ یہ ہے کہ حضرت سعد بن وقاصؓ نے کوفہ میں اپنے لیے ایک محل بنوایا تھا جس میں ڈیوڑھی تھی۔ حضرت عمرؓ نے اس خیال سے کہ اس سے اہلِ حاجت کو رکاوٹ ہوگی۔ محمد بن مسلمہ کو حکم دیا کہ جا کر ڈیوڑھی میں آگ لگا دیں۔ چنانچہ اس حکم کی پوری تعمیل ہوئی۔ اور سعدؓ بن ابی وقاص کھڑے دیکھتے رہے۔

اس کا یہ مطلب نہیں کہ عام آدمیوں کو بھی باریک کپڑے پہننا یا ڈیوڑھی بنانا ممنوع تھا بلکہ اس کی وجہ یہ تھی کہ سلطنت کے ارکان میں طرزِ معاشرت کا یہ امتیاز عوام کے دل میں اپنی کمتری کے احساس کا سبب بنتا ہے اور اس سے آقا غلام کا تصور اُبھرتا ہے۔

اب ذرا موجودہ جمہوری معاشروں پر نظر ڈالیے۔ صدر کا عوام کے درمیان مل کر بیٹھنے کا تصور ہی محال ہے۔ اور صدر کی کیا بات ہے۔ چھوٹے چھوٹے افسروں کے دفاتر اور رہائش گاہوں پر کڑے پہرے بٹھائے جاتے ہیں اور بعض صاحب بہادروں کی رسائی تک کئی کئی دن گزر جاتے ہیں مگر ملاقات نصیب ہی نہیں ہوتی۔ نقل و حرکت بھی سیف گارڈ کی کڑی نگرانی میں ہوتی ہے۔ اس لحاظ سے بادشاہت اور جمہوریت میں کیا فرق باقی رہ

رہ جاتا ہے؟ کیا یہی معاشرتی مساوات ہے کہ عوام اپنی جائز شکایات یا ضروریات کے لیے بھی ان حکام کی ملاقات کو ترستے رہیں۔ ان شکایات کا ازالہ تو دُور کی بات ہے۔

ج - مساوات مالی

یعنی اس بنا پر بھی پریذیڈنٹ کو عام باشندگانِ ملک پر کوئی تفوق و ترجیح نہ ہو۔

جمہوریت اور سرمایہ داری

یہ شق زیب منشور تو ہے مگر موجودہ جمہوری ممالک میں اس پر عمل پیرا ہونا مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے۔ صدارت کا انتخاب لڑنا تو دُور کی بات ہے۔ کسی اسمبلی یا بلدیاتی ادارے کا انتخاب لڑنے کے لیے نمائندہ کا سرمایہ دار یا جاگیر ہونا ضروری ہے۔ کیونکہ یہ طرزِ انتخاب ہے ہی ایسا کہ کافی سرمایہ کا متقاضی ہے۔ نمائندہ کو اپنی تشہیر، کنویسنگ، جلسے جلوسوں اور ضیافتوں کے لیے کثیر سرمایہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ سرمایہ خواہ وہ خود مہیا کرے یا اسے پارٹی فنڈ سے ادا کیا جائے۔ اس کے بغیر وہ انتخاب لڑ ہی نہیں سکتا۔

ملوکیت میں تو خیر اس طرح کی مالی مساوات کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ جمہوریت کے پردہ میں بھی حقیقتاً سرمایہ ہی بولتا ہے۔ پارلیمنٹ کے ممبر سب سرمایہ دار یا جاگیر دار ہوتے ہیں اور صدر تو بہر حال ان سے بڑا سرمایہ دار ہونا چاہیئے۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کا ہر وقت تجربہ کیا جا سکتا ہے۔

البتہ اسلامی نظام میں ایسی مثالیں ضرور موجود ہیں۔ حضرت عمرؓ بچپن میں بکریاں چرایا کرتے تھے اور وہ خلیفہ بنے۔ اسی طرح حضرت علیؓ بچپن میں مفلس تھے وہ بھی منصب خلافت پر فائز ہوئے۔

مالی مساوات کا ایک دوسرا مفہوم یہ بھی لیا جا سکتا ہے جسے معاشی مساوات کہا جاتا ہے اور سوشلسٹ اس کا ڈھنڈورا پیٹتے رہتے ہیں۔ تو ایسی مساوات نہ ملوکیت میں ہے نہ جمہوریت میں اور نہ اسلام میں۔

سوشلسٹ معاشرہ میں معاشی مساوات سے یہ مراد ہوتی ہے کہ حکومت سب سے ان کی املاک جبر سے چھین لے۔ اور انھیں قومی تحویل میں لے کر عوام کو بقدر سدِ رمق دے کر باقی سب کچھ پر خود قابض ہو جائے۔ بالفاظ دیگر حکومت سارے عوام کو ایک جیسا مفلس بنا کر

خود بہت بڑی مال دار اور ڈکٹیٹر بن جائے۔ تو اس قسم کی مساوات کا اسلام قائل نہیں ہے۔ کیونکہ معاشی مساوات ایک غیر فطری چیز ہے۔ ہر انسان کی ضروریات الگ الگ نوعیت اور صفت کی ہوتی ہیں۔ ایک کسان کی ضروریات ایک چیف جسٹس کی ضروریات کے مناسب اور برابر نہیں ہوسکتیں۔ حالانکہ دونوں معاشرے کے لابدی رکن ہیں۔ نظریہ "معاشی مساوات" کے ابطال کے لیے یہی ثبوت کافی ہے کہ اس پر اشتراکیت کے مادر وطن روس میں بھی آج تک صحیح طور پر عمل نہیں ہوسکا۔

معاشی مساوات سے آج کل یہ مفہوم بھی لیا جاتا ہے کہ حکومت کی طرف سے سب عوام پر وسائل رزق ایک جیسے کھلے رہیں۔ اس نظریہ کی دعویدار تو سب طرح کی حکومتیں ہیں۔ لیکن ان پر عمل مفقود ہوتا ہے۔ ملوکیت میں کلیدی آسامیاں شاہی خاندان کے لیے مخصوص ہوتی ہیں کیونکہ وہ ان کا پیدائشی حق سمجھا گیا ہے۔ جمہوریت میں کلیدی آسامیوں میں اکثر ردو بدل اور عزل و نصب ہوتا رہتا ہے، جو اکثریتی پارٹی برسر اقتدار آتی ہے۔ وہ اپنے مفادات کے پیش نظر ان آسامیوں پر اپنے آدمی براجمان کرتی ہے۔ اسلام میں نہ تو یہ مناصب کسی خاندان کا حق ہے نہ کسی اکثریتی پارٹی کا۔ سارے عوام پر ان کے دروازے کھلے ہوتے ہیں۔ شرط صرف یہ ہے کہ ان اسامیوں پر متقی اور صالح مسلمان ہی فائز ہو سکتے ہیں۔

رہا معمولی قسم کی ملازمتوں کا مسئلہ تو یہ لوگ چونکہ کاروبارِ حکومت پر اثر انداز نہیں ہوتے۔ لہٰذا اس مسئلہ میں تمام حکومتیں حسب ضرورت ہر شخص سے استفادہ کر لیتی ہیں۔ اسلام میں ایسی ملازمتیں غیر مسلموں کو بھی دی جاسکتی ہیں۔

ملوکیت اور جمہوریت دونوں سرمایہ دارانہ نظام ہیں۔ لہٰذا سرکاری ملازمتوں کے علاوہ دوسرے میدانوں میں عموماً سرمایہ دار ہی کی سرپرستی کی جاتی ہے اور انھیں کے حقوق و مفادات کا لحاظ رکھا جاتا ہے۔ سود اور ٹیکس جو سرمایہ دارانہ نظام کے اہم ستون ہیں۔ ملوکیت و جمہوریت دونوں میں یکساں طور پر پائے جاتے ہیں۔ سود سرمایہ دار کے سرمایہ میں ہر دم اضافہ کرتا رہتا ہے اور ٹیکسوں کا بار بھی بیشتر غریب عوام پر پڑتا ہے۔ صنعتی اور تجارتی ادارے بنکوں سے سود لیتے دیتے ہیں جس سے عوام کا معاشی استحصال ہوتا رہتا ہے۔ حکومت ان سودی اداروں کی سرپرستی کرتی ہے۔ لہٰذا بایں ہمہ دعویٰ یہ حقیقت اپنی جگہ برقرار

ہے کہ ان مذکورہ دونوں نظاموں میں غریب لوگوں پر وسائل رزق کے دروازے بند رہتے ہیں۔
اسلام میں سود کے بجائے زکوٰۃ کا نظام ہے اور کاروباری اشتراک کے لیے مضاربت کا اصول۔ جس کے ذریعہ محنت کش کو وسائل رزق سے وافر حصہ نصیب ہوجاتا ہے۔

د۔ قانونی مساوات

یعنی اس بنا پر بھی "پریذیڈنٹ کو عام باشندگان ملک پر کوئی تفوق وترجیح نہ ہو"۔
ملوکیت میں تو بادشاہ کی ذات خود قانون ہوتی ہے۔ اور شاہی خاندان کے دیگر افراد بھی قانون سے بالاتر سمجھے جاتے ہیں۔ لیکن حیرانگی تو یہ ہے کہ جمہوریت میں بھی بایں ہمہ دعویٰ یہی کچھ ہوتا ہے جو ملوکیت میں ہوتا ہے۔ مثلاً ہمارے پاکستان کے دستور میں آج تک (۱۹۷۳ء کے آئین میں بھی) ایسی دفعات موجود ہیں۔ جن کی رُو سے صدر مملکت، وزیر اعظم، گورنر اور وزرائے اعلیٰ پر نہ تو کوئی فوجداری مقدمہ دائر ہوسکتا ہے۔ نہ انھیں عدالت کسی ایسے فوجداری مقدمہ میں ملوث قرار دے سکتی ہے۔ اور نہ ہی ملک کی کوئی بڑی سے بڑی عدالت انھیں طلب کرسکتی ہے۔ اور یہ صرف پاکستان پر منحصر نہیں بلکہ ہر جمہوری ملک کے صدر وغیرہ کے لیے ایسی قانونی مراعات موجود ہیں۔
پھر جمہوری ممالک کے صدر جب عوامی بنیادی حقوق کو کم یا سلب کرنا چاہیں۔ تو ہنگامی حالات کا سہارا لے کر کسی وقت بھی یہ کام کرسکتے ہیں۔ اور یہ تو ہم بتلا چکے ہیں۔ کہ حقوق کا توازن کچھ اس طرح ہوتا ہے کہ عوامی حقوق بڑھ جائیں تو صدر کے حقوق خود بخود کم ہو جاتے ہیں۔ اور اگر عوام کے حقوق کم کر دیے جائیں تو صدر کے اختیار خود بخود بڑھ جاتے ہیں۔

اب اسلامی نظام کی طرف آئیے: قانونی مساوات یہ ہے کہ خود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے آپ کو پیش کرکے یہ اعلان کردیا کہ جس کسی نے مجھ سے کوئی بدلہ یا قصاص لینا ہو وہ آج لے سکتا ہے۔ پھر جب آپ ہی کے قبیلہ قریش کی ذیلی شاخ کی ایک عورت فاطمہ مخزومی نے چوری کی تو آپ سے اس جرم کی سزا موقوف کرنے کی سفارش کی گئی تو آپ نے فرمایا۔
"پہلی امتوں کی ہلاکت کا سبب ہی یہ تھا کہ جب ان میں سے کوئی کمزور جرم کرتا تو

اسے سزا دیتے اور اگر شریف ایسا کرتے تو اس کی سزا موقوف کر دی جاتی۔ یہ تو فاطمہ مخزومی کی بات ہے۔ خدا کی قسم! اگر میری اپنی بیٹی فاطمہ بھی چوری کرتی تو میں اس کے بھی ہاتھ کاٹ دیتا۔ (بخاری کتاب الحدود۔ باب اقامۃ الحدود۔۔۔۔)

اسلام میں خلیفہ کے اختیارات

حضرت عمرؓ کے دورِ خلافت میں حضرت ابوعبیدہؓ بن الجراح (گورنر شام) نے حضرت معاذ بن جبل کو رومیوں کے پاس سفیر بنا کر بھیجا۔ رومیوں کے لشکر میں پہنچے تو دیکھا کہ خیمے میں دیبائے زریں کا فرش بچھا ہے۔ ایک عیسائی نے آکر کہا کہ میں گھوڑا تھام لیتا ہوں آپ دربار میں جاکر بیٹھیے۔ معاذؓ نے کہا: "میں اس فرش پر جو غریبوں کا حق چھین کر تیار ہوا ہے، بیٹھنا نہیں چاہتا" یہ کہہ کر زمین پر بیٹھ گئے۔

بات چیت کے دوران بادشاہ اور اس کے اختیارات کا ذکر چھڑ گیا تو حضرت معاذؓ نے فرمایا:
"تم کو اس پر ناز ہے کہ تم ایسے شہنشاہ کی رعایا ہو جس کو تمہاری جان و مال کا اختیار ہے، لیکن ہم نے جس کو اپنا بادشاہ بنا رکھا ہے۔ وہ کسی بات میں اپنے کو ترجیح نہیں دے سکتا۔ اگر وہ زنا کرے تو اس کو درے لگائے جائیں۔ چوری کرے تو ہاتھ کاٹ دیے جائیں۔ وہ پردے میں نہیں بیٹھتا۔ اپنے آپ کو ہم سے بڑا نہیں سمجھتا۔ مال و دولت میں اس کو ہم پر ترجیح نہیں[۱]"

اور یہی وہ بات ہے جنہیں حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ بار بار اپنے خطبوں میں دہرایا کرتے تھے۔

حضرت عمرؓ تو اس قانونی مساوات کا اس قدر خیال رکھتے تھے کہ بارہا خود عدالت میں حاضر ہوئے۔ ایک دفعہ آپ حضرت زید بن ثابت کی عدالت میں بطور مدعا علیہ پیش ہوئے۔ حضرت زیدؓ آپ کی تکریم کی خاطر اُٹھ کھڑے ہوئے تو حضرت عمرؓ نے فرمایا۔ "یہ تمہاری پہلی بے انصافی ہے" اور مدعی کے ساتھ کھڑے ہوئے۔ اس مقدمہ میں فیصلہ حضرت عمرؓ کے خلاف ہوا جس کی تفصیل ہم نے کسی دوسرے مقام پر درج کر دی ہے۔

حضرت علیؓ کے اپنے دورِ خلافت میں ان کی اپنی زرہ چوری ہو گئی۔ جو حضرت علیؓ نے ایک یہودی کے پاس دیکھ لی تو آپ نے یہ نہیں کیا کہ اس سے اپنی زرہ لے لیتے بلکہ قاضی شریح

---

[۱] الفاروق شبلی نعمانی ص ۱۲۵ مطبوعہ سنگ میل پبلی کیشنز لاہور ۱۹۷۶ء)

عدالت میں اس یہودی پر مقدمہ دائر کر دیا۔ حضرت علیؓ کے پاس بطور گواہ ان کے بیٹے حضرت حسنؓ اور ان کے غلام تھے۔ قاضی شریح نے آپ کا مقدمہ صرف اس بناء پر خارج کر دیا کہ یہ شہادتیں اسلامی ضابطہ انصاف و عدل کے تقاضے پورے نہیں کرتیں۔ بیٹے کی شہادت باپ کے حق میں اور غلام کی شہادت آقا کے حق میں ناقابل قبول ہے۔ حالانکہ عدالت کو خوب معلوم تھا کہ مدعی اور گواہ سب عادل اور ثقہ ہیں۔ لیکن عدل کا تقاضا یہی تھا کہ مقدمہ خارج کر دیا جائے۔

یہ صورتِ حال دیکھ کر یہودی نے زرہ بھی واپس کر دی۔ اور خود بھی مسلمان ہو گیا۔

مفت اور بلا تاخیر انصاف

قانونی مساوات کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ مملکت کے ہر فرد کو بلا امتیاز مذہب و نسل، عدل و انصاف مفت اور بلا تاخیر حاصل ہو۔ قانونی مساوات کا یہ پہلو بھی جمہوری ممالک میں یکسر ناپید ہے۔ دیوانی مقدمات کا تو یہ حال ہے کہ مقدمہ کا فیصلہ ہونے تک مدعی یا مدعا علیہ میں سے کوئی ایک فریق مر چکا ہوتا ہے۔ یا وہ یہ بھول چکا ہوتا ہے کہ مقدمہ کی نوعیت کیا تھی حتیٰ کہ فوجداری مقدمات کا بھی سالہا سال تک نہیں فیصلہ ہو پاتا۔

اسلام نے مفت انصاف کے لیے دو طرح کے اقدامات کیے ہیں۔ پہلا یہ کہ اسلامی نظام میں کورٹ فیس کا کوئی جواز نہیں اور مدعی پر ظلم کے مترادف ہے اور اس کا فائدہ عام طور پر غریب طبقہ کو پہنچتا ہے کیونکہ غریب طبقہ ہی عموماً مظلوم ہوتا ہے۔

اور دوسرا یہ کہ اس نظام میں وکیل کی ضرورت کو ختم کر دیا گیا ہے تاکہ جو لوگ وکلاء کی بھاری فیسیں اور ان کے روزمرہ کے مطالبات پورے نہیں کر سکتے وہ بھی وہ اپنے جائز حقوق کے حصول سے محروم نہ رہ سکیں۔ عدالت کو یہ حکم ہے کہ وہ مدعی سے ہمدردی اور دلجوئی کا برتاؤ کرے اور کوئی ایسا اقدام نہ کرے جس سے فریقین میں سے کسی پر عدالت کا رعب طاری ہو سکے۔ یہاں کسی کو عدالت کے آداب ملحوظ رکھنے اور توہینِ عدالت کا خوف نہیں ہوتا۔

اور بلا تاخیر انصاف کے لیے اسلام نے مندرجہ ذیل اقدامات کیے ہیں۔

۱۔ ہر محلہ کی عدالت اسی محلہ میں ہونی چاہیئے تاکہ قاضی کو خود بھی حالات کا کسی نہ کسی حد تک علم ہو۔ اور دوسرے یہ کہ مدعا علیہ کو طلب کرنے میں زیادہ وقت خرچ نہ ہو۔ یا وقت

پیش نہ آئے۔ حضرت عمرؓ بعض دفعہ بازار میں کھڑے ہی مقدمات فیصل کر دیا کرتے تھے۔

۲۔ **قانونِ شہادت** - اسلامی عدالت میں ہر کس و ناکس کی شہادت قابلِ قبول نہیں۔ اس کے لیے ضابطے مقرر ہیں۔ اگر کسی گواہ کی شہادت عدالت میں غلط ثابت ہو جائے تو عدالت از خود اس پر فردِ جرم عائد کر سکتی ہے اور اس کے جرم کے مطابق سزا دے سکتی ہے اور آئندہ کے لیے اس کی شہادت کبھی قابلِ قبول نہیں۔ جبکہ ہماری عدالتوں میں ایسے گواہوں کو کھلی چھٹی دی جاتی ہے۔ اور ان پر کوئی مواخذہ نہیں کیا جاتا۔

اسی طرح اگر مستغیث کا الزام عدالت میں جھوٹا ثابت ہو تو ہماری عدالتیں اس کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کرتیں الا یہ کہ مستغاث اپنے مقدمہ سے فارغ ہو کر پہلے مستغیث پر نئے سرے سے دعویٰ نہ کر دے۔ یہ بات بھی عدل و انصاف کے خلاف ہے۔

۳۔ **بدنی سزائیں** - بلا تاخیر انصاف کے حصول کے لیے اسلام نے تیسرا ضابطہ جو مقرر کیا ہے وہ برسرِ عام بدنی سزائیں ہیں جنھیں اللہ تعالیٰ نے خود مقرر کیا ہے۔ آج کے جمہوری دور میں بدنی سزاؤں کو "ظلم کے مترادف" قرار دیا گیا ہے۔ اور اقوامِ متحدہ کے بنیادی حقوق کے چارٹر میں اس کو غیر انسانی سلوک قرار دے کر ایسی سزاؤں کو ترک کرنے کی ہدایت کی گئی ہے۔ اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ اس نظریہ کے دعویدار اپنی حکومتوں میں سیاسی اور بعض دفعہ فوجداری ملزموں پر بند کمروں میں ایسے ایسے مظالم ڈھائے جاتے ہیں اور بدنی سزائیں دی جاتی ہیں جن کے تصور سے ہی روح کانپ اٹھتی ہے اور مشاہدہ یہ ہے کہ ایسی سزائیں مجرموں کو اپنے کردار میں پختہ کر دیتی ہیں۔ پھر یہ بھی عام مشاہدہ ہے کہ جہاں جہاں عدالتوں میں بدنی سزائیں موقوف ہوئیں۔ جرائم میں اضافہ ہی ہوا ہے۔

ہم حیران ہیں کہ اگر انسانی جسم کو بچانے کے لیے پھوڑے کا اپریشن محض جائز ہی نہیں بلکہ اسے عین ہمدردی سمجھا جاتا ہے تو معاشرہ کو ظلم و فساد سے بچانے کے لیے بدمعاش کو بدنی سزا دینا کیسے غیر انسانی سلوک بن جاتا ہے؟ بدمعاش پر رحم کر کے معاشرہ میں بدامنی کو کیوں گوارا کیا جاتا ہے؟ اور اس وقت لوگوں کی ہمدردیاں کیوں اس کے لیے پیدا ہو جاتی ہیں جبکہ یہ بات قرآن کے حکم صریح کے برخلاف ہے۔ کیا یہ معاشرہ کے ساتھ غیر انسانی اور ظالمانہ سلوک نہیں ہے؟ پھر یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ غیر انسانی سلوک کے یہ علمبردار اپنے ممالک میں قیامِ امن میں کہاں تک کامیاب ہوئے ہیں۔ ہمارے خیال میں غنڈہ عناصر

کی اس پشت پناہی کی وجہ محض یہ ہے کہ موجودہ جمہوری دَور میں" غیر انسانی سلوک کے یہ علمبردار" خود غنڈہ عنصر کے رحم وکرم کے محتاج اور اسی راستہ سے برسر اقتدار آتے ہیں تو ایسے لوگ اپنے معاونین کے حق میں برسرِ عام بدنی سزا کیسے گوارا کر سکتے ہیں ؟

۴ - **رشوت :** بلا تاخیر انصاف کے حصول میں سب سے بڑی رکاوٹ" رشوت" ہے سوچنے کی بات ہے کہ ایک لادینی ریاست میں چند سینکڑے تنخواہ پانے والا تحصیلدار ــــ جس کے پاس لاکھوں کی جائداد کے مقدمے فیصلہ کے لیے آتے ہیں اور فریقین میں سے ہر ایک ہزار ہا روپے رشوت دینے کو برضا و رغبت تیار ہوتا ہے ــــ کس حد تک اپنے آپ پر جبر کر کے رشوت لینے سے باز رہ سکتا ہے۔ جب کہ وہ پہلے ہی تنگی ترشی سے بسر اوقات کر رہا ہے۔ اور جمہوری دَور کے تقاضوں کے مطابق اسے اپنی پوزیشن (STATUS) بھی برقرار رکھنی پڑتی ہے۔

اسلام نے رشوت کے انسداد کے لیے دو طریق اختیار کیے ہیں۔ اخلاقی اور عملی۔

اسلامی نظریہ حیات کی بنیاد ہی چونکہ آخرت اور اپنے اعمال کی جزا و سزا پر ہے۔ لہٰذا وہ قانون سے زیادہ اخلاق پر زور دیتا ہے۔ انسان کو زندگی میں لاتعداد ایسے مواقع مل جاتے ہیں جب وہ قانون کی دسترس سے بچ کر آسانی سے گناہ کے کام اور جرائم کا ارتکاب کر سکتا ہے۔ ایسے موقعوں پر اسے صرف یہ تصور ہی گناہ سے باز رکھ سکتا ہے۔ اسلام نے رشوت کو بہت بڑا گناہ اور قابلِ دست اندازی پولیس جرم قرار دیا ہے۔ آپؐ نے فرمایا۔

الراشی والمرتشی کلاھما فی النار۔

رشوت لینے والا اور دینے والا دونوں جہنمی ہیں۔

اور بعض روایات میں الرائش کا لفظ بھی موجود ہے۔ یعنی وہ شخص جو درمیان میں سودا طے کراتا ہے وہ بھی جہنمی ہے۔

رشوت تو درکنار، اسلام میں کسی عامل کو ہدیہ یا تحفہ لینے سے بھی سختی سے منع کر دیا گیا ہے کہ وہ بھی رشوت ہی کی ایک قسم ہے۔

اور عملی اقدام یہ ہے کہ حضرت عمرؓ نے قاضیوں کی بیش بہا تنخواہیں مقرر کیں تاکہ انھیں " بالائی آمدنی" کی احتیاج نہ رہے۔ مثلاً ربیعہ اور قاضی شریح کی تنخواہ پانچ[1] پانچ سو درہم ماہوار

---

[1] یہ واضح رہے کہ زکوٰۃ کا نصاب ۲۰۰ درہم یا ۲۰ دینار ہے اور پانچ سو درہم کی قیمت تقریباً ۱۳۰ تولے چاندی بنتی ہے

مقرر کی گئی تھی۔ جبکہ خلیفۂ اوّل حضرت ابوبکرؓ کی تنخواہ چار ہزار درہم سالانہ مقرر ہوئی تھی۔
دوسرے آپ نے یہ قاعدہ مقرر کیا کہ قاضی صرف وہ شخص مقرر کیا جائے جو دولت مند بھی اور صاحبِ ثروت بھی ہو۔ دولت مند اس لیے کہ وہ رشوت کی طرف راغب نہ ہو۔ اور صاحبِ ثروت اس لیے کہ وہ فیصلہ کرتے وقت کسی معزز آدمی سے مرعوب ومتاثر نہ ہو۔ گویا رشوت اور سفارش دونوں کا خاتمہ کر دیا گیا۔

۵۔ مساوات ملکی وشہری

یعنی اس بنا پر بھی "پریذیڈنٹ کو عام باشندگانِ ملک پر کوئی تفوق وترجیح نہ ہو"۔
اس کا مطلب یہ ہے کہ صدرِ ریاست ملک کا کوئی باشندہ یا شہری صدر بن سکتا ہے۔
یہ شق دراصل پہلی ہی شقوں کی شرح ہے اور ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ اسلامی نظام میں صرف ملکی یا شہری ہونا کافی نہیں۔ بلکہ اس کا مسلمان اور متقی ہونا بھی لازمی شرائط ہیں۔
اور اس مساوات کی دوسری تعبیریں اگر کچھ ہو سکتی ہیں تو ان کا ذکر بھی پہلے درج ہو چکا ہے۔

۶۔ خـــزانہ ملکی

خزانۂ ملکی، ملک کی ملکیت ہو۔ اس پر پریذیڈنٹ کو کوئی ذاتی تصرف نہ ہو۔

جمہوری ملکوں میں شاہانہ ٹھاٹھ

اس دفعہ کی حقیقت ایک فریب کے سوا کچھ نہیں۔ کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ ایک بادشاہ اور صدر کے شاہانہ ٹھاٹھ باٹھ اور کرّوفر میں کچھ فرق نہیں ہوتا۔ یہ ایکڑوں زمین پر پھیلے ہوئے پریذیڈنٹ ہاؤس اور گورنر ہاؤس کیا ہیں؟ کیا ان جمہوری ممالک کے صدروں کی رہائش گاہیں شاہی محلات سے کسی صورت میں کم ہیں۔ کیا ان پر پہرہ داروں کی کڑی نگرانی نہیں ہوتی۔ نقل وحرکت کے لیے سرکاری خرچ سے چلنے والی بیسیوں فٹ لمبی کاریں اور ہوائی جہاز ان کے لیے ہر وقت تیار کھڑے نہیں ہوتے؟ تو پھر آخر جمہوری ملک کے صدر اور کسی ملک کے بادشاہ کے طرزِ بود وباش میں خطِ امتیاز کیا ہے؟
فرق صرف یہ ہے کہ ملوکیت میں قومی خزانہ بادشاہ کی جاگیر ہوتا ہے۔ جسے وہ اپنی ذات اور خاندان پر بے دریغ خرچ کر سکتا ہے اور جمہوریت میں اکثریتی پارٹی اپنی اکثریت کی طاقت کے بل بوتے پر خزانہ عامرہ پہ ہاتھ صاف کرتی ہے۔ ملوکیت میں تو صرف ایک

خاندان عیش کرتا ہے جب کہ جمہوریت میں صدر کے علاوہ پوری پارٹی گلچھرے اُڑاتی ہے۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کی طرف علامہ اقبال نے حسبِ ذیل اشعار میں توجہ دلائی ہے۔

؎ دیوِ استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب … تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری
ہے وہی سازِ کہن مغرب کا جمہوری نظام … جس کے پردے میں نہیں غیر از نوائے قیصری

ترجمہ :۔ جمہوریت کے پردے میں وہ شخصی حکومت کا دیو رقص کر رہا ہے جسے تو آزادی (اظہارِ خیال) کی نیلم پری سمجھ رہا ہے۔ یہ مغربی جمہوری نظام حقیقتاً ملوکیت ہی کا چربہ ہے جس کی تہ میں اسی شاہانہ شان وشوکت کی صدائے بازگشت ہے۔

بیت المال اور امرا کی دسترس

اسلام یہ تصوّر پیش کرتا ہے کہ قومی خزانہ امیر کے پاس ایک قومی امانت ہے۔ اس میں ناجائز ٹیکسوں اور غصب ومظالم سے کوئی آمدنی جمع نہیں کی جا سکتی۔ نہ ہی اس آمدنی کے پہلے سے طے شدہ مصارف کے علاوہ کسی دوسری مد میں خرچ کی جا سکتی ہے۔ امیر کا اس آمدنی سے ناجائز فائدہ اُٹھانا یا اپنے رشتہ داروں اور عزیزوں کو نوازنا یا ناجائز مصارف میں خرچ کرنا بدترین قسم کی خیانت ہے۔ اب امیر یا کسی عامل کے جائز اخراجات کیا ہیں۔ جو وہ بیت المال سے لینے کا حقدار ہے۔ وہ حضرت عمرؓ کی زبانی سُنیے۔

انما انا ومالکم کولیّ الیتیم ان استغنیتُ استعففتُ وان افتقرت اکلت بالمعروف (کتاب الخراج ابو یوسف)

مجھ کو تمھارے مال (یعنی بیت المال) میں صرف اس قدر حق ہے جتنا یتیم کے مربّی کو یتیم کے مال میں۔ اگر میں دولت مند ہوں تو کچھ نہ لوں گا اور اگر محتاج ہوں تو دستور کے مطابق کھانے پینے کے لیے لوں گا۔

یہ تو حق کی بات تھی۔ اب دوسری بات یہ ہے کہ اسلام خود غرضی اور مفاد خویش کے بجائے ایثار یا دوسرے کے مفاد کو اپنے مفاد پر ترجیح دینے کی تعلیم دیتا ہے۔ قرآن کریم میں مومنوں کی ایک یہ صفت بھی بیان کی گئی ہے۔

وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ۔

اور وہ دوسروں کو اپنی ذات پر ترجیح دیتے ہیں خواہ خود وہ فاقے سے ہوں۔

اور اس ایثار کی ایسی ایسی مثالیں مسلمانوں نے قائم کی ہیں۔ جن کی نظیر تاریخ میں کہیں

ڈھونڈے سے نہیں مل سکتی۔

حضرت ابوبکرؓ جب خلیفہ ہو گئے تو دوسرے دن حسب دستور کپڑے کی گٹھری کندھوں پر اُٹھائے بازار کو نکل کھڑے ہوئے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ راستے میں مل گئے۔ "پوچھا کیا بات ہے؟" حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ "بچوں کو کہاں سے کھلاؤں؟ حضرت عمرؓ نے فرمایا۔ اب اُمت کا بار آپ کے سر پر آ پڑا ہے۔ آپ کو تمام تر توجہ اس طرف دینی چاہیئے۔ رہا معاش کا مسئلہ تو اس کے لیے حضرت ابوعبیدہؓ بن الجراح (امین الامت، جو اس وقت بیت المال کے ناظم تھے) کے پاس چلتے ہیں۔"

چنانچہ دونوں حضرات ابو عبیدہ بن الجراحؓ کے پاس گئے۔ اور تینوں کے مشورہ سے حضرت ابوبکرؓ کی تنخواہ ایک عام آدمی کی گزران کے مطابق چار ہزار درہم سالانہ طے پائی۔ حضرت ابوبکرؓ دو سال خلیفہ رہے اور دو سال ہی یہ تنخواہ وصول کی (اپنی وفات سے قبل یہ وصیت کی کہ "میرا مکان بیچ کر ۸ ہزار درہم (جو وہ بصورت مشاہرہ بیت المال سے وصول کر چکے تھے) بیت المال کو واپس کر دیے جائیں۔" حضرت عمرؓ نے جب یہ بات سُنی تو فرمانے لگے "خدا ابوبکرؓ پر رحم فرمائے انھوں نے بعد میں آنے والوں کو تھکا دیا۔" (کنز العمال ج ۲ صہ ۲۳۸)

ایثار کی جو مثالیں خود حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے قائم کی تھیں۔ ان کو چھیڑنے کی ہمیں ہمت نہیں۔ حضرت عمرؓ کا طرزِ عمل آپ پڑھ چکے ہیں۔ آپ نے قحط کے دوران گندم کی روٹی کھانے سے اس وجہ سے انکار کر دیا کہ جب غریب لوگوں کو گندم کی روٹی میسر نہیں تو میں کیسے کھا سکتا ہوں۔ بیت المقدس کی صلح کے موقع پر عیسائیوں نے آپ کو بلوایا تھا۔ جب وہاں گئے تو کُرتے میں پیوند لگے ہوئے تھے۔ جب شہر میں داخل ہوئے تو اونٹ پر آپ کا غلام سوار تھا اور آپ پیدل تھے کیونکہ باری اس کی تھی۔ حضرت عثمانؓ مال دار ضرور تھے لیکن ان کے زہد اور دنیا سے بے رغبتی کے واقعات سے تاریخ بھری پڑی ہے۔ حضرت علیؓ نے بھی اسی سادگی میں اپنی پوری زندگی بسر کی۔ بلکہ ان کے خلفاء کے بعد حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے اسی طرزِ بود و باش پر عمل پیرا ہو کر خلافتِ راشدہ کی یاد تازہ کر دی۔ اب بتلایئے کہ کیا کسی جمہوری ملک کے کسی صدر کی ایسی مثال پیش کی جا سکتی ہے؟ اور پھر اس کا کیا مطلب ہوا۔ کہ "خزانہ ملکی، ملک کی ملکیت ہے۔ اس پر پریذیڈنٹ کا کوئی ذاتی تصرف نہ ہو۔"

یہ تو خلفاء کی مثال تھی۔ اب عمالِ حکومت کی طرزِ بود و باش ملاحظہ فرمایئے۔

یہ تو ہم بتلا چکے ہیں کہ حضرت عمرؓ عمال مقرر کرتے وقت پروانۂ تقرری میں یہ شرائط درج کر دیا کرتے تھے کہ وہ ترکی گھوڑے پر سوار نہ ہوگا۔ باریک کپڑے نہ پہنے گا اور چھنا ہوا آٹا نہ کھائے گا اور پھر ان شرائط کا جس طرح آپ احتساب کرتے تھے اس کی تفصیل گزر چکی ہے۔ اس کے علاوہ جب کوئی عامل مقرر کیا جاتا تو اس کے مال و اسباب کی مفصل فہرست تیار کر کے محفوظ رکھی جاتی تھی۔ اور اگر عامل کی حالت میں غیر معمولی ترقی ہوتی تو اس سے مواخذہ کیا جاتا۔ (فتوح البلدان ص ۲۱۹)

ایک دفعہ حضرت عمرؓ کو اطلاع ملی کہ بعض عمال کی جائداد میں اضافہ ہوا ہے۔ آپ نے سب کی موجودات کا جائزہ لے کر آدھا آدھا مال بٹا لیا اور بیت المال میں داخل کر دیا۔

اب تک ہم نے جو کچھ لکھا ہے وہ صرف ایک بیت المال کے خرچ سے تعلق رکھتا ہے یعنی عمالِ حکومت اور امیر مملکت خود بھی اس کو امانت سمجھتے اور اس سے ناجائز تمتع کا حق نہیں رکھتے۔ اب اس کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ اس میں ناجائز آمدن از قسم غصب اور ناجائز ٹیکس بھی داخل نہیں کیے جا سکتے۔

بیت المال کی آمدنی کی ایک بڑی اہم مد زکوٰۃ اور خراج ہے۔ مسلمانوں سے زکوٰۃ اور عشر وصول کیا جاتا ہے اور غیر مسلموں (ذمیوں) سے خراج اور جزیہ۔ زمین کے لگان کو اہلِ ایران خراگ کہتے تھے۔ خراج اسی سے معرب ہے۔ لگان کے علاوہ دوسرے ٹیکسوں کو اہلِ ایران گزیت کہتے تھے۔ جزیہ کا لفظ اس سے معرب ہے۔ گویا غیر مسلموں پر دستور کے مطابق سابقہ ٹیکس ہی بحال رہنے دیے گئے۔ زکوٰۃ و عشر اور خراج و جزیہ میں بنیادی فرق یہ ہے کہ زکوٰۃ اور عشر کی شرح ناقابلِ تغیّر و تبدل ہے۔ جب کہ جزیہ و خراج کی شرح احوال و ظروف کے مطابق تبدیل کی جا سکتی ہے۔

حضرت عمرؓ نے خراج کی شرح نہایت نرمی سے مقرر کی تھی اور احتیاط کا یہ عالم تھا کہ ہر سال جب عراق سے زکوٰۃ و خراج کی آمدنی وصول ہوتی تو دس معتبر اشخاص بصرہ سے اور دس کوفہ سے طلب کیے جاتے۔ حضرت عمرؓ ان کو چار دفعہ شرعی قسم دلاتے تھے کہ یہ مالگزاری یا زکوٰۃ کسی ذمی یا مسلمان پر ظلم کر کے تو نہیں لی گئی۔ (کتاب الخراج ص ۶۵)

حقوق ملکیت کا تحفظ

اور غصب کے معاملہ میں یہ احتیاط تھی کہ ایک بار حضرت عمرؓ نے مسجد نبوی کی توسیع کا ارادہ کیا تو حضرت ابی بن کعب کا مکان اس

میں رکاوٹ تھی۔ حضرت عمرؓ نے ابی بن کعب سے کہا کہ وہ جائز قیمت لے کر مکان دے دیں۔ لیکن حضرت ابی بن کعب مکان فروخت کرنے پر آمادہ نہ ہوئے۔ تنازعہ بڑھ گیا تو فریقین (جس میں مدعی حکومتِ وقت تھی اور مدعا علیہ حضرت ابی بن کعب) نے حضرت زید بن ثابتؓ کو ثالث (یا عدالت) منظور کر لیا۔ حضرت زیدؓ نے فیصلہ حضرت عمرؓ کے خلاف دے دیا۔

جب ابی بن کعبؓ نے مقدمہ جیت لیا تو انھوں نے یہ مکان بلا قیمت ہی مسجد کی توسیع کے لیے دے دیا۔[1]

اس واقعہ سے جہاں امیر کی بے بسی اور عوام کا اختیارِ حقِ ملکیت ثابت ہوتا ہے۔ وہاں یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ غصب تو دُور کی بات ہے۔ جائز قیمت ادا کرنے کے باوجود بھی حکومت فرد کو اس کی ملکیت فروخت کرنے پر مجبور نہیں کر سکتی۔

اب ذرا جمہوری ممالک میں اس حقِ ملکیت کا اندازہ لگائیے۔ زمینیں زبردستی (AQUIRE) کر لی جاتی ہیں تو عوام بے بس ہیں۔ ان کی قیمت مروجہ نرخ سے بہت کم لگائی جاتی ہے تو اس زبردستی پر بھی عوام بے بس ہیں۔ قیمت نقد ادا کرنے کی بجائے کئی کئی سال کی قسطوں میں ادائیگی کی جاتی ہے تو بھی عوام مجبورِ محض ہیں۔ حکومتیں اپنی مرضی سے بڑی بڑی صنعتوں اور تجارتی اداروں کو اپنی تحویل میں لے لیتی ہیں۔ اور ادائیگی بانڈوں کی صورت میں سالہا سال تک پسِ پُشت ڈال دی جاتی ہے۔ کیا ان جمہوری ممالک میں عوام کے حقِ ملکیت کے تحفظ کا یہی تصور ہے۔

نظامِ کفالت اور عوام کے حقوق

"خزانہ ملکی ملک کی ملکیت ہو" کی صحیح اور واضح تعبیر صرف اسلام کے نظامِ کفالت یا بیت المال میں مل سکتی ہے۔ اسلامی نظام میں حکومت کی ذمہ داریوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ وہ غریب اور مستحقِ امداد افراد کا پتہ چلائے۔ پھر ان کی مدد کرے۔ یہاں غریب اور مستحق افراد کو امداد کے لیے حکومت سے نہ التجا کرنی پڑتی ہے نہ چکر کاٹنے پڑتے ہیں۔ جب حضرت عمرؓ نے عراق کی مفتوحہ زمینوں کو بیت المال کی تحویل میں لے لیا تو فرمایا۔

فلئن عشتُ فلیاتین الراعی دھو بِسَرو حِمیَر نصیبہٗ منھا لم یعرق فیھا جبینہٗ (مشکوٰۃ - باب الفیٔ)

اگر میں زندہ رہا تو سَرو اور حِمیَر کے اس چرواہے کو بھی اس میں سے حصّہ پہنچے گا۔

[1] بیہقی۔ السنن الکبریٰ ج ۱ ص ۱۳۶

جس کی پیشانی پر پسینہ نہیں آیا۔ (یعنی جس نے جہاد کے سلسلہ میں کچھ بھی محنت نہ کی ہو)

حضرت عمرؓ کے غلام اسلم کہتے ہیں کہ ایک دفعہ حضرت عمرؓ رات کو گشت کرنے کے لیے مدینہ سے تین میل صرار کے مقام تک نکل گئے۔ وہاں دیکھا کہ ایک عورت کچھ پکا رہی ہے اور دو تین بچے رو رہے ہیں۔ حقیقتِ حال دریافت کی تو معلوم ہوا کہ بچوں کو کئی وقتوں سے کھانا نہیں ملا۔ ان کے بہلانے کے لیے خالی ہانڈی میں پانی ڈال کر چڑھا دی ہے۔ حضرت عمرؓ اسی وقت بیت المال کی طرف لوٹے۔ آٹا، گوشت، گھی اور کھجوریں لیں اور اسلم سے کہا۔ میری پیٹھ پر رکھ دو۔ اسلم نے کہا۔ میں لیے چلتا ہوں۔ فرمایا۔ لیکن قیامت میں تم میرا بار نہیں اُٹھاؤ گے"۔ غرض سب چیزیں اپنی پیٹھ پر لاد لائے اور سب چیزیں اس عورت کے آگے رکھ دیں۔ اس نے آٹا گوندھا اور ہنڈیا چڑھائی۔ حضرت عمرؓ خود چولہے کی آگ کو پھونکیں مار رہے تھے۔ یہاں تک کہ آنسوؤں سے آپ کی داڑھی تر ہو گئی۔ کھانا تیار ہو گیا۔ بچوں نے خوب سیر ہو کر کھایا اور اُچھلنے کُودنے لگے۔ حضرت عمرؓ ان کو اس حال میں دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ عورت نے کہا۔ خدا تم کو جزائے خیر دے۔ سچ یہ ہے کہ امیرالمومنین ہونے کے قابل تم ہو نہ کہ عمرؓ۔

اس واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس دَور کے مسلمان یہی سمجھتے تھے کہ غریبوں کی خبر گیری امیرِ مملکت کی ذمّہ داری ہے۔ غریبوں کو لازم نہیں کہ وہ اپنی صورتِ حال جا کر حکام کو پیش کریں درج ذیل واقعہ سے یہ تصوّر اور بھی زیادہ اُجاگر ہو جاتا ہے۔

حضرت عمرؓ کو اس کی ہمیشہ فکر دامن گیر رہتی تھی کہ ان کے عمال رعایا کی پروا کرتے ہیں یا نہیں؟ کیونکہ ہر شخص تو ان تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔ چنانچہ محض تفتیشِ حال کے لیے شام، جزیرہ، کوفہ اور بصری مقامات کے دَورہ کا ارادہ کیا۔ لیکن موت نے اتنی فرصت نہ دی تاہم شام کے دَورہ میں ایک ایک ضلع میں ٹھہر کر لوگوں کی شکایات سُنیں اور دادرسی کی۔ دارالخلافہ کو واپس آ رہے تھے کہ راہ میں ایک خیمہ دیکھا۔ سواری سے اُتر کر خیمہ کے قریب گئے۔ ایک بڑھیا عورت نظر آئی اس سے پوچھا۔ "عمر کا کچھ حال معلوم ہے"؟

وہ بولی۔ "ہاں! شام سے روانہ ہو چکا لیکن خدا اس کو غارت کرے۔ آج تک مجھ کو اس کے ہاں سے ایک حبّہ تک نہیں ملا"۔

حضرت عمرؓ نے کہا۔ "اتنی دُور کا حال عمرؓ کو کیونکر معلوم ہو سکتا ہے"؟

کہنے لگی "اس کو رعایا کا حال معلوم نہیں تو خلافت کیوں کرتا ہے؟"
حضرت عمرؓ کو سخت رقت ہوئی اور رو پڑے۔
حضرت عمرؓ نے تمام لاوارث بچوں کے دودھ پلانے اور دیگر مصارف کا انتظام بیت المال سے کیا ہوا تھا۔ اس کے علاوہ یہ بھی قاعدہ تھا کہ جب عام بچوں کا دودھ چھڑا لیا جائے تو ان کا وظیفہ مقرر کر دیا جاتا تھا۔ ایک دفعہ تحقیقِ احوال کے لیے رات کو بھیس بدل کر گشت پر نکلے: ایک قافلہ مدینہ منورہ آیا ہوا تھا اور شہر سے باہر اترا تھا ادھر چل دیے اور پہرہ دینے لگے۔ ایک طرف سے کسی شیر خوار بچے کے رونے کی آواز آئی جسے اس کی ماں اٹھائے ہوئے تھی۔ آپ نے ماں کو تاکید کی کہ اسے بہلایئے۔ تھوڑی دیر بعد ادھر سے گزرے تو پھر بچے کو روتے پایا۔ غصہ میں آ کر اس عورت سے کہا "تو تو بڑی بے رحم ماں ہے۔"
وہ بولی: "مجھے تنگ نہ کرو۔ اصل معاملہ یہ ہے کہ عمرؓ نے حکم دیا ہے کہ بچے جب تک دودھ نہ چھوڑیں بیت المال سے ان کا وظیفہ مقرر نہ کیا جائے۔ میں اس غرض سے اس کا دودھ چھڑاتی ہوں اور یہ اس وجہ سے روتا ہے۔"
حضرت عمرؓ کو رقت ہوئی اور بولے: "ہائے عمر! تو نے کتنے بچوں کا خون کیا ہوگا۔" پھر اسی دن منادی کرا دی کہ بچے جس دن پیدا ہوں اسی تاریخ سے اس کے روزینے مقرر کر دیے جائیں۔
ایک دفعہ گشت کے دوران دیکھا کہ ایک خیمہ کے باہر ایک بدو بیٹھا ہے۔ اس سے اِدھر اُدھر کی باتیں شروع کر دیں۔ دفعتہً اندر سے رونے کی آواز آئی۔ حضرت عمرؓ نے پوچھا "کون روتا ہے؟" بدو بولا۔ میری بیوی ہے جو دردِ زہ میں مبتلا ہے اور کوئی پُرسانِ حال نہیں۔"
آپ واپس گھر آئے۔ اپنی بیوی امِّ کلثوم کو ساتھ لے کر وہاں پہنچے۔ بدو سے اجازت لے کر امِّ کلثوم کو خیمہ میں بھیجا۔ تھوڑی دیر بعد بچہ پیدا ہوا۔ امِ کلثوم نے پکارا۔ امیرالمومنین! اپنے بھائی کو مبارک باد دیجیے۔
امیرالمومنین کا لفظ سن کر بدو چونک پڑا اور مؤدب ہو بیٹھا۔ آپ نے فرمایا۔ کوئی بات نہیں۔ تم کل میرے پاس آنا۔ میں اس بچے کی تنخواہ مقرر کر دوں گا۔
تو یہ ہیں ایک اسلامی مملکت میں عوام کے حقوق۔ جوں جوں عوام کے حقوق بڑھتے جاتے ہیں۔ عمالِ حکومت کی ذمہ داریاں بڑھتی اور ان کے اختیارات محدود ہوتے جاتے ہیں۔

اور یہ ہے قومی خزانہ کے ملک کی ملکیت اور امانت ہونے کی صحیح تصویر۔ اس کے متعلق حضرت عمرؓ نے ایک دفعہ لوگوں سے یوں خطاب فرمایا:

لکم علیّ ایھا الناس خصال فخذونی بھا۔ لکم علیّ ان لا اُجتبی شیئًا من خراجکم ولا مما افاء اللہ علیکم الامن وجھہ۔ ولکم علیّ اذا وقع فی یدی ان لا یخرج منّی الافی حقہ۔ ولکم علیّ ان ازیدنی اعطیاتکم واسدّ ثغورکم۔ ولکم علیّ ان لا القیکم فی المھالک (کتاب الخراج ص۶۰)

لوگو! مجھ پر آپ لوگوں کے کچھ حقوق ہیں جن کا تم مجھ سے مواخذہ کرسکتے ہو۔ ایک یہ کہ ملک کا خراج اور مالِ غنیمت بے جا طور سے نہ جمع کیا جائے۔ ایک یہ کہ جب میرے پاس خراج اور غنیمت آئے تو بے جا صرف نہ ہونے پائے۔ ایک یہ میں تمھارے روزینے بڑھاؤں اور تمھاری سرحدوں کو مضبوط کردوں اور ایک یہ کہ تم کو خطرات میں نہ ڈالوں۔

۴۔ اصولِ حکومت "مشورہ" ہو

اور قوت و حکم و ارادہ افراد کی اکثریت کو ہو۔ نہ کہ ذات وشخص کو۔ اس دفعہ پر مفصل بحث حصہ دوم میں گزر چکی ہے۔

۵۔ حریت رائے وخیال

اور مطبوعات (پریس) کی آزادی اسی کے تحت میں ہے۔

آزادی اظہار رائے۔ یہ آزادی اگر معقول حدود میں ہو تو مثبت نتائج پیدا کرتی ہے اور اگر یہ آزادی بے لگام و بے مہار ہو تو ہزاروں فتنے پیدا کرکے مملکت کی سرحدوں کو کمزور کرتی رہتی ہے۔ یہ جمہوریت نوازوں کی کمزوری ہے کہ استبداد (خود رائے) کے مقابلہ میں انھوں نے لامحدود آزادی اظہار رائے کا حق بخشا۔ لیکن وقتاً فوقتاً حکومتوں کو اس لامحدود آزادی کو مختلف پابندیوں اور اخلاقی ضابطوں سے محدود کرنا پڑتا ہے۔

یہ اسی بے لگام آزادی کے کرشمے ہیں کہ کہیں اسلام مردہ باد اور سوشلزم زندہ باد کے نعرے لگائے جاتے ہیں۔ کہیں قرآن کریم کو ایک فرسودہ کتاب قرار دیا جاتا ہے اور کہیں جلا

بھی دیا جاتا ہے۔ کہیں مسلمانوں کا منشورِ آزادی (خطبہ حجۃ الوداع) ضبط کیا جاتا ہے۔ سرخ انقلاب اور انتقام کے برسرِ عام نعرے لگائے جاتے ہیں اور کہیں علاقائی اور لسانی تعصب کو ہوا دے کر نظریۂ پاکستان اور اسلام کی بیخ کنی کی جاتی ہے اور یہ سب کچھ جمہوریت میں اس لیے گوارا کر لیا جاتا ہے کہ اس کی بنیاد ہی لادینیت پر ہے اور آزادیِ رائے بے لگام ہے۔

اسلام نے اس آزادیِ رائے کو جائز اور لازم قرار دیا ہے۔ مگر شرط یہ ہے کہ یہ قرآن و سنت کے مطابق ہو۔ خلفائے راشدین کے دور میں ہر مسلمان کو آزادیِ رائے اور حکومت پر نکتہ چینی کا پورا پورا حق حاصل تھا جسے وہ اپنا دینی فریضہ تصور کرتا تھا۔ تاکہ عوام کو ان کے جائز حقوق مل سکیں اور تاکہ ملک میں برائی کا استیصال اور نیکی کی حوصلہ افزائی ہو۔ یہاں یہ حق کسی خاص جماعت —— حزبِ اختلاف —— کو نہیں کہ وہ حکومت کی پالیسیوں پر نکتہ چینی کرے اور اس کے اچھے کام کی بھی مذمت کرتی رہے۔

خلفائے راشدین خود اس جذبۂ تنقید کی حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ خلیفۂ اول حضرت ابوبکرؓ نے اپنی پہلی تقریر میں یوں فرمایا تھا۔ "میں تم ہی جیسا ایک آدمی ہوں تم سے بہتر نہیں۔ لہٰذا اچھا کام کروں تو میری مدد کرو اور اگر غلط روی اختیار کروں تو مجھے سیدھا کر دو۔"

اور حضرت عمرؓ نے اپنی پہلی تقریر میں یوں فرمایا۔ "میں اس شخص کو زیادہ پسند کروں گا جو مجھے میرے عیبوں اور کمزوریوں پر آگاہ کرے۔" اور بارہا ایسا ہوا کہ آپ کو برسرِ عام ٹوکا گیا۔ اب ہم یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے ایسے موقعوں پر کیا رویہ اختیار کیا۔

ایک دفعہ آپ تقریر میں لوگوں کو ہدایت فرما رہے تھے کہ "حق مہر زیادہ مقرر نہ کیے جائیں اور اس کی حد چار سو درہم تک ہونی چاہیئے۔"

یہ معاملہ عورتوں کے حقوق سے تعلق رکھتا تھا۔ ایک عورت اٹھی اور کہنے لگی "تم یہ پابندی کیسے لگا سکتے ہو۔ جب کہ اللہ تعالیٰ نے خود فرمایا ہے۔

وَّاٰتَيْتُمْ اِحْدٰهُنَّ قِنْطَارًا ۔ (۴/۱۹)

اگرچہ تم ان عورتوں میں سے کسی ایک خزانہ بھر بھی (بطور حق مہر) دے چکے ہو۔

یہ بات سن کر حضرت عمرؓ بے ساختہ پکار اٹھے "پروردگار مجھے معاف فرما۔ ہر شخص عمرؓ سے زیادہ فقیہ ہے۔ پھر منبر پر چڑھے اور کہا: لوگو! "میں نے تمہیں چار سو درہم سے زیادہ حق مہر دینے سے روکا تھا۔ میں اپنی رائے سے رجوع کرتا ہوں۔ تم میں سے جو جتنا پسند کرے

مہر یں دے۔

ایک دفعہ آپ تقریر کرنے کے لیے کھڑے ہوئے تو ایک صحابی نے آپ کی ذات پر یہ اعتراض کیا کہ آپ نے جو قمیض پہن رکھی ہے یہ انھیں چادروں کی ہے جو مالِ غنیمت میں ہر ایک کے حصّہ میں ایک ایک چادر آئی ہے۔ ایک چادر سے اتنی لمبی قمیص نہیں بن سکتی۔ آپ کی کیسے بن گئی۔ پہلے اس بات کا جواب دیجئے تب ہم آپ کی بات سُنیں گے۔

یہ بات حقیقتاً حضرت عمرؓ پر بیت المال میں خیانت کا الزام تھا۔ آپ برافروختہ نہیں ہوئے۔ اپنے لڑکے کی طرف اشارہ کیا۔ اس نے مجمع عام میں یہ اعلان کیا کہ میں نے اپنے حصّہ کی چادر بھی اپنے والد کو دے دی۔ تب یہ قمیص تیار ہوئی۔

اس پر معترض نے اُٹھ کر کہا۔ ہاں۔ اب فرمایئے۔ ہم آپ کی بات بھی سنیں گے اور طاعت بھی کریں گے۔

ایک دفعہ آپ بازار میں جا رہے تھے۔ جارود عبدی ساتھ تھے۔ راستہ میں ایک خاتون نے سلام کیا۔ اور تند و تیز لہجہ میں کہنے لگی۔ "عمرؓ! تم پر افسوس ہے۔ میں نے وہ زمانہ بھی دیکھا ہے جب تم عمیر کہلاتے اور بازار عکاظ میں نوجوانوں سے کشتی لڑا کرتے تھے۔ پھر تھوڑے ہی دن گزرے کہ عمر کہلانے لگے اور اب کچھ دنوں سے امیر المومنین بنے پھرتے ہو۔ سُنو! رعایا کے معاملہ میں اللہ سے ڈرو......"

بڑھیا کی یہ بات سُن کر جارود عبدی نے کہا۔ "خاتون! آپ نے امیر المومنین پر بہت زیادتی کی۔" حضرت عمرؓ کہنے لگے۔ "انھیں کہنے دو۔ شاید تمھیں معلوم نہیں یہ عبادہ بن صامت کی اہلیہ خولہ بنت حکیم ہیں جن کی بات سات آسمانوں پر سنی گئی تھی۔ عمر کو تو بدرجہ اولیٰ سُننا چاہیئے۔"

اسی طرح ایک اور موقع پر ایک شخص نے کئی بار حضرت عمرؓ کو مخاطب کر کے کہا۔ "اِتَّقِ اللّٰہ یا عمر" یعنی اے عمر! خدا سے ڈر۔ مجمع میں سے کسی نے اسے روکا اور کہا۔ "اب بس بھی کرو۔" حضرت عمرؓ نے فرمایا۔ "اسے کہنے دو۔ اگر یہ لوگ نہ کہیں تو بے مصرف ہیں۔ اگر ہم نہ مانیں تو ہم۔"

عوامی شکایات اور عمال سے احتساب

یہ تو خلفاء پر تنقید کی بات تھی۔ اب دیکھیے آپ کے عمال سے کیسے مواخذہ ہوتا تھا۔

آپ جب کوئی عامل مقرر کرتے تو اسے پروانہ تقرری ملتا تھا جس میں اس کے اختیارات و

فرائض کا ذکر ہوتا تھا۔ اس عامل پر لازم تھا کہ وہ وہاں پہنچ کر مجمع عام میں یہ مکتوب سنائے تاکہ عوام اس کے جائز اختیارات سے آگاہ ہو جائیں اور اگر وہ ان اختیارات کی حد سے آگے بڑھے تو اس پر مواخذہ کر سکیں۔ ان حقوق و اختیارات کو آپ نے بارہا مجمع عام میں خود بھی سنایا۔ عاملوں کے لیے یہ ہدایات ہوتی تھیں۔

"یاد رکھو! میں نے تم لوگوں کو امیر اور سخت گیر مقرر کر کے نہیں بھیجا۔ بلکہ امام بنا کر بھیجا ہے کہ لوگ تمھاری تقلید کریں۔ تم لوگ مسلمانوں کے حقوق ادا کرو۔ ان کو زدو کوب نہ کرو کہ وہ ذلیل ہوں۔ بے جا تعریف نہ کرو کہ غلطی میں نہ پڑیں اور ان کے لیے اپنے دروازے بند نہ رکھو کہ زبردست کمزوروں کو کھا جائیں۔ ان سے کسی بات میں اپنے آپ کو ترجیح نہ دو کہ یہ ان پر ظلم ہے۔"

پھر عاملوں کی خطاؤں پر سخت گرفت کی جاتی تھی۔ خصوصاً ان باتوں پر جن سے ترفع اور فخر و نمود ثابت ہو اور اس طرح کے چند واقعات ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں۔

عمال سے احتساب کے تین طریقے مروّج تھے۔ پہلا یہ کہ لوگ اپنے عامل کے متعلق شکایات لکھ کر دارالخلافہ میں بھیج دیتے۔ ایسی صورتِ حال کے لیے حضرت عمرؓ نے ایک تحقیقاتی کمیشن مقرر کر رکھا تھا جو موقعہ پر جا کر تحقیقات کرتا تھا اور حسبِ ضرورت عامل کو مدینہ طلب کر لیا جاتا تھا۔

دوسرا یہ کہ ہر سال حج کے موقعہ پر مختلف علاقوں کے وفود آ کر حضرت عمرؓ سے ملاقات کرتے اور اپنے عاملوں کے متعلق شکایات کرتے۔

تیسرا یہ کہ آپ حج کے موقعہ پر سب عاملین کو وہاں بلا لیتے تھے اور منادی کرا دی جاتی تھی کہ جس شخص کو اپنے عامل سے کوئی شکایت ہو وہ بلا روک ٹوک پیش کرے۔

پھر ان شکایات کی پوری تحقیق کی جاتی اور الزام ثابت ہونے پر قرار واقعی سزا دی جاتی تھی اور بسا اوقات انھیں معزول کر دیا جاتا تھا۔ حضرت عمرؓ کے عوامی حقوق کی نگہداشت اور عمال پر گرفت ہی کا یہ اثر تھا کہ عمال ہر وقت اپنے آپ کو یوں سمجھتے تھے کہ حضرت عمرؓ کا ایک ہاتھ ان کے نچلے جبڑے پر ہے اور دوسرا اوپر کے جبڑہ پر، جب کوئی بے اعتدالی ہوئی تو وہ انھیں چیر کے رکھ دیں گے۔

ایک دفعہ حسبِ معمول حج کے موقعہ پر تمام عمال حاضر تھے کہ ایک شخص نے اٹھ کر شکایت کی کہ "آپ کے عامل (مصر کے گورنر عمرو بن عاص) نے مجھ کو بے قصور سو کوڑے مارے ہیں۔

حضرت عمرؓ نے اسی مجمع عام میں مستغیث کو حکم دیا کہ" اٹھ اور اپنا بدلہ لے" عمرو بن العاص کہنے لگے" امیر المومنین! اس طرح تو تمام عمال بدل ہو جائیں گے" حضرت عمرؓ نے فرمایا" تاہم ایسا ضرور ہوگا" پھر مستغیث کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا" اٹھ اور اپنا کام کر"

اب عمرو بن عاص نے مستغیث کو اس بات پر راضی کر لیا کہ وہ سو دینار لے لے اور اپنے دعویٰ سے باز آئے۔ اس طرح حضرت عمرو بن عاص کی جان چھوٹی۔ (کتاب الخراج ص۶۶)

اور حضرت عمرؓ کی عمال پر یہ گرفت اتنی مضبوط تھی کہ سوائے حضرت ابو عبیدہ بن الجراحؓ اور حضرت معاویہؓ کے کوئی عامل بھی ان کی گرفت سے آزاد نہ رہا تھا۔ حضرت معاویہ البتہ باریک کپڑے پہنتے اور ٹھاٹھ سے رہتے تھے جس کے لیے انھوں نے حضرت عمرؓ کے سامنے معذرت کر دی تھی کہ میں جس علاقہ (شام) میں رہتا ہوں وہاں کی سوسائٹی کے لحاظ سے مجھے ایسا کرنا پڑتا ہے۔

اسلام اور بنیادی حقوق

جہاں تک فرانس کے منشورِ جمہوریت پر تقابلی تبصرہ کی ضرورت تھی وہ ہم نے پیش کر دیا ہے۔ اس تبصرہ سے بآسانی یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ بنیادی حقوق کی تحفظ و نگہداشت کس نظام میں زیادہ ہے۔ بالفاظِ دیگر صدر اور دیگر حکام جمہوریت میں زیادہ بااختیار ہوتے ہیں یا نظامِ خلافت میں۔ لیکن بنیادی حقوق کے تحفظ کی بحث ابھی مزید تفصیل و تنقیح کی محتاج ہے جو مندرجہ ذیل ہے۔

۱۔ جان و مال کا تحفظ انسان کا سب سے بڑا اور بنیادی حق جان و مال اور عزت کا تحفظ ہے جان و مال کے سلسلہ میں اللہ تعالیٰ نے خود بدنی سزائیں مقرر کر کے اس حق کی حفاظت اور بڑے بڑے جرائم کا انسداد کیا ہے۔ اس کی مثال نظامِ خلافت کے سوا کہیں نہیں مل سکتی۔

جان کے بدلے جان، بصورت دیگر انسانی جان کی قیمت سو اونٹ یا تقریباً ۵ لاکھ روپیہ۔ جو کہ قاتل کے پورے خاندان سے علی حفظ قرابت وصول کیا جاتا ہے —— ایسی سزا ہے جو پورے معاشرہ کو متنبہ کر دیتی ہے کہ اس جرم کے نزدیک نہ جانا چاہیئے۔ چوری اور ڈاکہ کی سزا مالی تحفظ کے لیے اور زنا اور شراب کی سزا عزت کے تحفظ کے لیے ہے۔

موجودہ جمہوری قوانین تو زنا کو صرف اس صورت میں جرم سمجھتے ہیں جب کہ وہ بالجبر ہو۔

شراب کبھی حلال کر دی جاتی ہے کبھی حرام - آبرو کا مسئلہ کوئی مسئلہ نہیں - کوئی بد معاش آپ کی بے عزتی کرے، گالی دے، مارے - موجودہ قانون اس وقت تک حرکت میں نہیں آتا جب تک کہ وہ آپ کو مار کر زخمی نہ کر دے - رہا چوری ڈاکہ اور قتل کی وارداتیں - تو عدالتوں کے طریق اور وکلاء کی موشگافیوں اور رشوت کے کاروبار نے ان جرائم کو اتنا ارزاں کر دیا ہے کہ انسان کی قیمت ایک جانور جتنی بھی نہیں سمجھی جاتی -

اسلام نے ان قانونی اقدامات کے علاوہ کسی کے جان و مال اور عزت سے کھیلنے سے متعلق جو وعید سُنائی ہے وہ بھی سُن لیجیے -

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے ایک لاکھ چوبیس ہزار کے مجمع میں مسلمانوں سے پوچھا - بتلاؤ آج کونسا دن ہے ؟ لوگوں نے کہا - اللہ اور اس کا رسول ہی بہتر جانتے ہیں - آپ نے فرمایا یہ حرمت کا دن (یوم النحر) ہے - دوسری مرتبہ پُوچھا کہ یہ کون سا مہینہ ہے ؟ لوگوں کے پہلے سے جواب پر آپؐ نے فرمایا یہ حرمت والا مہینہ (ذی الحجہ) ہے - پھر آپ نے تیسری بار پُوچھا یہ کون سا شہر ہے ؟ لوگوں کے پہلے سے جواب پر آپ نے فرمایا - یہ حرمت والا شہر (مکہ مکرمہ) ہے - اس سوال و جواب کے بعد آپ نے فرمایا :

ان اللہ حرم علیکم دماؤکم و اموالکم و اعراضکم کحرمۃ یومکم هذا فی شهرکم هذا فی بلدکم هذا - (بخاری کتاب المناسك)

بے شک تمہاری جانیں، تمہارے اموال اور تمہاری آبروئیں ایک دوسرے پر اس قدر حرام ہیں جیسے آج کے دن، اس مہینہ اور اس شہر میں حرمت ہے -

۲ - معاشرتی حقوق

معاشرتی حقوق سے متعلق بھی اسی خطبہ حجۃ الوداع میں فرمایا کہ گورے کو کالے پر، عربی کو عجمی پر کوئی فضیلت نہیں (معیارِ فضیلت صرف تقویٰ ہے) اور تم سب آدم کی اولاد ہو اور آدم مٹی سے تھے -

اس پر مفصل بحث ہم خاندانی مساوات کے تحت کر چکے ہیں اور یہ بھی بتلا چکے ہیں کہ یہ مساوات صرف اسلام میں قائم ہو سکتی ہے - جہاں سب انسان ہم مرتبہ ہیں - کوئی ایک دوسرے کا محکوم نہیں - حاکمیت صرف اللہ کی ہے -

اب دیکھیے اسلام صرف اس معاشرتی مساوات پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ وہ آپس میں ایک دوسرے کو بھائی بھائی بن کر رہنے کی تلقین کرتا ہے - ارشاد باری ہے - اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ -

اور اخوۃ ایک باپ کی اولاد کو کہتے ہیں جس میں لڑکے لڑکیاں سب شامل ہوتے ہیں گویا اسلام آپس میں بھائیوں جیسا رشتہ مؤدت قائم کرنا چاہتا ہے۔

اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ الدین نصیحۃ دین (نظام حیات) خیر خواہی کا نام ہے۔

اور اس خیر خواہی میں سب مسلم اور غیر مسلم شامل ہیں۔ ایک مسلمان کو ہر ایک کے بھلے کی بات ہی سوچنا چاہیئے۔

۳۔ قانونی حقوق مفت اور بلا تاخیر انصاف کے حصول کے لیے اسلام کے متعدد اقدامات کر کے امیر اور غریب میں جس طرح امتیاز ختم کیا ہے اور یہ حق حاصل کرنے کی جتنی سہولتیں بہم پہنچائی ہیں اس کی تفصیل قانونی مساوات میں گزر چکی ہے۔ اور یہ واضح کیا گیا ہے کہ دیگر جمہوری معاشروں میں غریب عوام کو یہ حق وصول کرنے میں کیا کیا دشواریاں اور مشکلات پیش آتی ہیں۔

۴۔ حقوق ملکیت اسکی تفصیل ہم قومی خزانہ میں حقوق ملکیت کے تحفظ کے تحت دے چکے ہیں اور یہ بھی واضح کر چکے ہیں کہ اس سلسلہ میں جمہوری ملکوں کو عوام پر کیونکر ظلم روا رکھا جاتا ہے۔

۵۔ معاشی حقوق کا تفصیلی تذکرہ قومی خزانہ کے تحت نظام کفالت میں پیش کیا جا چکا ہے اور یہ بھی ثابت کیا جا چکا ہے جس ملک میں ــــــ خواہ وہاں ملوکیت ہو یا جمہوریت ــــــ سرمایہ دارانہ نظام قائم ہو، وہاں غریب عوام مالی وسائل سے استفادہ نہیں کر سکتے۔ اسلام میں سود کے بجائے مضاربت اور زکوٰۃ اور نظام کفالت ایسے اقدامات ہیں۔ جن سے غریب عوام کو وسائل رزق بھی مہیا ہو جاتے ہیں اور ان کی امداد بھی ہو جاتی ہے حتیٰ کہ غیر مسلموں کا بھی پورا پورا خیال رکھا جاتا تھا۔

۶۔ حق تعلیم یوں تو جمہوری ممالک میں بھی عوام کی تعلیم کا حسب ضرورت اہتمام کیا جاتا ہے۔ لیکن اسلام میں تعلیم حاصل کرنا اس کا لازمی حصہ ہے۔ حضرت عمرؓ نے اس کے لیے کئی تدابیر اختیار کیں اور بہت سے ادارے قائم کیے۔ حتیٰ کہ خانہ بدوش بدؤں کے لیے قرآن مجید کی تعلیم جبری طور پر قائم کی۔ ابوسفیان نامی ایک شخص کو چند آدمیوں کے ساتھ مامور کیا کہ وہ قبائل میں پھر پھر کر ہر شخص کا امتحان لے اور جس کو قرآن مجید کا کوئی حصہ بھی یاد نہ ہو

اس کو سزا دے۔

دوسرا فرق یہ ہے کہ اسلامی مملکت میں ایسی تعلیم جو اس کے بنیادی نظریات کے خلاف ہو اسے برداشت نہیں کیا جاسکتا جبکہ جمہوری ممالک میں ایسی کوئی پابندی نہیں۔ کیونکہ یہ ریاستیں عموماً لادینی قسم کی ہوتی ہیں۔ بلکہ واضح تر الفاظ میں یوں سمجھیئے کہ وہ مذہبی دعوے کے باوجود لادینی ہی رہتی ہیں۔

۷۔ حق ضمیر و آزادی مذہب

یعنی ہر شخص کو یہ حق ہوتا ہے کہ وہ جونسا عقیدہ اور جونسا مذہب پسند کرتا ہے، اختیار کرے۔ لیکن کسی دوسرے مذہب یا فریق کی دل آزاری اور نقضِ امنِ عامہ کا باعث نہ بنے۔

اسلام یہ حق تو دیتا ہے کہ "دین میں کوئی جبر نہیں"۔ ہر شخص جو دین پسند کرتا ہے۔ وہ اختیار کرے۔ لیکن ایک دفعہ اسلام لانے کے بعد دین تبدیل کرنے کو وہ جُرم قرار دیتا ہے۔ کیونکہ اسلام ایک تحریک ہے۔ لہٰذا دین کی تبدیلی کو بغاوت سمجھ کر اس کی سزا قتل قرار دیتا ہے۔ اس کے علاوہ کئی قسم کے قانونی حقوق ہیں مثلاً حق نقل و حرکت، حق معاہدہ، حق انجمن سازی یا خاندانی حقوق ایسے حق ہیں جو سب نظام تسلیم کرتے ہیں۔ لہٰذا ان کے تذکرہ کا کوئی فائدہ نہیں۔

۸۔ سیاسی حقوق

جس کی کئی اقسام ہیں۔ مثلاً حق بالغ رائے دہی (بشمول خواتین)، حقِ نمائندگی (قانون سازی کا حق) حق منصب و عہدہ، حکومت پر نکتہ چینی کا حق وغیرہ اور دراصل یہی حقوق ہیں جن پر جمہوری ممالک کا سارا زور صرف ہوتا ہے۔ ان سب حقوق پر ہم پہلے بھرپور تبصرہ کر چکے ہیں۔

گو اسلام میں امیر کا انتخاب شوریٰ کی ذمہ داری ہے۔ امیر باہمی مشورہ سے باقی حکام کو نامزد کرتا ہے۔ پھر بھی اسلام نامزدگی یا عزل و نصب میں جمہوری روح یا حکومت میں عوام کی مداخلت کا عنصر قائم رکھتا ہے:۔ حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ نے کئی گورنروں کو اہلِ علاقہ کی شکایت کی بنا پر معزول کر دیا تھا۔ حضرت سعد بن ابی وقاص جیسے پایہ کے بزرگ صحابی اور فاتح کو حضرت عمرؓ نے کوفہ کی گورنری سے محض اس لیے معزول کر دیا کہ وہاں کے لوگوں نے ان کی شکایت کی تھی۔

صوبجات اور اضلاع کے حاکم اکثر رعایا کی مرضی سے مقرر کیے جاتے تھے اور بعض اوقات بالکل انتخاب کا طریقہ عمل میں آتا تھا۔ کوفہ، بصرہ اور شام میں جب عمال خراج

(COLLECTOR) مقرر کیے جانے لگے تو حضرت عمرؓ نے ان تینوں صوبوں میں احکام بھیجے کہ وہاں کے لوگ اپنی اپنی پسند سے ایک ایک شخص انتخاب کر کے بھیجیں جو ان کے نزدیک تمام لوگوں سے زیادہ دیانتدار اور قابل ہوں۔ چنانچہ کوفہ سے عثمان بن فرقد، بصرہ سے حجاج بن علاط اور شام سے معن بن یزید کو لوگوں نے منتخب کر کے بھیجا اور حضرت عمرؓ نے انھیں لوگوں کو ان مقامات کا حاکم مقرر کیا۔

عوامی حقوق کے اس سرسری جائزہ سے یہ بات صاف واضح ہے کہ ایسے حقوق جن کا تعلق لادینیت، فحاشی اور عیاشی سے ہے۔ ان حقوق کا تو مغربی جمہوریت میں خوب ڈھنڈورا پیٹا جاتا اور ان کی حمایت کی جاتی ہے اور جن حقوق کا تعلق مصالح عامہ، غریب پروری، اور امن سے ہے وہ بالعموم نظرانداز کر دیے جاتے ہیں۔ اس کے برعکس اسلام انھیں بنیادی اور عوامی حقوق کی نگہداشت کرتا اور سارا زور ان پر صرف کرتا ہے۔

اسلامی مملکت میں غیر مسلموں کے حقوق

مملکت اسلامیہ میں قانونی حقوق غیر مسلموں (ذمیوں) کو بھی ویسے ہی حاصل ہوتے ہیں جیسے مسلمانوں کو۔ اگر کوئی مسلمان کسی ذمی کو قتل کر ڈالتا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ فوراً اس کے بدلے مسلمان کو قتل کرا دیتے تھے۔ مال اور جائیداد کے متعلق ان کے حقوق کی حفاظت اس سے بڑھ کر کیا ہو سکتی ہے کہ جس قدر زمینیں ان کے قبضے میں تھیں، فتح کے بعد بھی ان کے قبضہ میں بحال رہنے دی گئیں۔ ملکی انتظامات میں بھی ان سے مشورہ لیا جاتا تھا۔ ایسے انتظامات جن کا تعلق ذمیوں سے ہوتا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ ان کے مشورہ اور استصواب کے بغیر کام نہیں کرتے تھے۔

ایک دفعہ شام کے ایک کاشتکار نے شکایت کی کہ اہلِ فوج نے اس کی زراعت کو پامال کر دیا ہے۔ حضرت عمرؓ نے بیت المال میں سے دس ہزار درہم اس کو معاوضہ میں دلوا دیے۔

مذہبی اُمور میں ذمیوں کو پوری آزادی تھی۔ ہر قسم کی رسوم مذہبی ادا کرتے تھے۔ علانیہ ناقوس بجاتے اور صلیب نکالتے تھے۔ مسلمان اگر کسی سے سخت کلامی کرتے تو وہ اس کی پاداش کے مستحق ہوتے تھے۔

ان سے جزیہ اور عشور کے علاوہ کوئی محصول نہ لیا جاتا تھا اور جزیہ کی شرح میں نرمی کا پہلو اختیار کیا جاتا تھا۔ ایک دفعہ حضرت عمرؓ نے ایک بوڑھے کو بھیک مانگتے دیکھا پوچھا

بھیک کیوں مانگتا ہے؟ بولا مجھ پر جزیہ لگایا گیا ہے۔ اور مجھ میں ادا کرنے کی طاقت نہیں" آپ اسے اپنے ساتھ گھر لے آئے اور کچھ نقد دے کر بیت المال کے ناظم کو کہلا بھیجا کہ اس قسم کے معذوروں کے لیے بیت المال سے وظیفہ مقرر کر دیا جائے۔

آپ کے دَور میں قاعدہ یہ تھا کہ جو مسلمان اپاہج یا ضعیف ہو جاتا۔ بیت المال سے اس کا وظیفہ مقرر ہو جاتا تھا۔ بعینہٖ ایسی ہی مراعات ذمیوں کو بھی حاصل تھیں۔

ماحصل یہ ہے کہ سوائے کلیدی اسامیوں پر فائز ہونے کے ان لوگوں کو وہ تمام قانونی مراعات حاصل تھیں جو مسلمانوں کو حاصل تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ ذمیوں نے اپنی ہم مذہب سلطنتوں کے مقابلہ میں مسلمانوں کا ساتھ دیا۔ ذمی ہی تھے جو مسلمانوں کے لیے رسد بہم پہنچاتے، لشکر گاہ میں مینا بازار لگاتے، اپنے اہتمام اور خرچ سے سڑک اور پل تیار کراتے تھے۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ جاسوسی اور خبر رسانی کے فرائض بھی سرانجام دیتے تھے۔

۲۔ مغربی جمہوریّت کے مفاسد

(نوٹ :۔ یہ مضمون ترجمان الحدیث فروری ۱۹۷۹ء میں شائع ہوا تھا لہٰذا اس میں مندرجہ اعداد و شمار اسی دَور کے مطابق ہیں)

جمہوریت کو سیاست و ریاست کے میدان میں انسانی غور و فکر کی معراج سمجھا جاتا ہے اور چند جزوی ترامیم کے ساتھ دُنیا کے بیشتر ممالک میں اور اسی طرح پاکستان میں بھی یہی جمہوری نظام رائج ہے۔ بحث و تمحیص سے پیشتر ضروری ہے کہ اس کے مبادیات پر ایک نظر ڈالی جائے۔

مغربی جمہوریت کی تعریف اور مختصر تعارف جمہوریت کی بہت سی تعریفیں کی گئی ہیں جن میں سے ابراہیم لنکن، ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے سولہویں صدر، کی تعریف زیادہ جامع قرار دی گئی ہے اور وہ یوں ہے :۔

"GOVERNMENT OF THE PEOPLE, BY THE PEOPLE, FOR THE PEOPLE.

یعنی "عوام پر، عوام کی حکومت، عوام کی مرضی سے"!

گویا عوام کو یہ ذہن نشین کرایا جاتا ہے کہ یہ حکومت اُن کی اپنی ہی ہے اور ان پر کسی دوسری حاکمیت کا دباؤ نہیں ہے[1] اور اس کا طریق کار یہ ہے کہ عوام میں سے ہر بالغ مرد اور عورت اپنا نمائندہ منتخب کرنے کا حق رکھتا ہے تاکہ یہ منتخب نمائندے اُن پر حکومت کریں اور اُن کے لیے قانون بنائیں۔

جمہوریت کی دو قسمیں بتائی جاتی ہیں:

۱۔ **بلاواسطہ جمہوریت**۔ جس میں تمام شہری بلا واسطہ حکومت کے انتظام میں حصہ لے سکیں۔ یہ قدیم یونان اور رُوما کی شہری ریاستوں میں پائی جاتی تھی۔ ایسا نظام چونکہ صرف ایک چھوٹی سی ریاست میں قائم ہو سکتا ہے۔ لہٰذا آج کے دَور میں یہ ناقابلِ عمل ہے۔ سوائے سوئٹزرلینڈ کے چند علاقوں اور امریکہ کی بعض میونسپلٹیوں کے اور کسی جگہ نہیں پایا جاتا۔

۲۔ **بالواسطہ جمہوریت**۔ اس میں عوام ایک معینہ عرصے کے لیے اپنے نمائندے منتخب کر کے مجلسِ قانون ساز کی تشکیل کرتے ہیں جو ملک کے لیے قانون بناتی ہے۔ جمہوریت کی یہی قسم آج کل

---

[1] غور فرمایئے اس نظامِ سیاست میں اللہ کی حاکمیت کی کہیں گنجائش نظر آتی ہے؟

رائج ہے۔

پارلیمانی اور صدارتی نظام کیا ہے؟

جمہوری حکومتوں میں اگر عاملہ اور مجلس قانون ساز آپس میں متحد ہوں اور مشترکہ طور پر ایک ہی جماعت کے زیرِ نگرانی کام کرتے ہوں تو اُسے وزارتی یا پارلیمانی طرزِ حکومت کہتے ہیں۔ اس میں صدر کی حیثیت ایک آئینی سربراہ کی ہوتی ہے، تمام اختیارات وزیرِ اعظم کو ہوتے ہیں۔ اور اگر عاملہ اور مقننہ علیٰحدہ اور آزاد ہوں تو ایسی طرزِ حکومت کو صدارتی کہا جاتا ہے۔ اس صورت میں وزیرِ اعظم اور صدر کے اختیارات تقریباً برابر ہوتے ہیں۔ صدر اپنی کابینہ میں حزبِ اختلاف کا نمائندہ بھی لے سکتا ہے۔ جب کہ پارلیمانی نظام میں یہ صورت نہیں ہوتی۔

پاکستان کا دستور

پاکستان کے موجودہ دستور، جو اپریل ۱۹۷۳ء میں منظور ہوا۔ اور ۱۴ اگست ۱۹۷۳ء کو ملک بھر میں نافذ ہوا کے مطابق ملک میں پارلیمانی نظام رائج ہے پارلیمنٹ ملک کا اعلیٰ ترین قانون ساز ادارہ ہے۔ جو دو ایوانوں پر مشتمل ہے۔ ایوانِ بالا کا نام سینٹ اور ایوانِ زیریں کا نام قومی اسمبلی ہے۔ قومی اسمبلی میں نشستوں کی کل تعداد ۲۰۰ ہے۔ یہ نشستیں صوبوں کی آبادی کے تناسب کے مطابق طے کی جاتی ہیں۔ قومی اسمبلی کے انتخاب ہر پانچ سال بعد ہوتے ہیں۔ سینٹ کی کل نشستیں ۶۳ ہیں۔ ایوانِ بالا میں تمام صوبوں کو یکساں نمائندگی دی گئی ہے۔ ہر صوبہ کے لیے ۱۴ نشستیں مخصوص ہیں۔ علاوہ ازیں دو وفاقی حکومت کے لیے اور پانچ وفاقی حکومت کے زیرِ انتظام قبائلی علاقوں کے لیے مخصوص ہیں۔ سینٹ کے ممبران کا انتخاب ۴ سال بعد ہوتا ہے، لیکن اس کی صورت یہ ہے کہ نصف ممبروں کا انتخاب ہر دو سال بعد ہوتا رہتا ہے۔

اس نظامِ حکومت میں صدر یا سربراہِ مملکت کا انتخاب قومی اسمبلی اور سینٹ دونوں کے مشترکہ اجلاس میں ۵ سال کے لیے کیا جاتا ہے، لیکن اس کی حیثیت محض آئینی سربراہ کی ہے۔ تمام انتظامی اور حکومتی اختیارات کا مالک وزیرِ اعظم ہوتا ہے کیونکہ صدر کا کوئی حکم اُس وقت تک نافذ العمل نہیں ہو سکتا جب تک وزیرِ اعظم اُس پر دستخط ثبت نہ کر دے۔

علاوہ ازیں پاکستان کے چاروں صوبوں میں ایک ایوانی مقننہ قائم کی گئی ہے جسے صوبائی اسمبلی کہا جاتا ہے۔ صوبوں کی آبادی کا تناسب کا لحاظ رکھتے ہوئے ان اسمبلیوں میں نشستوں کی تعداد یہ ہے۔

پنجاب: ۲۴۰۔ سندھ: ۱۰۰۔ سرحد: ۸۰۔ بلوچستان: ۴۰۔ کل نشستیں ۴۶۰ ہیں۔ جن کا انتخاب دستور کے مطابق ہر پانچ سال بعد ہونا چاہیئے۔

انتخابات کی بھرمار سینٹ، قومی اسمبلی اور صوبائی اسمبلی کے بعد ملک بھر میں بلدیاتی اداروں (میونسپل کمیٹیاں وغیرہ) کے بھی انتخابات ہوتے رہتے ہیں۔ یہ سب کچھ سرکاری اور نیم سرکاری سطح پر ہوتا ہے۔ نجی سطح پر سیاسی پارٹیوں کے داخلی انتخابات، مختلف جماعتوں اور تنظیموں کے انتخابات، ٹریڈ یونینوں، سکولوں اور کالجوں کے انتخابات، غرض انتخابات کا ایک ایسا لامتناہی سلسلہ چل نکلتا ہے کہ کوئی وقت ایسا نہیں گزرتا جب کہیں نہ کہیں انتخابات نہ ہو رہے ہوں۔

مغربی طرزِ انتخاب کے زندگی کے مختلف پہلوؤں پر اثرات

اب ہم یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ اس طرز انتخاب کے زندگی کے مختلف پہلوؤں پر اخلاقی، معاشرتی معاشی، سیاسی وغیرہ پر کیسے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔

۱۔ انتخاب اور اخلاقی اقدار

انتخابات کے دوران مُلکی سطح پر مکر و فریب، بد دیانتی اور جھوٹ کے جتنے مظاہرے مشاہدے میں آتے ہیں، اس سے پہلے یا بعد شاید ہی کبھی ایسی صورت پیش آتی ہو۔

۱۔ بد دیانتی آئندہ انتخابات سے سال ڈیڑھ سال پیشتر حزب اقتدار یہ کوشش شروع کر دیتا ہے کہ نئی انتخابی حلقہ بندی اس طریق سے کی جائے۔ جو ووٹوں کے حصول کے لیے اس کے حق میں مفید ہو۔ اگر یہ نہیں تو کم از کم حریف کے حق میں نقصان دہ ضرور ہو۔ فہرستوں کی تیاری بھی چونکہ حکمران پارٹی کی ذمہ داری ہے لہٰذا ایسے علاقوں میں جہاں اُسے کامیابی کی توقع ہوتی ہے جعلی اور دوہرے ووٹوں کا اندراج بکثرت کرایا جاتا ہے۔ اور جس علاقہ میں اُسے اپنی پارٹی کی کامیابی کا امکان کم ہو وہاں کے بیشتر ووٹ درج رجسٹر ہی نہیں کیے جاتے۔ گویا الیکشن کے انعقاد سے بہت پہلے بد دیانتی پر اس کی بنیاد رکھ دی جاتی ہے۔

۲۔ حریف کی تذلیل جب کوئی نمائندہ الیکشن کے لیے درخواست دے چکتا ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا اُس نے اپنے آپ کو ہدف تنقید و ملامت بننے کی عام دعوت دے دی ہے۔ اب حریف پارٹی کا یہ حق ہے کہ اس کی نجی زندگی کے جملہ عیوب تلاش کر کے لوگوں میں اُن کی ہر ممکن تشہیر کرے۔ اُس کی عزت پر کیچڑ اچھالے۔ اس کے جن رازہائے دروں اور گناہ ہائے تاریک پر خدا تعالیٰ نے پردہ ڈالا ہوا ہے، خلق خدا اُسے چاک کرتی اور اُسے رسوا اور بدنام کرتے میں کوئی دقیقہ

فروگذاشت نہیں کرتی۔

الغرض جلسے جلوسوں میں فریقِ مخالف کی تذلیل، اس کی کمزوریوں کی تشہیر، فلاں کتا ہائے ہائے فلاں پارٹی مُردہ باد، خود کو فرشتہ ثابت کرنا اور مخالف کو غدار اور ملک دشمن قرار دینا یہ سب کچھ مغربی جمہوریت کے طرزِ انتخاب کی شعبدہ بازیاں ہیں جن پر کوئی قانونی گرفت نہیں۔

۳۔ جھوٹے اور ناممکن وعدے

الیکشن کے دوران عوامی حمایت حاصل کرنے کے لیے ایسے دلفریب نعرے (SALOGANS) اور وعدے ایجاد کیے جاتے ہیں جن کا پورا کرنا ناممکنات میں سے ہوتا ہے اور عوام میں اتنا شعور نہیں ہوتا کہ وہ ان کی تہہ تک پہنچ سکیں مثلاً ۱۹۷۰ء کے الیکشن میں پیپلز پارٹی نے یہ وعدہ کیا تھا کہ وہ ہر کاشتکار کو ساڑھے بارہ ایکڑ زمین مہیا کرے گی جب کہ صورتِ حال یہ ہے کہ پاکستان کی کل قابلِ کاشت زمین جس کا اب تک سروے ہو سکا ہے، ۷½ کروڑ ایکڑ ہے لیکن کاشت صرف ۴ء۸ کروڑ ایکڑ پر ہو رہی ہے۔ پاکستان کی کل آبادی ۷½ کروڑ ہے جس کا ۸۰ فیصد آبادی دیہات میں رہتی ہے۔ پھر اس میں سے ۲۰ فیصد وہ لوگ ہیں جو کھیتی باڑی کا کام کرتے ہیں۔ گویا پاکستان میں ایک کروڑ بیس لاکھ کاشتکار موجود ہیں، بالفاظِ دیگر اگر حکومت تمام زمینداروں اور جاگیرداروں سے زمین چھین کر تمام کاشتکاروں میں برابر برابر تقسیم کر دیتی تو بھی چار ایکڑ سے زیادہ کسی کے حصے میں نہیں آ سکتی تھی۔ اس لحاظ سے یہ وعدہ ناممکنات سے تھا، اور جھوٹا اس لیے کہ بھٹو نے جو زرعی اصلاحات نافذ کیں تو تمام بڑے بڑے جاگیرداروں اور زمینداروں نے حتیٰ کہ خود بھٹو نے بھی ایسی قانونی چالیں چلیں کہ ان کے قبضہ سے ایک انچ بھی زمین نہ نکل سکی۔ تاہم اس وعدے سے الیکشن کے دوران خوب فائدہ اُٹھایا گیا اور عوام کی حمایت حاصل کی گئی۔

اسی طرح ہر شخص کو روٹی، کپڑا اور مکان مہیا کرنے کا جو وعدہ کیا گیا تھا وہ بھی شرمندہ تعبیر نہ ہو سکا۔ جب آئندہ انتخابات قریب آئے تو ۵ مرلہ سکیم چلائی گئی جسے زیادہ تر سیاسی سٹینٹ کے طور پر ہی استعمال کیا جاتا رہا لیکن الیکشن کے دوران عوام کا بیشتر طبقہ اس بھرتے میں آ گیا تھا۔

۱۹۷۷ء میں قومی اتحاد نے تحریک چلائی تو گرانی کی روک تھام کے لیے اشیاء کی قیمتوں کو ۱۹۷۰ء کی سطح پر لانے کا وعدہ کیا گیا۔ یہ وعدہ بھی ناممکن العمل تھا کیونکہ پاکستان کی منڈی پر بیرونی منڈیوں کا بھی گہرا اثر ہے۔ ہم ملکی پیداوار اور اس کی قیمتوں پر تو کسی حد تک کنٹرول کر سکتے ہیں، لیکن برآمدات کی قیمتوں پر کنٹرول رکھنا ہمارے بس سے باہر ہے۔ لیکن وقتی طور پر عوام اس وعدے پر کافی حد تک یقین کر چکے تھے۔

۴۔ سیاسی رشوت الیکشن کے زمانے میں سیاسی پارٹیوں کے قائدین وفود کی صورت میں عام بھی ملاقاتوں سے بھی شرف بخشتے ہیں اور کامیابی کی صورت میں اُن کے مطالبات پورے کرنے کا وعدہ بھی کرتے ہیں جس کا اثر بالآخر "خزانہ عامرہ" پر پڑتا ہے ۔ بیشتر مقامات پر ووٹ کی قیمت نقدی کی صورت میں طے پا جاتی ہے اور پوری آبادی کے ووٹ سیم وزر کی قوت سے حاصل کر لیے جاتے ہیں۔ بعض دفعہ اپنے حریف نمائندہ سے سودا بازی کر کے اُس کو الیکشن سے دستبردار ہونے پر آمادہ کر لیا جاتا ہے جس کے لیے اُس کے جملہ مصارف کے علاوہ مزید ایک خطیر رقم بھی ہدیہ کی جاتی ہے ۔ گویا عوام کا ضمیر، جسے ایک مقدس امانت تصور کیا جاتا ہے، سیاست کی مارکیٹ میں گاجر مولی کی طرح فروختنی چیز بن کر رہ جاتا ہے۔

۵۔ الیکشن کے دوران گھناؤنے جرائم حکمران پارٹی جو الیکشن کے ضوابط کے علی الرغم کسی نہ کسی طرح اقتدار سے چمٹی رہتی ہے۔ انتظامیہ کی وساطت سے ناپاک حربے استعمال کرنے پر اُتر آتی ہے۔ حریف پارٹی کے نمائندہ پر پولیس کے ذریعے اس قدر دباؤ ڈالا جاتا ہے کہ وہ مجبور ہو کر الیکشن سے دستبرداری کا اعلان کر دے اور اگر وہ دباؤ میں نہ آسکے تو اسے سرکاری سطح پر رشوت پیش کی جاتی ہے اور پھر بھی کامیابی نہ ہو تو اُسے اغوا کر لیا جاتا ہے۔ قتل کی محض دھمکی ہی نہیں دی جاتی بلکہ حسبِ ضرورت اُس کا ارتکاب بھی کیا جاتا ہے۔ الیکشن کے دن ووٹروں کو ڈرایا دھمکایا جاتا ہے جعلی ووٹوں کی بھرمار، گنتی میں عیاری، بیلٹ بکسوں کی تبدیلی، غرضیکہ دھاندلی کی کوئی ایسی قسم باقی نہیں رہ جاتی جسے الیکشن کے دوران استعمال نہ کیا جاتا ہو۔ ان تمام حربوں کے باوجود اگر پھر بھی اپنی کامیابی پر اطمینان نہ ہو تو آخری مرحلہ پر انتظامیہ کو مجبور کیا جاتا ہے کہ وہ نتائج کے اعلان کے وقت غلط اعداد و شمار کے ذریعے اس پارٹی کو کامیاب قرار دے دے۔

یہ ہے انتقالِ اقتدار کا وُہ پُر امن ذریعہ جس پر مغربی جمہوریت کو ناز ہے۔ الیکشن کے ضوابط خواہ کیسے دلفریب ہوں، الیکشن کے لیے جو فضا تیار کی جاتی ہے یا بن جاتی ہے۔ اُن میں اصُولوں پر کاربند رہنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ کسی آمر سے جمہوریت کے ذریعہ کبھی نجات نہیں ملی جب کبھی اس سے نجات ملی عوام کی قربانی سے ملی ہے۔

۲۔ معاشرہ پر اثرات

۱۔ سیاسی دھڑے بازی جس طرح خود غرضی انسان کو گھٹی میں پڑی ہوئی ہے اسی طرح اقتدار کی ہوس بھی اس کی فطرت میں داخل ہے۔ جس ملک میں مغربی جمہوریت کارفرما ہو، وہاں حُبِّ جاہ

کے لیے میدان پہلے سے تیار ہوتا ہے، کئی سیاسی پارٹیاں وجود میں آتی ہیں اور جب کبھی انتخاب کی تاریخ کا اعلان ہوجاتا ہے تو کئی نئی سیاسی پارٹیاں یوں جنم لینے لگتی ہیں جیسے برسات میں حشرات الارض ظاہر ہے کہ ان پارٹیوں میں ہر پارٹی دوسروں کے مقابلہ میں صف آرا ہوتی ہے اور کرسیٔ اقتدار پر براجمان ہونے کے خواب دیکھتی ہے۔ اس طرح ملک کئی سیاسی دھڑوں میں بٹ جاتا ہے جن کی ایک دوسرے سے سرد جنگ شروع ہو جاتی ہے جو بعض دفعہ خطرناک صورت اختیار کرلیتی ہے۔

۲- عداوت ومنافرت کی فضا

چونکہ اس نظام میں سیاسی پارٹیوں کی تعداد، نمائندہ اور ووٹر کسی پر بھی کوئی پابندی نہیں ہے۔ اس لیے انتشار و عداوت کا یہ سلسلہ سیاسی حلقوں سے نکل کر گھروں میں بھی جا داخل ہوتا ہے۔ گھر میں خان صاحب اگر ایک پارٹی کا ساتھ دیتے ہیں تو بیگم صاحبہ دوسری پارٹی کے ساتھ ہیں، اور صاحبزادہ صاحب ایک تیسری پارٹی کے ساتھ تعلق رکھتے ہیں۔ یہ سیاسی اختلافات ان کی گھریلو زندگی پر بھی بری طرح اثر انداز ہوتے ہیں۔ چونکہ ہر فرد کو اپنی پارٹی سے تعصبانہ قسم کا لگاؤ ہوتا ہے۔ اس لیے ہر کوئی دوسرں کے لیے جاسوس بن جاتا ہے اور لگائی بجھائی کی وجہ سے بسا اوقات یہ انتہائی قریبی خون کے رشتے ایک دوسرے کے لیے جانی دشمن بن جاتے ہیں۔

انتخابات میں کامیاب تو صرف ایک فریق ہی ہوسکتا ہے۔ جب اُسے اپنی کامیابی کی اطلاع ملتی ہے تو وہ فراخدلی کا ثبوت دینے کے بجائے عموماً شکست خوردہ فریق کے سامنے فخر ومباہات کے مظاہرے شروع کر دیتا ہے اور کبھی اس حد سے بھی گزر کر اس کی تذلیل شروع کر دیتا ہے یا انتقامی کارروائی پر اُتر آتا ہے۔ شکست خوردہ فریق چونکہ پہلے ہی غم وافسوس سے بھرا ہوتا ہے لہٰذا ہر دو صورتوں میں نتیجہ بدترین فساد کی صورت میں رونما ہوتا ہے ـــ انتخابی سرگرمیاں تو ختم ہو جاتی ہیں لیکن دھڑے بندیاں اور عداوتیں پرورش پاتی رہتی ہیں۔ تاآنکہ نئے الیکشن کی تیاریاں شروع ہوجاتی ہیں جو جلتی پر تیل کا کام کرتی ہیں۔ اور یہ محض مفروضے نہیں، اہالیانِ پاکستان کو ان کا خوب خوب تجربہ ہے۔

۳- وحدتِ ملّی کا فقدان

یہ سب کچھ تو اسمبلیوں کے باہر ہوتا ہے، درونِ خانہ صورتِ حال اس سے بھی بدتر ہوتی ہے۔ حزبِ اقتدار اور حزبِ اختلاف دونوں یہاں پہنچ کر سابقہ مخالفت کو ہوا دیتے ہیں۔ حزبِ اختلاف کا اصل مقصد تو یہ بتلایا جاتا ہے کہ وہ حزبِ اقتدار کی پالیسیوں پر تعمیری تنقید کرکے اُسے صحیح راہ پر گامزن رکھے۔ لیکن عملاً یہ ہوتا ہے کہ حزبِ اقتدار

کے کسی اچھے سے اچھے کام پر بھی تنقید کرنا فرض سمجھا جاتا ہے۔ گویا اختلاف کرنا ہی اس کا اصل مقصد ہے۔
دوسری طرف حزب اقتدار آخر حزبِ اقتدار ہے جو ناک پر مکھی بیٹھنا بھی گوارا نہیں کرتا۔ وہ بھلا حزبِ اختلاف کی تنقید کیوں برداشت کرے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بسا اوقات اسمبلی میں کرسیوں سے جنگ شروع ہو جاتی ہے جس میں اکثر اپوزیشن ہی پٹتی ہے اور سابقہ دورِ حکومت میں تو یہ معاملہ یہاں تک بڑھا کہ حزبِ اقتدار نے باہر سے غنڈے منگوا کر اپوزیشن کے ممبروں کو دھکے دے کر اسمبلی ہال سے باہر نکال دیا تھا۔

اس کا دوسرا پہلو وہ سیاسی جوڑ توڑ ہے جس کی بنا پر آئندہ الیکشن میں کامیابی کے لیے تیاریاں شروع کی جاتی ہیں۔ اس جوڑ توڑ میں ہر قسم کے ہتھکنڈوں اور منافقت کو عین حکمتِ عملی سمجھا جاتا ہے۔ ان سب باتوں کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ملی وحدت پارہ پارہ ہو کر رہ جاتی ہے۔ مغربی جمہوریت کے تحت طرز انتخاب کا یہ نتیجہ لازمی اور فطری ہے اگر کوئی یہ کہے کہ اخلاقی ضابطہ سے ان نتائج کو بدلا جا سکتا ہے تو یہ ایک ایسی بات ہے کہ مشاہدات اور تجربات اس کی تائید نہیں کرتے۔

۳۔ ملکی معیشت پر اثرات

۱۔ الیکشن کے اخراجات کا بار قومی خزانہ پر انتخابات منعقد کرانے کے لیے حکومت کو الیکشن کمیشن مقرر کرنا پڑتا ہے۔ پھر حلقہ بندی بعد ازاں فہرستوں کی تیاری اور طباعت اور اس کے بعد الیکشن کے دن کے انتظامی امُور پر حکومت کو بہت سی رقم صرف کرنا پڑتی ہے۔ ۱۹۷۷ء کے الیکشن میں حکمران پارٹی کی دھاندلیاں اپنی انتہا کو پہنچ گئیں۔ نیز ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر غلط اعداد و شمار کے ذریعے اس نے اپنے آپ کو کامیاب قرار دیا تو اُن مظالم کے خلاف حزبِ مخالف یا قومی اتحاد کی طرف ہمہ گیر تحریک چلائی گئی جس میں نام نہاد حکمران پارٹی کے وزیر اعظم بھٹو سے دوبارہ الیکشن کرانے کا مطالبہ کیا گیا۔ جس کے جواب میں بھٹو صاحب نے یہ کہا تھا کہ پاکستان جیسا غریب مُلک دوبارہ الیکشن کے اخراجات کا تحمل نہیں ہو سکتا۔ سعودی عرب جو فریقین میں مفاہمت کی بھرپور کوشش کر رہا تھا، نے یہ پیش کش کی کہ اگر دوبارہ انتخاب کرانے سے معاملہ سلجھ سکتا ہے تو دوسرے الیکشن کے علاوہ پہلے الیکشن کے اخراجات بھی سعودی عرب کی حکومت برداشت کرنے کو تیار ہے۔ اس وقت ان اخراجات کا اندازہ ۱۴ کروڑ روپے لگایا گیا تھا۔ گویا ۱۹۷۷ء کے الیکشن میں قومی خزانہ سے ۷ کروڑ روپے کی رقم اس انتخاب پر خرچ ہوئی تھی۔

۲۔ نمائندوں کے اخراجات الیکشن کے انعقاد کے اعلان سے لے کر معینہ تاریخ تک عموماً تین ماہ کا وقفہ ہوتا ہے۔ اس دوران سیاسی سرگرمیاں جو بن پر ہوتی ہیں۔ بینر، جھنڈے، اشتہارات، جلسے جلوس، کنویسنگ اور مہمانداری پر نمائندوں کے اخراجات کا اندازہ اس واقعہ سے لگایا جا سکتا ہے کہ ایک پارٹی نے کسی مخصوص حلقے سے قومی اسمبلی کے چناوٗ کے لیے جس معزز آدمی کے نام قرعہ ڈالا۔ اُس شخص نے معذوری ظاہر کی کہ اُس کے پاس اخراجات کے لیے رقم نہیں ہے تو اُسے الیکشن لڑنے کے لیے چار لاکھ روپیہ کی پیش کش کی گئی تھی۔ یہ واقعہ ہماری معلومات کی حد تک بالکل صحیح ہے۔ از راہ احتیاط ہم یہ رقم تین لاکھ فی نمائندہ فرض کر لیتے ہیں۔

یہ ہم بتلا چکے ہیں کہ قومی اسمبلی کے ممبران کی تعداد ۲۰۰، صوبائی اسمبلیوں کے ممبروں کی تعداد ۴۶۰۔ اور سینیٹ کے ممبران کی تعداد ۶۰۔ کل تعداد ۷۲۳ ہوئی۔ بلدیاتی اداروں کے انتخابات بھی سر دست از راہِ احتیاط نظر انداز کرتے ہیں۔ بعض نشستوں پر الیکشن لڑنے والوں کی تعداد آٹھ دس تک پہنچ جاتی ہے جبکہ چند نشستیں ایسی بھی ہوتی ہیں جہاں بلا مقابلہ انتخاب عمل میں آجاتا ہے۔ احتیاطاً ہم ہر نشست پر ۳ نمائندے فرض کر لیں تو اس طرح اخراجات کا اندازہ ـــ ۷۲۳ × ۳ = ۲۱۶۹ نمائندوں کا مجموعی خرچ ۲۱۶۹ × ۳ لاکھ = ۶۵،۰۷،۰۰،۰۰۰ یعنی ۶۵ کروڑ، ۷ لاکھ روپے بنتا ہے۔

۳۔ حریف کو مالی نقصان پہنچانا الیکشن کے دوران سیاسی پارٹیاں منافقت کی روش اختیار کر کے حریف سے انتقام لیتی ہیں۔ گاؤں میں خاندانی رقابتوں کی وبا عام ہوتی ہے۔ وہاں بھی یہ طریق اختیار کیا جاتا ہے کہ جب اپنے حریف کو مالی طور پر تباہ کرنا مقصود ہو تو حریف پارٹی کے ارکان اُس کی خوشامد کرتے، اُس کو درخواست دینے پر اُکساتے اور اپنی حمایت کا بھرپور اعلان کرتے ہیں۔ اس دوران منافقین کا یہ ٹولہ خوب گلچھرے اُڑاتا اور طرح طرح کے حیلوں بہانوں سے اُسے مالی طور پر کمزور کرنے میں مصروف رہتا ہے۔ جب نمائندہ ایک کثیر رقم خرچ کر چکتا ہے اور الیکشن کا وقت قریب آجاتا ہے تو یہ خوشامدی اُس پر کوئی شکایت یا الزام عاید کر کے اس سے بگڑ بیٹھتے ہیں اور اس کی حمایت سے دست بردار ہو جاتے ہیں۔ یوں اُسے معاشی طور پر تباہ کر کے اس سے سیاسی انتقام لیا جاتا ہے اور اس انتقام کی آڑ میں بہت سی قومی دولت ضائع ہو جاتی ہے۔

۴۔ کاروباری نقصان الیکشن کا زمانہ چونکہ جلسوں، جلوسوں کا دَور ہوتا ہے، لہٰذا اس سے

شہری حلقہ بہت متاثر ہوتا ہے۔ کبھی تو یہ لوگ خود جلسوں اور جلوسوں میں شامل ہوتے ہیں اور کبھی جلوس جلسوں کی وجہ سے انہیں دکانیں بند کرنا پڑتی ہیں۔ اس قسم کے نقصان کا اندازہ لگانا بہت مشکل ہے تاہم یہ بات وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ نمائندوں کے اخراجات سے یہ نقصان کسی صورت کم نہیں ہوسکتا۔

۵۔ قومی خزانہ میں خرد بُرد

اب جو نمائندے منتخب ہوکر اسمبلیوں میں پہنچ جاتے ہیں۔ انہیں اس بات کا شدید احساس ہوتا ہے کہ جو رقم الیکشن کے دوران خرچ ہو چکی وہ کیونکر پوری ہوسکتی ہے۔ غصب اور غبن کے طریقے بھی پہلے ہی سے معلوم ہوتے ہیں۔ لائسنسوں اور پرمٹوں وغیرہ کے اجرا پر رشوت بھی طے شدہ ہوتی ہے۔ لہٰذا اس نقصان کی جلد ہی تلافی ہوجاتی ہے۔ مگر معاملہ یہیں تک محدود نہیں ہوتا۔ برابر برابر کی سودے بازی تو کوئی معنی نہیں رکھتی۔ یہ لوگ اگر ایک لاکھ خرچ کریں تو دس لاکھ کمانے کی ہوس رکھتے ہیں۔ دولت کی ہوس انہیں اس بات پر آمادہ کردیتی ہے کہ وہ جلد از جلد یہ مقصد حاصل کرلیں۔ کیونکہ جمہوریت کی بے ثباتی کا انہیں بھی خوب علم ہوتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آئندہ الیکشن کے دوران اسمبلیوں کے خاتمے پر ان کی جائیداد پہلے سے کئی گُنا زیادہ ہوچکی ہوتی ہے۔ اس کے دو ہی ذریعے ہوسکتے ہیں، رشوت اور قومی خزانہ کی لوٹ کھسوٹ۔ رشوت سے ظلم، ناانصافی اور گرانی جنم لیتے ہیں۔ اور سرکاری خزانہ میں غصب و غبن کے عوض عوام پر نئے ٹیکس عاید کیے جاتے ہیں۔ دونوں صورتوں میں ملکی معیشت پر گہرا اثر پڑتا ہے اور عوام ہی پستے ہیں۔

پھر ان ممبر حضرات کا معاملہ محض اپنی ذات تک محدود نہیں ہوتا۔ الیکشن کے دوران جن کارکنوں نے ان کی مخلصانہ خدمات سرانجام دی ہوتی ہیں۔ وہ بھی ان سے بہت کچھ توقع رکھتے ہیں، اور ممبر حضرات بھی ان کارکنوں کی خدمات کا معاوضہ ادا کرنا چاہتے ہیں۔ صرف اس لیے نہیں کہ ان سے وعدے وعید کیے ہوئے تھے۔ بلکہ اس لیے بھی کہ آئندہ ۵ سال بعد پھر اس مخلص جماعت کی ضرورت پیش آئے گی۔ ان لوگوں کو جو معاوضہ دیا جاتا ہے اس کا بار بھی بالواسطہ قومی خزانہ پر ہی پڑتا ہے۔

اب اگر ہم یہ فرض کرلیں کہ ان حضرات نے اپنی صرف شدہ رقم کا صرف دوگنا قومی خزانہ سے استحصال کیا ہے تو یہ قطعاً بے جا نہ ہوگا۔ کیونکہ مشاہدات اس سے کچھ زیادہ ہی کی تصدیق کریں گے۔ تو اس صورت میں قومی خزانہ پر تقریباً ایک ارب ۸۰ کروڑ روپے کا مزید بوجھ پڑجاتا ہے۔ جو فی الحقیقت عوام کا استحصال ہوتا ہے۔

۶۔ ممبران کے الاؤنس اور تنخواہیں صوبائی اسمبلی کے ممبران کی ماہوار تنخواہ تو ایک ہزار روپیہ ہے۔ لیکن ان کے مختلف قسم کے الاؤنس اور دورانِ اجلاس زائد بھتے بھی تنخواہ کے لگ بھگ بن جاتے ہیں۔ جبکہ قومی اسمبلی کے ممبران کی تنخواہ ڈیڑھ ہزار روپیہ ماہوار اور اسی نسبت سے ان کے الاؤنس بھی زیادہ ہیں۔ اگر ہم صوبائی، قومی اسمبلی اور سینٹ کے جملہ ممبران کا قومی خزانہ پر بار اوسطاً اڑھائی ہزار روپیہ ماہوار فرض کریں تو ۷۴۳ ممبران کا ایک ماہ کا خرچ ۱۸ لاکھ ۷ ہزار ۵ سو۔ اور پانچ سال کا خرچ ۱۰ کروڑ ۸۴ لاکھ پچاس ہزار روپے بنتا ہے۔

اب آپ قومی خزانہ پر بے پناہ اخراجات کو سامنے لائیے۔ ابتدائی مصارف ۷ کروڑ ممبروں کی خُرد بُرد قومی خزانہ سے محض غصب وغبن کی صورت میں نہایت محتاط اندازے کے مطابق ایک ارب ۳۰ کروڑ، ممبران کے اخراجات گیارہ کروڑ گویا موجودہ طرزِ حکومت میں الیکشن کے ایک پیریڈ میں قومی خزانہ کو تقریباً ایک ارب ۴۸ کروڑ روپے کے مصارف برداشت کرنا پڑتے ہیں۔ اور نجی اخراجات ونقصانات کا اندازہ اس سے تین گنا ہے۔

ظاہر ہے کہ انتخابات پر یہ خطیر مصارف دولت مند ممالک تو برداشت کر سکتے ہیں۔ لیکن پاکستان جیسے ترقی پذیر غریب ملک کی معیشت کو اور بھی ابتر بنا دیتے ہیں۔ اور ان کثیر مصارف کے عوض قوم کو بداخلاقی، معاشرتی انتشار وعداوت کے تحفے ملتے ہیں اور انسانی سوچ کے ذریعے قوانین سازی سے عوام کے مسائل جلد حل ہونے کے بجائے پیچیدہ ہوتے چلے جاتے ہیں، جن کو سلجھانے کے لیے آئے دن ترامیم کی ضرورت پیش آتی رہتی ہے۔

۴۔ مغربی جمہوریت اور سیاسی استحکام

۱۔ قانون کی ناپائیداری جو پارٹی برسرِ اقتدار آتی ہے۔ وہ اپنی اکثریت کی بناء پر ایسے قانون منظور کرانے میں کامیاب ہو جاتی ہے، جنھیں وہ پسند کرتی ہے۔ اس نظام میں آئے دن وزارتیں اور حکومتیں بدلتی رہتی ہیں۔ لہٰذا آئندہ الیکشن میں کامیاب ہونے والی پارٹی جو اپنے کچھ مخصوص مفادات کا خیال رکھتی ہے۔ وہ پہلے قوانین کو منسوخ کرتی ہے اور اپنی پسند اور ضرورت کے مطابق قانون بناتی ہے۔ اس

طرح ایک جمہوری نظام میں اور خصوصاً پارلیمانی نظام میں یہ سلسلہ مسلسل چلتا رہتا ہے جس کا قوم اور ملک پر ناگوار اثر پڑتا ہے۔

۲۔اعلیٰ سطح پر سیاسی تفرقہ بازی اسمبلی پر دراصل اکثریتی پارٹی کا مکمل قبضہ ہوتا ہے۔ لہٰذا حکومت کے بیشتر فیصلے عوام کی فلاح و بہبود کے لیے نہیں بلکہ اپنی پارٹی کی خوشنودی کے لیے کروائے جاتے ہیں اور ایسے طریق اختیار کیے جاتے ہیں جن سے حکمران پارٹی زیادہ سے زیادہ مضبوط ہو اور آئندہ الیکشن میں کامیاب ہو سکے۔ وہ کچھ ایسے قوانین بھی بناتی ہے جن سے دوسری حریف پارٹیوں کو کمزور یا انہیں پابند کیا جا سکے۔ یہی چیز سیاسی پارٹیوں کے مابین منافرت اور دشمنی کے بیج بوتی ہے جو بالآخر حکمران پارٹی کے حق میں کسی وقت بھی بلائے ناگہانی ثابت ہو سکتی ہے۔ اب نئی حکمران پارٹی پہلی پارٹی سے انتقام لیتی ہے اس طرح جہاں قومی وحدت انتشار کا شکار ہو جاتی ہے وہاں ایسے حالات میں کبھی ایک مضبوط اور مستحکم حکومت قائم نہیں ہو سکتی۔

۳۔آزادیٔ رائے تیسری چیز جو ہمارے ملکی استحکام کی بنیادیں کھوکھلی کر رہی ہے وہ اس جمہوری دور میں "آزادی رائے" کی کھلی چھٹی ہے۔ جس کے متعلق ہم صفحاتِ سابقہ میں بہت کچھ لکھ چکے ہیں۔ البتہ صحافی لوگ اگر چاہتے تو صرف پاکستان کیا سارے عالمِ اسلام کو متحد اور مربوط بنا سکتے تھے۔ لیکن برا ہو اس پارٹی سسٹم کا جس میں یہ لوگ محض اپنی پارٹی کے مخصوص نظریات کے ترجمان بن کر رہ گئے ہیں۔ صحافت حقیقتاً ایک کاروبار نہیں بلکہ وہ ایک شہادت اور دل و ضمیر کی آواز ہے جسے اس سیاست کے میدان میں کوڑیوں کے مول خریدا جا رہا ہے اور ملک بھر میں کشیدگی اور انتشار کی فضا قائم ہو گئی ہے۔ اگر ان پر پابندی لگائی جائے تو جمہوریت کے تقاضے مجروح ہوتے ہیں اور اگر حکومت کو ایسا اقدام کرنا ہی پڑے تو زیر زمین تحریکیں شروع ہو جاتی ہیں جو بالآخر قوم کے حق میں تباہی کا موجب بنتی ہیں۔

۴۔سیاسی دکانیں سیاسی لیڈر عوام میں مقبولیت حاصل کرنے کے لیے نہایت مکروہ اور خطرناک ہتھکنڈے استعمال کرتے ہیں جن کی وجہ سے ملکی استحکام کو سخت دھچکا لگتا ہے۔ عموماً یہ تاثر دیا جاتا ہے کہ ہمارے علاقے یا صوبے کا مرکز کی طرف سے حق غصب کیا جا رہا ہے۔ اور ہمارا استحصال کیا جا رہا ہے۔ اس طرح علاقائی اور صوبائی عصبیت کو ہوا دے کر یہ مکروہ دھندا رچایا جاتا ہے جس سے آپس میں نفرت اور تشتت و انتشار کے بیج پرورش پاتے ہیں۔ اس طرح ان نبرد آزماؤں کی دکانیں تو چمک جاتی ہیں مگر ملی وحدت پارہ پارہ ہو جاتی ہے۔

موجودہ دور میں سیاست محض ایک کاروبار بن کر رہ گیا ہے۔ اگر کوئی لیڈر اقتدار سے

محروم ہو جاتا ہے تو وہ نچلا بیٹھنا گوارا نہیں کرتا اور تا حیات سیاست سے چمٹا رہتا ہے۔ کبھی اسے عوام کی غربت بے چین کرتی ہے۔ کبھی گرانی کا رونا روتا ہے، کبھی عوامی مسائل اور انتخابات کا تذکرہ کرتا ہے۔ اپنے دورِ اقتدار میں جن مسائل سے آنکھیں بند کر رکھی تھیں۔ اب وہی مسائل اُسے بے قرار کرنے لگتے ہیں۔ اُن پرانے شکاریوں کو صرف نئے جال کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ نئے نئے طریقوں سے اپنی لیڈر شپ کی راہیں ہموار کرنے میں مصروف رہتے ہیں جس سے مطمئن عوام میں ہر وقت اضطراب کی فضا طاری رہتی ہے۔

۵۔ بیرونی خطرات اِن باتوں کے علاوہ پانچویں بات جو ملکی استحکام کے لیے سب سے زیادہ نقصان دہ ہے وہ یہ کہ اس جمہوریت کی راہ سے غیر ملکی اور ملحدانہ نظریات فروغ پاتے ہیں اور بیرونی حکومتیں تمام ترقی پذیر ممالک میں اثر و نفوذ حاصل کرتی ہیں۔ اسی ذریعہ سے حکومتوں کے تختے اُلٹے جاتے اور انقلاب برپا کیے جاتے ہیں۔ ترقی پذیر ممالک میں عموماً اور بلادِ اسلامیہ میں خصوصاً آئے دن انقلاب، انتشار اور جنگ و جدال کا ایک بڑا سبب یہی جمہوری طرزِ عمل ہے اور اسی ذریعہ سے ۱۹۷۱ء کو پاکستان دو لخت کر دیا گیا تھا۔

ترقی پذیر ممالک کی بنیادی کمزوری یہ ہے کہ مالی وسائل کی کمی کے باوجود وہ مغرب کی اندھی تقلید کر کے تعیشانہ طرزِ زندگی اپنا گئے جا رہے ہیں۔ اور جب اپنے ملکی وسائل سے کام نہیں چلتا تو کاسۂ گدائی لے کر امریکہ بہادر یا دوسرے ترقی یافتہ ممالک سے امداد کی بھیک مانگنے کے لیے نکل کھڑے ہوتے ہیں۔ اب اُونچی سرکار صرف اس شرط پر امداد منظور فرماتی ہے کہ وہاں جمہوری پارلیمانی نظام کارفرما ہو تاکہ وہ اپنے من پسند افراد آگے لا سکے۔ اگر عالی سرکار کو کسی وقت یہ شبہ گزر جائے کہ اس کی وفاداری میں کوتاہی برتی جا رہی ہے یا اس کے مفادات کا پورا پورا تحفظ نہیں ہو رہا تو بس سمجھ لیجئے کہ اس حکومت کے دن گنے جا چکے۔ اِدھر عالی سرکار کے تیور بدلے۔ اُدھر چشم زدن میں اس ملک میں کچھ کا کچھ ہو جاتا ہے۔ گویا جمہوری نظام اور مالی امداد ایسے پھندے ہیں جن کی بنا پر عالی سرکار ترقی پذیر ممالک کو ہر وقت اپنے پنجۂ استبداد میں جکڑے رکھتی ہے۔

مغربی جمہوریت کے مزعومہ فوائد اور اُن کا جائزہ

اِس طرزِ حکومت کے درج ذیل فوائد بیان کیے جاتے ہیں۔

۱۔ جمہوریت کا نظام مساوات کے اصول پر قائم ہے۔ ہر شخص یکساں طور پر

سیاسی حقوق کا مالک اور نظامِ حکومت میں حصہ لے سکتا ہے۔ حکومت پر کسی خاص طبقہ کی اجارہ داری نہیں ہوتی۔

۲ ۔ اس نظام میں چونکہ حزبِ اختلاف کا وجود ضروری ہے جو حکمران پارٹی کی غلط روی یا غلط پالیسیوں پر تنقید کرتی اور اُسے راہ راست پر لانے کا سبب بنتی ہے۔

۳ ۔ اِس نظام میں عوام کو اظہار خیال یعنی تقریر و تحریر کی آزادی کا حق حاصل ہوتا ہے، لہٰذا وہ بھی حکومت کی غلط روی پر نکتہ چینی کر کے اُسے راہِ راست پر رکھنے کا موجب بنتے ہیں۔

۴ ۔ یہ طرزِ حکومت انتقالِ اقتدار کا پُرامن ذریعہ ہے۔ اگر حکمران پارٹی اپنے اقتدار کے دوران ملک و قوم کی صحیح خدمت نہیں کر سکی تو اُسے آئندہ انتخاب میں بآسانی اقتدار سے علیحدہ کیا جا سکتا ہے۔

۵ ۔ چونکہ عوام اپنے نمائندے خود منتخب کرتے ہیں لہٰذا یہ عوامی مسائل کے حل کا بہترین ذریعہ ہے۔

اب دیکھیئے جہاں تک پہلے تین فوائد کا تعلق ہے۔ اُن پر ہم بھرپور تبصرہ کر چکے ہیں۔ چوتھے فائدے یعنی پُرامن ذریعہ انتقالِ اقتدار کے جائزے کے لیے ایک دفعہ پھر "انتخابات اور اخلاقی اقدار کے عنوان کے تحت ذیلی عنوان" الیکشن کے دوران گھناؤنے جرائم" دیکھ لیجیے۔ البتہ یہ مسئلہ کہ عوامی مسائل عوامی حکومت ہی حل کر سکتی ہے کچھ مزید وضاحت کا محتاج ہے۔

عوامی مسائل کا حل

پاکستان کی تاریخ میں سابقہ حکمران پارٹی یعنی بھٹو کا دَور ایسا دور ہے جسے مخالف و موافق سب عوام کا نمائندہ دَور تسلیم کرتے ہیں جس میں اسمبلیاں بہت حد تک آزادانہ اور منصفانہ انتخابات کے نتیجہ میں قائم ہوئی تھیں۔ لیکن ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ عوام کی مشکلات اور لاینحل مسائل کے لحاظ سے یہ بدترین دَور ثابت ہوا۔ گرانی کا یہ عالم کہ جتنی پہلے پچیس سال میں قیمتیں چڑھیں۔ اس سے بھی نسبتاً زیادہ اس پانچ یا سات سالہ دَور میں چڑھ گئیں۔ غنڈہ گردی کا یہ عالم کہ شریف لوگ گھروں کے دروازے بند کرنے پر مجبور ہو گئے۔ دن دہاڑے دکانیں، بینک، ٹرک حتیٰ کہ مسافر گاڑیاں تک لٹتی رہیں۔ اور ڈاکوؤں کا سراغ مشکل ہی سے کبھی ملتا تھا۔ ایسے واقعات میں پولیس خود ملوث تھی۔ اور رسہ گیری کے فرائض انجام دیتی تھی۔ رشوت کا

یہ عالم کہ سرکاری دفاتر دراصل رشوت کے کاروباری ادارے بن کر رہ گئے ۔ عدالتی کارروائی کا یہ حال کہ مقدمہ بازی ایک فن کی شکل اختیار کر گئی جس میں ہمیشہ غریب اور مظلوم ہی پٹتا تھا۔ فحاشی اور عریانی کو جو فروغ اس دور میں نصیب ہوا اس کی مثال نہیں ملتی۔

علاوہ ازیں حکمران پارٹی کی ایک مخصوص پالیسی تھی، جس نے کسان کو زمیندار سے گتھم گتھا کر دیا مزدوروں کو مالک سے بھڑا دیا ۔کرایہ دار کو مالک مکان پر سوار کر دیا۔ اور شاگرد اُستادوں کے سر کو آنے لگے۔ اس پالیسی سے ہر میدان میں منفی نتائج برآمد ہوئے۔ مزدور کام چور اور خود سر بن گیا۔ جس سے مُلکی صنعت تباہ ہوگئی۔ مزارعہ مالک بن بیٹھا تو قتل و غارت کی وارداتیں بڑھ گئیں۔ اور ملک خوراک میں (حسب پروگرام حکمران پارٹی) کبھی خود کفیل نہ ہوسکا۔ اُستاد کی شفقت اور شاگردوں کا احترام ختم ہوا تو تعلیم جیسا مقدس پیشہ کاروباری شکل اختیار کر گیا۔ ٹیوشنوں کا کاروبار شروع ہوا اور امتحانات میں کامیابی کے لیے نقل اور رشوت عام ہوئی۔ دوسری طرف طالب علموں اور ٹرانسپورٹروں میں مسلسل تنازعات شروع ہوگئے۔کرایہ دار مالک مکان سے خطیر رقم لے کر مکان خالی کرتا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ رہائش کا مسئلہ پہلے سے کئی گنا زیادہ سنگین صورت اختیار کر گیا۔ اور جب کبھی حزب اختلاف نے حکومت کی پالیسیوں پر نکتہ چینی کی تو اکثریت اور اختیار کے بل پر اُسے ذلیل و خوار کیا گیا۔ تو کیا ان مشاہدات کے بعد بھی اس دعویٰ کی کوئی حقیقت باقی رہ جاتی ہے کہ عوامی حکومت ہی عوامی مسائل کا حل کر سکتی ہے۔

اور آج جو ہمارے لیڈر آئے دن بیانات جاری کرتے رہتے ہیں کہ عوامی مسائل منتخب حکومت ہی حل کر سکتی ہے۔ کیا انھیں بھٹو دور کا تجربہ بھول چکا ہے؟ اور ہم یہ بات پورے وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ ان لیڈروں کو عوامی مسائل کے حل کی فکر نہیں ہے بلکہ اگر فکر ہے تو محض اپنی کرسی کی۔ عوام کی تکالیف کا دَم بھر کر وہ اپنے دل کا غبار نکالتے ہیں اور بیان یوں دیتے ہیں کہ گویا ان میں سے ہر ایک کے پاس الہ دین کا چراغ ہے۔ بس انکے برسر اقتدار آنے کی دیر ہے کہ یہ مسائل خود بخود حل ہوتے چلے جائیں گے ۔

حکومت کا منافقانہ کردار

الیکشن کے ایام میں الیکشن کمشنر کی طرف سے تقریباً ہر معروف روزنامے میں بڑے جلی الفاظ میں اس مضمون کے اشتہار شائع ہوتے ہیں کہ ووٹ ایک مقدس امانت ہے اسے نہایت دیانتداری سے استعمال کیجیے۔ اور ووٹ ڈالنے کا جو طریق کار وضع کیا جاتا ہے۔ بظاہر

اس سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ اب بد دیانتی اور دھاندلی کا کوئی امکان باقی نہیں رہا۔ لیکن درونِ خانہ حکومت کے ایوانوں میں جو کچھ ہوتا ہے وہ جناب قدرت اللہ شہاب کی زبانی ملاحظہ فرمائیے۔ یہ آپ کی ان دنوں کی ڈائری ہے کہ جب آپ ۱۹۵۲ء میں ضلع جھنگ میں بطور ڈپٹی کمشنر کام کرتے تھے۔ (بشکریہ ماخوذ از شہاب نامہ از ص ۴۷۱ تا ۴۷۷)

مہینہ بھر سے سارے صوبے میں تبادلوں کا ہیضہ سا پھوٹ پڑا تھا۔ ڈپٹی کمشنروں کے تبادلے ہو رہے تھے۔ تحصیلداروں اور تھانیداروں کی تبدیلیاں زوروں پر تھیں اور سیاست کی بساط پر افسروں اور اہلکاروں کے مہرے بڑی چابکدستی سے سجائے جا رہے تھے کیونکہ الیکشن کی شطرنج شروع ہونے والی تھی اور اس کھیل پر وزیروں اور وزارتوں نے سر دھڑ کی بازی لگا رکھی تھی۔

اُسی زمانے میں "زیادہ اناج اگاؤ" کی مہم بھی اپنے جوبن پر تھی اور افزائش غلّہ کے سلسلے میں کمشنروں، ڈپٹی کمشنروں، پولیس کپتانوں اور محکمہ مال، محکمہ زراعت، محکمہ جنگلات اور محکمہ سول سپلائی کے جملہ افسروں کی ایک اعلیٰ سطح کی کانفرنس صوبائی دارالحکومت میں طلب کی گئی۔

فضیلت مآب چیف منسٹر اور جملہ عزت مآب منسٹر صاحبان نے خاص طور پر اس کانفرنس کو اپنے قدوم میمنت لزوم سے سرفراز کیا۔

چیف منسٹر نے اناج کی فضیلت اور کیمیائی کھاد کی برکتوں پر ایک برجستہ تقریر کی، جو وہ لکھوا کر لائے ہوئے تھے۔

اس کے بعد انہوں نے اخلاقیات پر کچھ کلماتِ خیر فی البدیہہ وعظ فرمائے اور بر سبیلِ تذکرہ الیکشن کے دوران سرکاری ملازموں کو شدید طور پر غیر جانبدار اور بلند کردار رہنے کی تلقین کی۔

"حضرات"، چیف منسٹر نے مربیانہ سرپرستی کے انداز میں سنجیدگی سے کھنکار کر کہا۔ "یہ الیکشن آپ کی ایفی شنسی کی آزمائش ہے۔ اگر آپ نے اپنے فرائض بعنوانِ شائستہ انجام دیئے تو سمجھئے آپ کامران ہیں"۔

"ورنہ"، چیف منسٹر کے چہرے پر رموزِ سلطنت کی خشونتگی نمودار ہوئی۔ "ورنہ حکومت اپنا فرض پورا کرنے میں تساہل نہ کرے گی۔ اگرچہ وہ کتنا تلخ ہی کیوں نہ ہوں"۔

فرائض منصبی کی اس تلخ گتھی کو وزیر صاحبان کے ناخنِ تدبیر نے کھول کر رکھ دیا۔ جب "زیادہ اناج اُگاؤ" کی کانفرنس اپنا اہم ایجنڈا پورا کر چکی، تو ہر عزت مآب وزیر اپنے اپنے علاقے کے ڈپٹی کمشنر کے کندھے پر دستِ شفقت رکھ کے الگ لے گیا اور اس کے حوالے ایک بنی بنائی

فہرست کردی جس میں تفصیلاً تفصیلاً یہ درج تھا کہ کون سے علاقے سے کونسا اُمیدوار عوام کا حق نمائندگی پوری طرح ادا کرنے کا اہل ہے اور کون کون سے اُمیدوار کو ہر قیمت پر ناکام کرنا باعثِ ثواب ثابت ہوگا۔

ڈپٹی کمشنر صاحبان نے دل وجان سے کاغذ کے بنے ہوئے یہ "جھرلو" اپنی جیب میں ڈال لئے۔ عام زندگی میں "جھرلو" گھمانا مداریوں کا کسب ہے۔ جادو کی یہ چھڑی گھما کر مداری خالی تھیلے سے زندہ کبوتر اور بند ٹوکروں سے آم لگے ہوئے پیڑ برآمد کرتے ہیں لیکن جب یہ "جھرلو" الیکشن کے موقعہ پر ڈپٹی کمشنر کے اشارے پر گھومتا ہے تو عوام کی ہتھیلیوں پر سرسوں کے کھیت جم جاتے ہیں۔ پولیس کی حفاظت میں مقفل تہہ خانوں کے کواڑ "کھل جا سم سم" کے جادو سے وا ہو جاتے ہیں۔ لوہے کی سربمہر صندوقچیاں ٹوٹ جاتی ہیں اور نااہل اُمیدواروں کے نام پڑے ہوئے ووٹ تناسخ ارواح کے اُصول پر لائق و فائق اُمیدواروں کے بکسوں میں منتقل ہو جاتے ہیں۔ یہی "جھرلو" ووٹوں کی جعلی پرچیاں بنوا دیتا ہے۔ اسی "جھرلو" کے فیض سے ووٹوں کی تعداد ووٹروں کی تعداد سے کئی گنا بڑھ جاتی ہے اور یہ اسی "جھرلو" کی برکات کا نزول ہے کہ افسروں کی ترقیاں ہوتی ہیں، اُن کے تبادلے رُکتے ہیں اور ان کے عزیزوں، رشتہ داروں اور طفیلیوں کو نوکریاں اور امپورٹ پرمٹ ملتے ہیں ......

الیکشن کا کاروبار بلیک مارکٹ سے زیادہ وسیع اور دستِ غیب سے زیادہ طلسماتی ہے۔ دو ڈھائی لاکھ کی آبادی میں سے صرف ایک مائی کا لال منتخب ہوتا ہے۔ بے زبان کاشت کاروں، مزارعوں، مزدوروں کی یہ آبادی سینکڑوں مربع میل کے رقبے میں پھیلی ہوئی ہے۔ یہاں نہ زیادہ ریڈیو ہیں، نہ اخبار پڑھے جاتے ہیں اور یوں بھی آمد و رفت کے وسائل بیل گاڑیوں، چھکڑوں اور مسافروں سے اٹا اٹ بھری ہوئی اِکا دُکا بسوں سے آگے نہیں بڑھے۔ چنانچہ ایک عام، سیدھا سادا امن پسند دیہاتی شادی، غمی اور دیگر بلاہائے ناگہانی کی مجبوریوں کے علاوہ یونہی خواہ مخواہ سفر وسیلۂ ظفر کی صعوبتوں کو برداشت کرنے کا عادی نہیں ہوتا۔ عوام جو گاؤں گاؤں، قریہ قریہ بکھرے ہوئے ہیں اپنے ذاتی ماحول، اپنے آس پاس کے چند ہمسایوں اور اپنے دُکھ درد کے ساتھیوں کے علاوہ باقی دُنیا سے نہ تو شناسا ہیں اور نہ اس قسم کی شناسائی پیدا کرنے کے وسائل ان کو میسر ہیں۔ دو ڈھائی لاکھ گدڑیوں میں چھپا ہوا ایک لعل ڈھونڈ نکالنا جو انکی نمائندگی کا حق ادا کر سکے ہرگز ہرگز اُن کے بس کا روگ نہیں ہے۔

چنانچہ عوام کے نمائندوں کا چناؤ اکثر، پشاور، حیدر آباد، کراچی اور ڈھاکہ کے شہروں میں بیٹھ کر ہوتا ہے۔ سیاسی پارٹیوں کے دفاتر، اسمبلی ہالوں، حکومت کے ایوانوں میں پس پردہ سودا ہوتا ہے۔ ٹکٹ دینے اور ٹکٹ حاصل کرنے پر تن، من، دھن کی بازیاں لگتی ہیں۔ قرآن شریف کے صفحوں پر وفاداری کے حلف نامے تحریر ہوتے ہیں۔ پُرانی دشمنیاں موقوف، نئی دشمنیاں شروع ہوتی ہیں۔ امپورٹ ایکسپورٹ کے پرمٹوں کا بازار گرم ہوتا ہے نئے ٹرکوں اور نئی بسوں کے رُوٹ پرمٹ جاری ہوتے ہیں۔ عدالتوں میں چلتے ہوئے سنگین مقدمات داخل دفتر ہوجاتے ہیں نئے الزامات اور نئے مقدموں کی مسلیں کُھل جاتی ہیں۔ ڈپٹی کمشنروں، پولیس کپتانوں، مال افسروں، مجسٹریٹوں، تحصیلداروں، تھانیداروں، گرداوروں، پٹواریوں، نمبرداروں، زمینداروں، گماشتوں، صنعت کاروں، بڑے بڑے تاجروں کے زیر سایہ الیکشن کے "جھُرلو" بڑی سرعت سے چلنے لگتے ہیں اور ووٹروں کو بھیڑ بکریوں کی طرح ہانک ہانک کر پیدل یا چھکڑوں میں یا ٹرکوں میں لاد لاد کر پولنگ بُوتھ پہنچا دیا جاتا ہے تاکہ آزاد مملکت کے آزاد شہری اپنا جمہوری حق ادا کرنے کے لئے کاغذ کی پرچیاں اُس صندوقچی میں ڈال آئیں جس پر لاہور، پشاور، حیدرآباد، کراچی یا ڈھاکہ کی خوشنودی کی مہر پہلے ہی ثبت ہوچکی ہے۔

اگر ماحول سازگار ہے تو پرچیاں ڈالنے کے فوراً بعد جملہ ووٹروں کو آزاد کر کے بے یار و مددگار چھوڑ دیا جاتا ہے کہ جس طرح اور جس طرف اُن کے سینگ سمائیں وہ بڑی خوشی سے تشریف لے جاسکتے ہیں ورنہ اگر مقابلہ سخت ہے تو ووٹروں کو ایک وقت کا کھانا اور ان کے سربراہوں کو نقد نذرانہ دے کر بصد عزت و احترام رخصت کر دیا جاتا ہے۔

جمہوریت کے اس مضحکہ خیز ڈھونگ میں بعض ووٹروں کو اکثر اتنا بھی معلوم نہیں ہوتا کہ جس کے حق میں اس نے اپنی پرچی ڈالی ہے، وہ انسان ہے یا تار کا کھمبا!

جب پاکستان بن رہا تھا تو کانگرس کے مقابلہ میں جنگِ آزادی کو فروغ دینے کے لئے قائدِ اعظم نے اپیل کی تھی کہ ہر مسلمان صرف اس کو ووٹ دے جس پر مسلم لیگ کا لیبل لگا ہوا ہو۔ خواہ وہ بجلی کے تار کا کھمبا ہی کیوں نہ ہو۔

مُسلمان عوام نے اپنے محبوب رہنما کا ارشاد سر آنکھوں پر لیا اور چُن چُن کر ایسے تار کے کھمبوں کو جی بھر کے ووٹ دیئے کہ پاکستان بن بھی گیا، حکومت چل بھی پڑی، حالات معمول پر آ بھی گئے لیکن یہ تار کے کھمبے بدستور اپنی اپنی جگہ ایستادہ رہے۔ زمیں جنبد نہ جنبد گل محمد۔ حتیٰ کہ

کھمبوں کے تار اُلجھ اُلجھ کر، جھنجنا جھنجنا کر ٹوٹنے لگے ۔ ۔ ۔ بجلی کے بلب فیوز ہو گئے ——— نور کی جگہ ظلمت چھانے لگی اور مارشل لاء کی رِیت وجود میں آ گئی۔

ایک علاقے کے چند کھاتے پیتے، تعلیم یافتہ نوجوانوں نے فیصلہ کیا کہ وہ آئندہ الیکشن کے موقعہ پر کسی قسم کے "جھرلو" کے دامِ فریب میں گرفتار نہ ہوں گے بلکہ رائے عامہ کو آزادانہ اور بے باکانہ طور پر اثرانداز کرنے کا جہاد کریں گے۔ اُس علاقے کے مستقل اور سند یافتہ عزت مآب وزیر نے یہ خبر سُن کر بہت واہ واہ کی۔ تعلیمی ترقی اور جمہوری بیداری کے عنوان پر بڑے خوشگوار قصیدے گائے اور اُن نوجوانوں کے نیک ارادوں پر حکومتِ وقت کی خوش سگالی کی سند چپکانے کے لئے وزیر صاحب نے اُن سب کو اپنے ہاں کھانے پر مدعو فرمایا۔ پُرتکلف دعوت اُڑی۔ ہنسی مذاق کی باتیں ہوئیں اور جب وہ نوجوان کافی کی پیالیاں لے کر آرام سے صوفوں پر بیٹھ گئے تو یکایک کمرہ بند کر کے باہر قفل لگا دیا گیا۔ ایک یا دو روز بعد جب الیکشنوں کی مہم اچھی طرح سر ہو گئی تو یہ بلند ہمت نوجوان بھی رہائی پا کر خیر سے بدھو گھر کو آئے۔

ایک مزارع کی بیوی چار بچوں، دو بیلوں، چند برتنوں اور کچھ کپڑوں کا اثاثہ سمیٹے سرِ راہ خانہ بدوشوں کی طرح بیٹھی تھی۔ اس کے خاوند نے زمیندار کی مرضی کے مطابق اپنا ووٹ ڈالنے سے انکار کر دیا تھا۔ اس جرم کی سزا میں اُسے کھڑے کھڑے زمین سے بے دخل کر دیا گیا۔ مکان چھین گیا۔ زمیندار کے گماشتے مزارع کو پکڑ کر تھانے لے گئے۔ تھانیدار نے چوری کے الزام میں اس کا پرچا کاٹا اور بیوی بچے اپنے دو بیلوں سمیت سڑک کے کنارے بیٹھ کر جمہوری راج کی برکتوں کا فیض پانے لگے۔

ایک اچھے خاصے متوسط درجہ کے خاندان کا سربراہ اچانک لاپتہ ہو گیا۔ الیکشن کے سلسلے میں وہ کچھ ناپسندیدہ قسم کی اکڑفوں دکھا رہا تھا۔ اس کے بیٹے نے درخواست دی کہ الیکشن کے روز میرے باپ کو مخالف پارٹی نے اُٹھا کر نہر میں پھینک دیا تھا۔ اب تک اس کا کوئی سراغ نہیں مِلا۔ درخواست پر تفتیش کا حکم جاری ہوا۔ رپورٹ آئی "مسمّی مذکور عرصہ سے مفقود ہے۔ پسرِ مسمّی مذکور کا الزام بے بنیاد ہے۔ چنانچہ پسرِ مذکور کو زیرِ جرم قانون دروغ گوئی ماخوذ کیا جائے۔ چالان زیرِ تکمیل ہے۔ درخواست ہذا داخل دفتر ہو۔"

ایک دُور اُفتادہ قصبے میں ایک مولوی صاحب تھے۔ پاکیزہ صورت، پاکیزہ سیرت، علم و فضل سے بہرہ مند، خدمتِ خلق کے جذبے سے سرشار، ضعیفی اور نحیفی میں بھی جوانوں سے زیادہ ہمت اور عزم کے

مالک۔ انہوں نے ایک دارالعلوم اور ایک ہائی سکول بھی قائم کر رکھا تھا۔ بچوں سے کوئی فیس نہ لی جاتی تھی۔ کتابیں بھی سکول کی طرف سے مفت تقسیم ہوتی تھیں۔ اس علاقے کی بیشتر آبادی مولوی صاحب کی قائل اور ان کی بزرگی کی عقیدت مند تھی۔ غریب سے غریب کسان بھی فصل آنے پر حسبِ توفیق گندم یا کپاس یا دھان مولوی صاحب کے بیت المال میں ڈال آتا تھا، جس سے سکول بھی چلتا تھا۔ دارالعلوم بھی۔ اور یوں بھی کئی طرح سے غریب غربا کی امداد ہوتی رہتی تھی۔ اس تجربے کی کامیابی نے ہمت بڑھائی اور مولوی صاحب کو شوق ہوا کہ سکول کو وسعت دے کر کالج بنا دیا جائے اور اگر کالج بھی چل نکلے تو اس بنیاد پر ایک مکمل اسلامی یونیورسٹی کی داغ بیل ڈالی جائے۔ منصوبہ بلند و بالا تھا اور اس کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کا شوق رفتہ رفتہ جنون کی صورت اختیار کر گیا۔ مولوی صاحب کے بہت سے عقیدت مند زندگی کا گرم سرد دیکھے ہوئے تھے۔ انہوں نے رائے دی کہ ایسے عالیشان منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کے لئے ضروری ہے کہ مولوی صاحب صوبائی اسمبلی میں ممبر بن کر جائیں اور وہاں پر اپنے تعلیمی عزائم کے حق میں آواز اٹھائیں۔

مولوی صاحب گوشہ نشین بزرگ تھے۔ سیاسی ریشہ دوانیوں سے الگ تھلگ۔ اقتدار کی ہوس سے بے نیاز۔ لیکن اپنے تعلیمی منصوبوں کی تڑپ میں وہ چار و ناچار سیاست کے میدان میں اتر ہی آئے اور اگلی الیکشن میں کسی سیاسی پارٹی سے ناطہ جوڑے بغیر ایک آزاد امیدوار کی حیثیت سے کھڑے ہو گئے۔ ان کا مقصد صرف اتنا تھا کہ وہ سب سیاسی جماعتوں کے ساتھ مساوی سلوک روا رکھیں تاکہ ان کے تعلیمی پروگرام کو ان سب کی حمایت یکساں طور پر حاصل ہو سکے۔

اب علاقے میں دور دور تک مولوی صاحب کا ڈنکہ بج رہا تھا۔ لوگوں نے جوق در جوق ان کے نام ووٹ ڈالے۔ یہاں تک کہ صوبے میں جس جگہ سب سے زیادہ عورتوں نے ووٹ ڈالے وہ مولوی صاحب ہی کا حلقہ تھا۔ بہت سی عورتوں نے حسنِ عقیدت کے جوش میں "فتویٰ" صادر کر دیا تھا کہ جو مرد مولوی صاحب کو ووٹ نہ دے گا، اس کا نکاح اپنی بیوی سے فسخ ہو جائے گا! الیکشن کے روز گاؤں گاؤں کی عورتیں ٹولیاں بنا کر نکلیں اور حمد و ثنا کے گیت اور نعتیں گاتی مولوی صاحب کی صندوقچی میں اپنے ووٹوں کے علاوہ جوشِ عقیدت میں چاندی کے چھوٹے چھوٹے زیور، نقدی، نوٹ، ریشم کے دھاگے بھی ڈال آئیں۔

سیاست کی باسی کڑھی میں خدمت اور خلوص کا یہ ابال ایک نیا عجوبہ تھا۔

شام کو جب ووٹوں کی سربمہر صندوقچیاں مسلح کانسٹیبلوں کی حفاظت میں تحصیل کے خزانے میں پہنچ گئیں تو راتوں رات سیاست کا "چھُرلو" گردش میں آیا اور صبح ہوتے ہوتے قبلہ مولوی صاحب تو

اپنے حجرے میں بیٹھے کے بیٹھے رہ گئے اور ان کا وہ حریف بھاری اکثریت سے الیکشن جیت گیا، جو پچھلے کئی سال سے اسمبلی کی اس موروثی نشست کا جانشین بنا بیٹھا تھا جس کے سر پر سرکار کی خوشنودی کا سایہ اور ہاتھ میں ایک منظم سیاسی پارٹی کا جھنڈا تھا اور جس کے گھر تین منکوحہ بیویوں کے علاوہ بہت سے کتے اور کئی دوسری طرح کے لوازمات بھی موجود تھے۔

یہ ہے مغربی جمہوریت اور اس کے برگ وبار کا مختصر خاکہ جس کا ہر آدمی اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کر رہا ہے اور وجدانی طور پر ہر سنجیدہ ذہن اس طرزِ عمل سے بیزار ہے، لیکن اس جمہوریت کی آہنی گرفت نے دماغ کو یوں ماؤف کر رکھا ہے کہ کوئی اس کے خلاف آواز بلند کرنے کی جرأت نہیں کرتا۔ اور اپنوں یا بیگانوں کی ملامت کا نشانہ نہیں بننا چاہتا۔ یا پھر سیاسی مقاصد کے حصول کی خاطر خاموشی اختیار کیے ہوتے ہیں۔

۲۔ کیا جمہوریت کو مشرف بہ اسلام کیا جا سکتا ہے؟

اس سوال کا اجمالی جواب تو یہ ہے کہ جمہوریت میں یہ لازمی امر ہے کہ مقتدرِ اعلیٰ کوئی انسان ہو یا انسانوں پر مشتمل ادارہ۔ انسان سے ماوراء کسی ہستی کو مقتدرِ اعلیٰ تسلیم نہیں کیا جا سکتا جب کہ اسلامی نقطۂ نظر سے مقتدرِ اعلیٰ کوئی انسان ہو ہی نہیں سکتا[1] بلکہ مقتدرِ اعلیٰ صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ یہی وہ بنیادی فرق ہے جس کی بنا پر ہم دعویٰ سے کہہ سکتے ہیں کہ موجودہ جمہوریت سے اسلام کبھی سربلند نہیں ہو سکتا ؎

ترا اے دل امیدِ غمگساری ہا ز افرنگ است　　　دل شاہین نہ لرزد بہر آں مرغے کہ در چنگ است

گویا بحث یہاں پر ہی ختم ہو جانی چاہیئے تاہم چونکہ ہمارے دستور میں یہ الفاظ شامل کر دیے گئے ہیں کہ "مقتدرِ اعلیٰ اللہ تعالیٰ ہے" اس لیے ہم اس بات کا ذرا تفصیل سے جائزہ لینا چاہتے ہیں کہ آیا ایسا ہونا ممکن ہے بھی یا نہیں؟

فرانس کے منشور آزادی ــــ جسے موجودہ جمہوریت کی روح سمجھا جاتا ہے ــــ کو تیار کرنے والے وہ لوگ تھے جو ایک طرف تو کلیسا کے مظالم اور ٹیکسوں سے تنگ تھے اور دوسری طرف بادشاہ کے استبداد اور اس کے ٹیکسوں سے۔ لہٰذا وہ مذہب سے بھی ایسے ہی بیزار تھے جیسے کہ بادشاہ اور اس کی استبدادی حکومت سے۔ اس منشور آزادی میں ان کی مذہب سے بیزاری اور بادشاہت سے دشمنی یہ دونوں باتیں واضح طور پر پائی جاتی ہیں۔ چنانچہ منشور میں جہاں مختلف قسم کی پانچ مساوات کا ذکر کیا گیا ہے۔ ان میں سیاسی مساوات اور جنسی مساوات اس قسم کی ہیں۔ جن کا جواز غالباً انجیل سے بھی ثابت نہیں کیا جا سکتا۔ اور کتاب وسنّت میں تو انھیں غلط ثابت کرنے کے لیے اتنی نصوص مل سکتی ہیں کہ ان سے ایک الگ مجموعہ تیار کیا جا سکتا ہے۔

مندرجہ بالا دونوں قسم کی مساوات دراصل ایک ہی اصل "حق بالغ رائے دہی" کی فروع

---

[1] تعارف مدنیت ص۱۰۶۔ پروفیسر محمد امین جاوید ایم اے تاریخ وسیاسیات۔

ہیں اور یہ سیاسی حق مغربی طرزِ انتخاب کی جان اور روح رواں ہے۔

مغربی طرزِ انتخاب کا دوسرا بنیادی اصُول "کثرتِ رائے کو معیارِ حق" قرار دینا ہے۔ کثرتِ رائے حاصل کرنے کے لیے اُمیدواروں کو درخواست، تشہیر، جلسے جلوس، کنویسنگ اور ایسے ہی دوسرے ہتھکنڈے استعمال کرنا پڑتے ہیں اور کثرت رائے کے حصول کے لیے ہی مختلف سیاسی پارٹیاں وجود میں آتی ہیں جن کی ہاؤ ہوا اور غل غپاڑے سے ملک انتشار کا شکار ہوتا اور اس کا امن تباہ ہوتا ہے۔

گویا اصل مبحث یہی دو بنیادی اصول ہیں۔ حق بالغ رائے دہی کے سنجیدہ مطالعہ کے لیے انتخاب خلافتِ راشدہ کی پوری تاریخ مستند حوالوں سے درج کر دی گئی ہے۔ جس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ اسلام نہ تو ہر کس و ناکس سے رائے لینے کی ضرورت سمجھتا ہے اور نہ ہی اسے جائز سمجھتا ہے۔ پھر ہر کس و ناکس کی رائے ہم قیمت یا ہم وزن بھی نہیں ہو سکتی۔ نیز اسلام نے عورت کو ایسے اُمور سے مستثنٰی ہی رکھا ہے تاکہ بے حیائی اور فحاشی کو فروغ نہ ہو اور عائلی نظام پر بھرپور توجہ دی جا سکے۔

کثرتِ رائے پر سنجیدہ مطالعہ کے لیے مشورہ اور اس کے متعلق عہد نبوی اور خلفائے راشدین کے دَور کے اہم ترین واقعات درج کر دیے گئے ہیں۔

ان تصریحات سے واضح ہے کہ مغربی جمہوریت میں پانچ ارکان ایسے ہیں جو شرعاً ناجائز ہیں:-

۱۔ حق بالغ رائے دہی بشمول خواتین (سیاسی اور جنسی مساوات)

۲۔ ہر ایک کے ووٹ کی یکساں قیمت۔

۳۔ درخواست برائے نمائندگی اور اس کے جملہ لوازمات۔

۴۔ سیاسی پارٹیوں کا وجود۔

۵۔ کثرت رائے سے فیصلہ۔

ان ارکانِ خمسہ میں سے ایک رکن بھی حذف کر دیا جائے تو جمہوریت کی گاڑی ایک قدم بھی آگے نہیں چل سکتی۔ جب کہ اسلامی نظامِ خلافت میں ان ارکان میں سے کسی ایک کو بھی گوارا نہیں کیا جا سکتا لہٰذا یہ دونوں نظام ایک دوسرے کی ضد اور ایک دوسرے سے متصادم ہیں۔ یعنی نہ تو جمہوریت کو مشرف بہ اسلام کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی نظامِ خلافت میں جمہوریت کے مروجہ اصُول شامل کر کے اس کے سادہ، فطری اور آسان طریقِ کار کو خواہ مخواہ مکدر اور مبہم بنایا جا سکتا ہے۔ وجہ یہ ہے

کہ جمہوریت ایک لادینی نظام ہے اور اس کے علمبردار مذہب سے بیزار تھے جب کہ خلافت کی بنیاد ہی خدا، اس کے رسول اور آخرت کے تصوّر پر ہے اور اس کے اپنانے والے انتہائی متقی اور بلند اخلاق انسان تھے۔

ہمارے خیال میں جیسے دن اور رات یا اندھیرے اور روشنی میں سمجھوتہ ناممکن ہے بالکل ایسے ہی دین اور لادینی یا خلافت اور جمہوریت میں بھی مفاہمت کی بات ناممکن ہے۔ لہٰذا اگر جمہوریت کو بہرحال اختیار کرنا ہے تو اسے توحید و رسالت سے انکار کے بعد ہی اپنایا جا سکتا ہے ؎

باطل دوئی پرست ہے حق لاشریک ہے | شرکت میانۂ حق و باطل نہ کر قبول

کیا ووٹوں کے ذریعے اسلام لایا جا سکتا ہے؟

آج کے دَور میں بعض اسلامی ذہن رکھنے والے حضرات اور نیک نیتی سے اسلامی انقلاب کے داعی لیڈر جب دیکھتے ہیں کہ اقتدار پر قبضہ کیے بغیر اسلامی نظام کی ترویج ناممکن ہے تو اس کا حل انھوں نے یہ تلاش کیا ہے کہ نیک شہرت رکھنے والے اُمیدوار انتخاب کے لیے نامزد کیے جائیں۔ اور عوام میں اسلامی تعلیمات کا پرچار کر کے ایسے نیک نمائندوں کی ہر ممکن امداد پر لوگوں کو اُبھارا جائے تاآنکہ اسمبلی میں نیک لوگوں کی کثرت ہو جائے۔ موجودہ جمہوری دَور میں معاشرہ کی اصلاح اور اسلامی نظام کی ترویج کی یہی واحد صورت ہے۔

ہمیں افسوس ہے کہ ہم اس سلسلہ میں ان کی تائید نہیں کر سکتے۔ تاریخ شاہد ہے کہ ووٹوں کے ذریعہ نہ آج تک کبھی اسلام آیا ہے اور نہ آئندہ آسکتا ہے۔ اگر ایسا ہونا ممکن ہوتا تو انبیاء اس پُرامن ذریعۂ انتقالِ اقتدار کو ضرور استعمال کرتے۔

بنی نوعِ انسان کے لیے قرآن کریم اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سُنّت سے بہتر دستور ناممکن ہے اور قرآن کریم کی تبلیغ کے لیے جو اَن تھک اور جان توڑ کوششیں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائیں دوسرا کوئی نہیں کر سکتا۔ آپؐ کو جاں نثار اور مخلص پیروکاروں کی ایک جماعت بھی مہیا ہوگئی جو اسلام کے عملی نفاذ کے لیے صرف تبلیغ و اشاعت اور پروپیگنڈا پر ہی انحصار نہیں رکھتے تھے بلکہ اپنی پوری پُوری زندگیاں اسی قالب میں ڈھال لی تھیں۔ صحابہؓ کی جماعت گویا قرآنی تعلیمات کے چلتے پھرتے نمونے تھے لیکن تیرہ سال کی انتھک کوششوں کے باوجود یہ تو نہ ہو سکا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں اسلامی ریاست قائم کر لیتے۔

جب ایک بہترین دستور بھی موجود ہوا اور اس کو عملاً نافذ کرنے والی جماعت بھی مثالی کردار کی مالک ہو۔ وہ تو اسں دستور کو کثرتِ رائے کے ذریعہ نافذ کرسکی تو آج کے دَور میں یہ کیونکر ممکن ہے ؟

اسلامی نظام کی ترویج کے لیے اقتدار کی ضرورت سے انکار نہیں۔ لیکن رائے عامہ کو صرف تبلیغ کے ذریعے ہموار کرنا اور اس طرح اسلامی انقلاب برپا کرنا خیالِ خام ہے۔ اس کے لیے ہجرت، جہاد اور دوسرے ذریعے ہی اختیار کرنے پڑیں گے جیساکہ انبیاء اور مجاہدینِ اسلام کا دستور رہا ہے۔

جماعتِ اسلامی پوری نیک نیتی سے اسلامی نظام کی داعی ہے اور جب سے اس جماعت نے عملاً سیاست میں حصّہ لینا شروع کیا ہے مندرجہ بالا نظریہ کے مطابق نیک اُمیدوار کھڑے کرتی رہی ہے۔ لیکن ہر الیکشن میں ہمیشہ پٹتی ہی رہی ہے۔ ۱۹۷۰ء میں جب یحییٰ خان نے انتخابات کرائے — اور غالباً پاکستان کی پوری تاریخ میں یہی انتخابات آزادانہ اور منصفانہ ہوئے تھے — تو انتخابات سے ایک دو روز قبل تک تمام سیاسی مبصرین اور اخبارات کی یہی رائے تھی کہ پیپلز پارٹی اور جماعتِ اسلامی کا انتخابی مقابلہ برابر کی چوٹ ہے لیکن جب نتیجہ نکلا تو پیپلز پارٹی بھاری اکثریت سے جیت گئی جب کہ جماعت اسلامی کو صرف چار نشستیں مِل سکیں۔

ایسے مایوس کن نتائج کی وجہ یہی ذہنی مغالطہ تھا کہ عوام الناس کو محض وعظ و تبلیغ سے نیک بنایا جاسکتا ہے۔ جماعتِ اسلامی زیادہ سے زیادہ یہ کچھ کرسکتی تھی کہ اسمبلی کی پوری نشستوں کے لیے اتنے ہی بڑے نیک اور صالح نمائندے کھڑے کرے لیکن انھیں ووٹ دینا تو عوام کا کام ہے۔ اس مقام پر جماعت کی پوری کارکردگی بے بسی کا شکار ہو جاتی ہے۔ عوام کی اکثریت زبانی طور پر بلے شک جماعت اسلامی کو نیک اور دیانتدار اور اسلام کی داعی جماعت تصوّر کرے لیکن اسے ووٹ نہیں دے گی۔ ووٹ تو کوئی شخص صرف اس وقت دے سکتا ہے جب اپنے آپ پر اسلام کے نفاذ کو قبول کرلے۔

موجودہ طرزِ انتخاب کی تطہیر

کچھ لوگ یہ کہتے ہیں کہ نمائندے ایسے منتخب کیے جائیں جو اس کے اہل ہوں اور علاوہ ازیں ووٹ دینے کا حق بھی کتاب و سنت کے قاعدہ کے مطابق صرف صالح افراد کو ملنا چاہیئے۔ گویا متقی لوگ ہی کھڑے ہوں اور صرف صالحین کو ووٹ کا حق ہو تو اس طرح بہتر نتائج کی پوری توقع ہے۔

ہمارے خیال میں اس جمہوری دور میں ووٹر پر عملِ صالح کی پابندی لگا کر یہ نسخہ آزمانا مشکل سا نظر آتا ہے۔ جب تک کاروبارِ حکومت میں حصّہ لینے کے عوامی حق" کے ذہن کو نہ بدلا جائے تب تک ع

"تا ثریا مے رود دیوار کج"

والا معاملہ ہی رہے گا۔ کثرتِ رائے کا اصول پھر پارٹیاں پیدا کرے گا۔ جو رائے عامہ منظم کریں گی۔ وہی ہتھکنڈے وہی خرابیاں۔ اور پارلیمنٹ میں پارلیمانی اور صدارتی نظام کے جھگڑے اور کثرتِ رائے کے فیصلے۔ آخر کیا کچھ اسلامی مزاج کے خلاف برداشت کیا جا سکتا ہے۔

پھر یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ یہ طرزِ انتخاب اور مرکزی اسمبلیوں کا قیام دراصل مغربی عیاشی کی ایک شکل ہے۔ پاکستان جیسا غریب ملک اس مد پر ہر چوتھے پانچویں سال کروڑوں روپے خرچ کرنے کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ قومی دولت اور وقت کے ضیاع کا تو اندازہ لگانا ہی بہت مشکل ہے۔ قوم میں اخلاقی اور معاشرتی برائیاں جو پیدا ہوتی ہیں وہ مستزاد ہیں۔ پھر بھلا وہ کون سی خوبی ہے جس کی بنا پر ہم اسی نظام کی ترمیم شدہ شکل سے چمٹے رہنے کی کوشش جاری رکھیں۔

۴۔ موجودہ طرزِ انتخاب اور اجماعِ سکوتی

ایک اعتراض جمہوریت نوازوں کی طرف سے اکثر یہ اعتراض بھی اُٹھایا جاتا ہے کہ:

۱۔ مغربی جمہوری نظام ہمارے ملک میں تقریباً ایک صدی سے رائج ہے لیکن علماء نے اس کے عدم جواز کا آج تک فتویٰ نہیں دیا۔

۲۔ ۱۹۴۹ء میں جو قرار دادِ مقاصد منظور ہوئی۔ یہ قرار داد تقریباً ۲۲ ممتاز علمائے دین کی مشترکہ جدوجہد سے منظور ہوئی جن کے سربراہ علامہ شبیر احمد عثمانی تھے۔ اس قرار داد کی منظوری پر سب علماء مطمئن اور خوش تھے

۳۔ ۱۹۷۳ء کے آئین میں بھی ممتاز علمائے کرام مثلاً مفتی محمود، مولانا غلام غوث ہزاروی، شاہ احمد نورانی، پروفیسر غفور احمد وغیرہ موجود تھے جنھوں نے اس آئین کو صحیح اور پہلا اسلامی آئین قرار دیا۔

۴۔ بہت سے ممتاز علمائے کرام خود اس طرزِ انتخاب میں حصہ لیتے رہے ہیں۔

۵۔ ان ساری سرگرمیوں کے باوجود آج تک (یعنی ۸۰-۱۹۷۹ء تک) کسی عالمِ دین نے اس کے خلاف فتویٰ نہیں دیا لہٰذا یہ اجماع سکوتی ہے جو منجملہ ادلّہ شرعیہ ایک قابلِ حجت امر ہے۔ اب اس کے خلاف آواز اُٹھانا:

وَمَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَنُصْلِهٖ جَهَنَّمَ ۭ وَسَاۗءَتْ مَصِيْرًا۔ (۴/۱۱۵)

اور جو شخص سیدھا رستہ معلوم ہونے کے بعد پیغمبر کی مخالفت کرے اور مومنوں کے رستے کے سوا اور رستے پر چلے تو جدھر وہ چلتا ہے ہم ادھر ہی چلنے دیں گے اور (قیامت کے دن) جہنم میں داخل کریں گے اور وہ بُری جگہ ہے۔

کی رُو سے ناجائز اور جماعت مسلمین میں انتشار اور تفرقہ پیدا کرنے کے مترادف ہے۔

جواب یہاں تین باتیں قابلِ غور ہیں۔

۱۔ اجماعِ صحابہ کے حجت ہونے میں تو کسی کو کلام نہیں۔ لیکن مابعد کے ادوار کا اجماع

کا حجت ہونا بذاتِ خود مختلف فیہ مسئلہ ہے اور راجح قول یہی ہے کہ ما بعد کا اجماع امت کے لیے قابلِ حجت نہیں ہے۔

۲۔ صحابہ کا اجماع تو ثابت کیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ ان کا زمانہ بھی محدود اور علاقہ بھی محدود تھا۔ لیکن ما بعد کا اجماع ثابت کرنا ہی بہت مشکل ہے۔ جب کہ اُمت اقصائے عالم میں پھیل چکی ہے، اور علما بھی ہر جگہ موجود ہیں۔

۳۔ مسئلہ زیر بحث پر واقعی اجماع ہے یا نہیں ؟ بالخصوص ہمارے علاقہ پاکستان کے کیا سب علماء اس پر متفق ہیں ؟

ہم صرف تیسری شق پر غور کریں گے۔ اگر یہ اجماع ہی ثابت نہ ہو سکے تو باقی دو کی تفصیل و تشریح تحصیل حاصل ہو گی۔ ہم پہلے لکھ آئے ہیں کہ مغربی طرزِ انتخاب کے پانچ ارکان ہیں اور انکی بنیاد عوام کی حاکمیت ہے ان میں سے ایک بھی حذف ہو جائے تو یہ نظام چل نہیں سکتا اب دیکھئے۔

(i) عوام کی حاکمیت کے بجائے اللہ کی حاکمیت تو ایسا بنیادی مسئلہ ہے جس میں کسی دینی رہنما کو اختلاف نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ قرآن کریم میں بے شمار ایسی آیات ہیں جو اس مسئلہ میں قطعی حکم کا درجہ رکھتی ہیں۔ لہٰذا اس مسئلہ پر علماء کی تصانیف بھی ذکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ جبکہ موجودہ جمہوریت کی بنیاد ہی یہ ہے کہ مقتدرِ اعلیٰ صرف انسان ہی ہو سکتا ہے۔ انسان سے ماوراء کوئی ہستی متصور نہیں ہو سکتی [1] اللہ کی حاکمیت کا زبانی یا تحریری اقرار کچھ سود مند نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ موجودہ طرزِ انتخاب کی تشکیل ہی اس نہج پر ہوتی ہے کہ وہ خواہ مخواہ عوام کی حاکمیت تسلیم کرنے پر مجبور کر دیتی ہے لہٰذا یہ اجماع سراسر نامکمل ہے کیونکہ اس کی اصل بنیاد سے سب علماء اختلاف رکھتے ہیں۔

(ii) علامہ اقبال جنھیں سیاسی بصیرت کے لحاظ سے نظریہ پاکستان کا خالق اور دینی بصیرت کے لحاظ سے مفکرِ اسلام سمجھا جاتا ہے۔ جنھوں نے خود مغربی ملکوں میں گھوم پھر کر اس جمہوریت کا بغور مطالعہ کیا۔ انھوں نے نصف صدی پیشتر مسلمانوں کو جمہوریت کی قباحتوں سے متنبہ کر دیا تھا۔ مثلاً :۔

(ل) حق بالغ رائے دہی اور پھر "ہر ایک کے ووٹ کی یکساں قیمت" کے متعلق فرماتے ہیں۔

گریز از طرزِ جمہوری غلامِ پختہ کارے شو ۔۔۔ کہ از مغزِ دو صد خر فکرِ انسانے نمے آید

---

[1] تعارف مدنیت ص ۱۰۶ بیسواں ایڈیشن از پروفیسر محمد امین جاوید ایم اے (تاریخ سیاسیات)

یہاں دو صد خر سے مراد عوام اور پختہ کار انسان سے مُراد صاحب الرائے ہے۔
اسی مضمون کو دوسرے شعر میں اس طرح ادا کیا ہے۔

جمہوریت اک طرزِ حکومت ہے کہ جس میں بندوں کو گنا کرتے ہیں تولا نہیں کرتے

(ب) ووٹوں کی اکثریت حاصل کرنے کے لیے پارٹیاں بنانے اور الیکشن لڑنے کے متعلق فرماتے ہیں :۔

الیکشن، ممبری، کونسل، صدارت بنائے خوب آزادی کے پھندے
میاں نجار بھی چھیلے گئے ساتھ نہایت تیز ہیں یورپ کے رندے

(ج) وہ اس نظام کو بھی آمریت اور استبداد ہی کی ایک شکل قرار دیتے ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ ملوکیت میں ایک آدمی خود سر اور خود رائے ہوتا ہے۔ جمہوریت میں اکثریتی پارٹی خدا بن بیٹھتی ہے۔ باقی پارلیمنٹ اور رعایا سب اس کی محکوم و مجبور و مقہور ہوتی ہے۔ فرماتے ہیں :۔

؎ دیو استبداد، جمہوری قبا میں پائے کوب تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری
ہے وہی سازِ کہن، مغرب کا جمہوری نظام جس کے پردے میں نہیں غیر از نوائے قیصری
؎ اس سراب رنگ و بو کو گلستاں سمجھا ہے تو آہ اے ناداں قفس کو آشیاں سمجھا ہے تو
؎ تو نے کیا دیکھا نہیں مغرب کا جمہوری نظام چہرہ روشن اندروں چنگیز سے تاریک تر
؎ فرنگ آئین جمہوری نہاد است رسن از گردنِ دیوے کشاد است
؎ وائے بر دستورِ جمہور فرنگ مُردہ تر شد مردہ از صور فرنگ

حیرت تو اس بات پر ہے کہ اس قومی ہیرو کی ہر سال بڑے جوش و خروش سے برسی منائی جاتی ہے۔ مقرر حضرات علامہ اقبال کے شعروں سے اپنی تقریر کو مزین کرتے ہیں اور مصنفین اس کے شعروں کے بغیر اپنی تحریر کو مستند و مکمل نہیں سمجھتے لیکن یہ عقیدت محض رسمی اور نمائشی ہی معلوم ہوتی ہے۔

(iii) علامہ اقبال کے بعد قائدِ اعظم پاکستان کے بانی اور قومی ہیرو ہیں۔ آپ کے ارشادات کا بھی بار بار تکرار کیا جاتا ہے۔ آپ نے مسلم یونیورسٹی علیگڑھ میں ۱۰ مارچ ۱۹۴۱ء کو جو تقریر فرمائی اس کے درج ذیل اقتباس پر غور فرمائیے :۔

"میں بار بار کہہ چکا ہوں کہ جمہوری پارلیمانی نظامِ حکومت، جیسا کہ انگلستان اور بعض دوسرے مغربی ممالک میں ہے برصغیر کے لیے قطعاً غیر موزوں ہے۔" (نوائے وقت ۷۹-۶-۱۶)

(vi) مؤرخ اسلام اکبر شاہ خان نجیب آبادی نے اپنی تصنیف "تاریخ اسلام" جلد اوّل کے مقدمہ کے آخر میں (صفحہ ۳۷ تا ۴۶) ملوکیت، جمہوریت اور خلافت کے فرق کو واضح کر کے موجودہ جمہوریت کو باطل قرار دیا ہے۔

(v) اس وقت سیاسیات کے کورس کی تین کتابیں ہمارے سامنے پڑی ہیں۔ یہ کتابیں کالجوں میں طالب علموں کو پڑھائی جاتی ہیں۔ ان سب میں جمہوریت کے مقابلے نظامِ خلافت کا واضح تصور پیش کیا گیا ہے اور جمہوریت کو لادینی نظام قرار دیا گیا ہے۔

۱۔ تعارف مدنیت	پروفیسر محمد امین جاوید، ایم اے سیاسیات، تاریخ	پہلا ایڈیشن ۱۹۶۵ء تیسواں ایڈیشن ۱۹۷۸ء	صفحہ ۱۰۱ تا ۱۰۶
۲۔ کتاب شہریت	پروفیسر محمد سرور، پروفیسر محی الدین، صدر شعبہ سیاسیات	پانچواں ایڈیشن	۲۴۴ تا ۲۴۸
۳۔ اصولِ سیاسیات	پروفیسر صفدر رضا، صدر شعبہ سیاسیات	پہلا ایڈیشن ۱۹۶۵ء پانچواں ایڈیشن ۱۹۶۸ء	صفحہ ۴۴۸

(vi) مندرجہ ذیل علماء نے اپنی تصانیف میں سیاسی جماعتوں کے وجود (PARTY SYSTEM) کو ناجائز قرار دیا ہے:۔

۱۔ پولیٹیکل تھیوری	سید ابوالاعلیٰ مودودی	صفحہ ۳۷
۲۔ اسلام کا اقتصادی نظام	مولانا حفظ الرحمان سیوہاروی	" ۸۹
۳۔ پولیٹیکل تھیوری	ڈاکٹر عزیز احمد	" ۱۷
۴۔ قرآنی قوانین	غلام احمد پرویز	" ۹ نیا ایڈیشن صفحہ ۳۱ پرانا ایڈیشن
۵۔ اسلام کا نظام حکومت	مولانا حامد اللہ انصاری	" ۴۷۱
۶۔ اسلام کا سیاسی نظام	مولانا محمد اسحاق سندھیلوی	" ۱۰۶
۷۔ دستورِ اسلام	مولانا محمد ادریس کاندھلوی	" ۱۸

(vii) مندرجہ ذیل مستقل تصانیف ہیں جو مغربی طرزِ انتخاب کو باطل قرار دیتی ہیں۔

۱۔ اسلام میں خلیفہ کا انتخاب	ڈاکٹر محمد یوسف پی۔ ایچ۔ ڈی
۲۔ اسلام میں مشورہ کی اہمیت	مفتی محمد شفیع صاحب کراچی
۳۔ امیر کہاں تک شوریٰ کا پابند ہے؟	قاری محمد طیب مہتمم دارالعلوم دیوبند

۴۔ اکثریت معیارِ حق نہیں مولانا ابوالکلام آزاد

(viii) جزوی مضامین :-

۱۔ درخواست دہندگی اور عہدہ کی طلب	تفہیم القرآن	زیرآیت واجعلنا للمتقین اماما	مولانا ابوالاعلیٰ مودودی
۲۔ حق بالغ رائے دہی کا ابطال	تفہیم القرآن	زیرآیت استخلاف	مولانا ابوالاعلیٰ مودودی

ہمیں ایسی مطبوعات یا مضامین کو مزید تلاش کرنے کی ضرورت نہیں کیونکہ اس " اجماع سکوتی " کے ابطال کے لیے یہ کچھ بھی بہت کافی ہے۔

آج کل قومی بحث کے عنوان سے نوائے وقت میں جو انٹرویو یا سیاسی لیڈروں کے بیانات شائع ہورہے ہیں ان میں کئی سیاسی رہنماؤں نے مغربی جمہوریت کے قطعاً غیر اسلامی ہونے کا بیان دیا ہے۔ حالانکہ وہ خود انتخابات میں حصہ لیتے رہے ہیں۔

۱۔ مولانا معین الدین صاحب لکھوی ۲۔ رفیق احمد باجوہ

۳۔ رانا خدا داد خان ۴۔ حافظ عبدالقادر روپڑی

اور ایسے حضرات تو بہت زیادہ ہیں جو کسی سیاسی شہرت کے مالک نہیں لیکن وہ جمہوریت کے خلاف مضامین قلمبند کررہے ہیں۔ اور ایسے مضامین نوائے وقت سمیت دوسرے اخبارات میں بھی چھپ رہے ہیں۔

گویا آج سے پچاس ساٹھ سال پیشتر سے لے کر آج تک یہ آواز مسلسل سنائی دے رہی ہے کہ مغربی طرزِ انتخاب از رُوئے اسلام ناجائز ہے تو پھر اس پر اجماع سکوتی کا فتویٰ کیونکر درست ہے؟

اب رہا یہ سوال کہ علامہ شبیر احمد عثمانیؒ اور ان کے ساتھیوں نے ۱۹۴۹ء کی قراردادِ مقاصد پر اطمینان کا اظہار کیا تھا تو اس کی وجہ محض یہ ہے کہ اسلامی نظام کی طرف پیش رفت کے لیے ایک نسخہ تجویز ہوا تھا۔ یہ لوگ اس خوش فہمی میں مبتلا رہے کہ اس نسخہ کا استعمال بھی کیا جائے گا مگر جب یہ امید بر نہ آئی تو پھر ہر طرف سے آوازیں اُٹھنے لگیں۔ یہ تو واضح ہے کہ نسخہ خواہ کتنا ہی قیمتی اور شفابخش کیوں نہ ہو اگر استعمال ہی نہ کیا جائے اور اس کاغذ کے پُرزے کو سنبھال سنبھال کر رکھا جائے تو اس سے شفا کی توقع خیالِ باطل ہے۔

۱۹۷۳ء کے آئین میں جن علماء کی موجودگی کا ذکر کیا جاتا ہے۔ یہ سب ایک فریق کی حیثیت رکھتے ہیں۔ لہٰذا ان کے اطمینان کو وجہ جواز بنانا فضول ہے۔ سیاسی قائد کا اپنا مفاد اسی میں ہے کہ انتخاب کا سلسلہ چلتا رہے الا ماشاء اللہ۔

اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ جو سیاسی اور دینی رہنما جمہوری طرز انتخاب کو غیر اسلامی قرار دیتے ہیں وہ خود کیوں انتخابات میں حصہ لیتے رہے ہیں؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ لوگ برضا و رغبت الیکشن میں حصہ نہیں لیتے بلکہ بامر مجبوری انھیں یہ تلخ فریضہ سرانجام دینا پڑتا ہے تاکہ دین بیزار اور خراب عناصر کے راستہ کو بالکل آزاد نہ چھوڑ دیا جائے۔ بلکہ اس بے دینی اور بدعنوانی کے سیلِ رواں کے سامنے جہاں تک ہو سکے رکاوٹیں کھڑی کرنا چاہئیں۔ گویا ان لوگوں کا انتخاب میں حصہ لینا ایک دفاعی طریقۂ کار تھا۔ اور اھون البلیتین کے نظریہ کے پیشِ نظر انتخابات میں حصہ لینا اس لیے گوارا کر لیا گیا کہ اگر انتخاب میں حصہ نہ لیا جائے تو اس کا نقصان اس سے بھی زیادہ ہے۔

سیاست دانوں کی جمہوریت سے وابستگی کی وجوہات

مذکورہ مذہبی رہنماؤں کے علاوہ بیشتر سیاست دان ایسے ہیں جو بہر حال مغربی طرزِ انتخاب کو سینے سے لگائے رکھنا چاہتے ہیں۔ اس کی وجوہات درج ذیل ہیں۔

۱۔ حقیقت یہ ہے کہ جمہوری نظام میں حاکمیت عوام کی نہیں ہوتی بلکہ ان پیشہ ور سیاست بازوں کی ہوتی ہے جو عوام کی رائے سے ہر وقت کھیلتے اور اپنا اُلّو سیدھا کرتے رہتے ہیں۔

اس نظام میں سیاسی مقتدرِ اعلیٰ (یا طاقت کا سرچشمہ) تو عوام کو کہا جاتا ہے لیکن جب وہ اپنا اختیار نمائندوں کو بذریعہ ووٹ منتقل کر دیتے ہیں تو ان کی منتخب شدہ ممبروں کی یہ پارلیمنٹ آئینی اقتدارِ اعلیٰ بن جاتی ہے۔

عوام کی اپنی رائے کچھ نہیں ہوتی نہ ہی وہ اہل الرائے ہوتے ہیں۔ ذرائع ابلاغ اور دولت کے وسائل پر قابض لوگ ان کی رائے کو بگاڑتے اور سنوارتے رہتے ہیں۔ عوام کی حیثیت اس خام مال کی ہوتی ہے جو چند سرمایہ داروں کو سیاسی اقتدارِ اعلیٰ سے اٹھا کر آئینی اقتدارِ اعلیٰ کے ایوانوں میں لا کھڑا کرتا ہے تاکہ وہ اپنی خواہشات کے مطابق قانون بنا سکیں اور اس مدت کے دوران عوام ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ البتہ آئینی اقتدار سے محروم سیاست دان چاہیں تو سیاسی اقتدارِ اعلیٰ یعنی عوام کو بیوقوف

بناکر آئینی مقتدرِ اعلیٰ کو مخصوص مدت سے قبل ہی ختم کر سکتے ہیں اور خود آئینی اقتدارِ اعلیٰ کی حیثیت اختیار کر سکتے ہیں۔ لیکن پیشہ ور سیاست بازوں کا ایک اور غول سیاسی مقتدرِ اعلیٰ (عوام) کو ایک بار پھر بے وقوف بنا کر نئے آئینی مقتدرِ اعلیٰ کا خاتمہ کر سکتا ہے عوام کی حاکمیت اور اقتدارِ اعلیٰ کا تصور یہی ہے کہ وہ بار بار بے وقوف بنتے رہیں۔ تاکہ ان کی حماقت سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے انھیں ہر بار بے وقوف بنانے کا سلسلہ جاری رکھا جا سکے۔

یہی وہ جمہوریت کا دلچسپ کھیل ہے جس سے ہمارا سیاستدان بہرحال چمٹا رہنا ہی پسند کرتا ہے۔ پھر چونکہ عوام بے علم ہونے کے باوجود اسلام کے شیدائی ضرور ہیں۔ اس لیے وہ آیات کی تاویل کر کے اور واقعات کو اس طرح توڑ موڑ کر پیش کرے گا کہ جس طرف سے دیکھیں جمہوریت کے آئینہ میں اسلام ہی اسلام نظر آئے۔

۲۔ سیاست ایک منافع بخش کاروبار ہے۔ کوئی سیاست دان چند سالوں کے لیے نہ سہی چند دنوں کے لیے ہی کرسیٔ اقتدار پر متمکن ہو جائے تو اس کی کایا پلٹ جاتی ہے ۔ وہ جائز و ناجائز ذرائع سے اس قدر سرمایہ اکٹھا کر لیتا ہے کہ پھر عمر بھر اسی سرمایہ سے سیاست بازی کا شوق آسانی سے پورا کرتا رہتا ہے۔ اس میں اللہ تعالیٰ کے خوف کا تصوّر تک نہیں ہوتا۔

۳۔ بیشتر سیاسی رہنما بلکہ علماء کو بھی سرے سے اس بات کا علم ہی نہیں کہ مغربی جمہوریت اور نظامِ خلافت میں کتنا بُعد ہے۔ مدتِ دراز سے اجتہاد کا دروازہ بند ہو چکا ہے جب سیاستدان اور علمائے دین دورِ حاضر کے تقاضوں کے مطابق اسلامی قوانین کو منطبق نہیں کر پاتے تو مغرب کے بنے بنائے نظام کو اسلامی اصُولوں پر منطبق کرنے کی کوشش کرتے ہیں تاکہ انھیں خود کچھ ذہنی کاوش نہ کرنی پڑے۔

۴۔ اکثر سیاست دانوں کو یہ خطرہ لاحق ہے کہ اگر فی الواقعہ اسلامی نظام آجائے تو ان کے مفادات، اقتدار اور جاگیریں سب غیر محفوظ ہو جاتی ہیں۔ وہ یہ بھی سمجھتے ہیں کہ ان کا سیاسی کاروبار اسلامی نظام کے نعرہ کے بغیر چل نہیں سکتا۔ لہٰذا اس نعرہ کی آڑ میں جمہوریت کو ہی عین اسلام یا اسلام سے قریب تر ثابت کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ وہ جمہوریت اور اسلامی نظام کے فرق کو واضح کر کے اپنے پاؤں پر خود کلہاڑی مارنا نہیں

چاہتے۔

۵ ۔ کچھ سیاست دان ایسے بھی ہیں جو بیرونی طاقتوں کے ایجنٹ ہیں اور بیرونی طاقتوں کا مفاد اسی میں ہے کہ مسلمان اسی لادینی سیاست میں اُلجھے رہیں اور ان طاقتوں کو ملک میں عمل دخل کا موقع ملتا رہے۔ اسی جمہوریت کے ذریعے وہ ملکوں پر دباؤ ڈالتے اور جب چاہتے ہیں کسی ملک کی حکومت کا آسانی سے تختہ الٹ دیتے ہیں۔ یہ ایجنٹ حضرات بھی چاہتے ہیں کہ جمہوریت کا ساغر چلتا رہے لہٰذا انھیں بھی اس طرزِ انتخاب کو عوام میں مقبول بنانے کے اسلام کا سہارا لینا پڑتا ہے۔

انہی عوامل کا یہ اثر ہے کہ بھرپور پروپیگنڈہ کے ذریعہ جمہوریت کو عین اسلام بنا کر پیش کیا جا رہا ہے اور اس پروپیگنڈہ میں حق کی آواز دب کر رہ گئی ہے۔

۵۔ خلافتِ راشدہ کی امتیازی خصوصیات

۱۔ اقتدارِ اعلیٰ

نظامِ خلافت میں مقتدرِ اعلیٰ خود اللہ تعالیٰ ہے۔ وہی ہر چیز کا مالک اور وہی قانون ساز ہے۔ ملتِ اسلامیہ اور انسانیت کی فلاح و بہبود کے بنیادی قوانین اللہ تعالیٰ خود بذریعہ انبیاء انسانوں کو بتلاتا ہے۔ ایسی قانون سازی کا اختیار کسی نبی کو بھی نہیں ہوتا۔ جب کہ دوسرے تمام نظام ہائے سیاست میں مقتدرِ اعلیٰ کوئی ایک انسان یا ادارہ ہوتا ہے۔ ملوکیت اور آمریت میں یہ مقتدرِ اعلیٰ بادشاہ یا ڈکٹیٹر ہوتا ہے۔ جمہوریت میں سیاسی مقتدرِ اعلیٰ تو عوام ہوتے ہیں اور قانونی مقتدرِ اعلیٰ پارلیمنٹ۔ اقتدارِ اعلیٰ کی مختلف تعریفیں کی گئی ہیں۔ مثلاً:

فرانسیسی مفکر بودن (BODIN) اس کی یوں تعریف کرتا ہے:۔

"اقتدارِ اعلیٰ شہریوں اور رعایا پر ریاست کا وہ برتر اختیار ہے جو کسی قانون کا پابند نہیں ہوتا۔"

امریکی مصنف برجس (BURGESS) اس کی یوں تعریف کرتا ہے:۔

"اقتدارِ اعلیٰ ہر فرد پر اور افراد کے تمام اداروں پر اصلی، حاوی، مطلق اور

غیر محدود اختیار کا نام ہے"۔[1]

اور فرانسیسی مفکر رُوسو (ROASSEAU) اس کی تعریف یوں کرتا ہے :-

" اقتدارِ اعلیٰ مطلق، قطعی، ناقابلِ تقسیم اور ناقابلِ انتقال اختیار کو کہتے ہیں"۔

ان تعریفوں سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ مقتدرِ اعلیٰ میں مندرجہ ذیل خصوصیات کا پایا جانا ضروری ہے :-

وہ مطلق العنان، مستقل بالذات ہو، جامع، منفرد حیثیت کا مالک، ناقابلِ تقسیم، ناقابلِ انتقال اور ناقابلِ زوال ہو۔

اور یہ تو ظاہر ہے کہ ان صفات کا جامع اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی انسان یا ادارہ نہیں ہو سکتا۔ بادشاہ یا آمر کے اختیارات کو ایسے بہت سے خارجی عوامل محدود کر دیتے ہیں جو اس کے قابو میں نہیں ہوتے۔ جمہوریت میں کسی ایک ادارے کے پاس حقیقی حاکمیت موجود نہیں ہوتی۔ ہر ادارے کے ظاہری اختیار کے پیچھے کچھ دوسری با اختیار طاقتیں نظر آتی ہیں۔ اور یہ سلسلہ کہیں ختم نہیں ہوتا۔

اب دیکھئے کہ قرآن کریم نے جو مقتدرِ اعلیٰ کا تصور پیش کیا ہے وہ مغربی مفکرین کے تصور سے کئی لحاظ سے مختلف ہے مثلاً :-

۱۔ **ملکیت میں فرق** :- اسلامی نقطۂ نگاہ سے اقتدارِ اعلیٰ کا مالک اللہ تعالیٰ ہے۔ کوئی فرد یا ادارہ حاکمیت کے اختیارات کا حامل نہیں۔ لیکن مغربی مفکرین کے نزدیک اقتدارِ اعلیٰ کا انسان ہونا ضروری ہے۔ انسان سے ماوراء کسی ہستی کو مقتدرِ اعلیٰ تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔

۲۔ **اختیارات میں فرق** :- اسلامی نقطۂ نظر سے کسی فرد کو یا ادارہ کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ خدائی قوانین میں ترمیم و تنسیخ کر سکے۔ جب کہ انسانوں کے قوانین میں آئے دن ترمیم و تنسیخ کا سلسلہ جاری رہتا ہے کیونکہ اس پر کئی عوامل اثر انداز ہوتے رہتے ہیں۔

۳۔ **اکثریت کی حکمرانی** :- جمہوریت میں اکثریتی پارٹی اپنی مرضی کے مطابق قانون بناتی ہے تو اقلیت کے حقوق و مفادات نظر انداز ہو جاتے ہیں۔ لیکن اسلام نے اکثریت و اقلیت کی اس مصنوعی تقسیم کو ختم کر کے واحد قانون کا تصور دیا ہے۔ یہ واحد قانون اللہ تعالیٰ

[1] تعارف مدنیت ص ۱۰۶۔ پروفیسر محمد امین جاوید ایم اے۔ (تاریخ و سیاسیات)

کی مرضی اور حکم ہے جو ہر ایک کے لیے یکساں طور پر واجب الاطاعت ہے۔

اسلام میں اقتدارِ اعلیٰ کی خصوصیات

۱۔ صرف اللہ تعالیٰ ہی حاکمِ اعلیٰ ہے۔ کوئی فرد، خاندان، گروہ بلکہ پوری مِلت بھی حاکمیت کا دعویٰ نہیں کرسکتی۔

۲۔ اللہ تعالیٰ ہی قانون ساز ہے۔ کسی دوسرے کو قانون سازی کا اختیار حاصل نہیں۔ اور نہ خدا کے بنائے ہوئے قانون میں رد و بدل کرسکتا ہے۔ حتیٰ کہ نبی بھی ایسا نہیں کرسکتا۔

۳۔ امیر یا اسلامی حکومت صرف اسی صورت میں اطاعت کی مستحق ہے کہ وہ خدا کے قانون کو نافذ کرے۔

۴۔ اسلام میں قانونی اور سیاسی حاکمیت میں کوئی امتیاز نہیں۔ اللہ تعالیٰ ہی سیاسی اور قانونی مقتدرِ اعلیٰ ہے۔

اقتدارِ اعلیٰ اور اسلام کی عالمگیریت

انیسویں صدی کے اواخر میں سائنسی ترقی کے نتیجہ میں جب وسائل ابلاغ میں وسعت اور نقل و حرکت میں آسانی اور تیز رفتاری پیدا ہوئی تو تمام دُنیا کو ایک عالمی برادری کا احساس پیدا ہوا۔ یہی وجہ تھی کہ پہلی جنگِ عظیم میں بہت سے ممالک کو چار و ناچار حِصّہ لینا پڑا۔ جنگ کے اختتام پر عالمی امن کو برقرار رکھنے کی خاطر جمعیتِ اقوام (LEAGUE OF NATIONS) کا قیام عمل میں آیا جو بالآخر ناکام ثابت ہوئی۔ وجہ یہ تھی کہ طاقتور حکومتوں کے مفادات کمزور ملکوں کی حمایت کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ تھے۔

جمعیتِ اقوام کی ناکامی کا ثبوت اس سے زیادہ کیا ہوسکتا ہے کہ دوسری جنگ عظیم برپا ہو کر رہی۔ اس کے اختتام پر نئے جوش و خروش سے ایک دوسرا عالمی ادارہ اقوام متحدہ (U.N.O) وجود میں آیا۔ اس ادارے نے عالمی امن کے لیے بہت سے قواعد مقرر کیے۔ عالمی عدالت بھی قائم کی۔ تحدید اسلحہ کی کوشش بھی کی اور دُنیا بھر کے انسانوں کے لیے "بنیادی حقوق کا چارٹر" بھی شائع کیا۔ لیکن ان سب باتوں کے باوجود نتائج کچھ حوصلہ افزا نہیں۔ وجہ وہی ہے کہ بڑی بڑی طاقتیں اپنے انا کو قائم رکھتی اور اپنے اپنے مفادات کی خاطر کمزور ملکوں کے حقوق و مفادات کو کچل دیتی ہیں جیساکہ آج کل بالخصوص عالمِ اسلام سے ہو رہا ہے۔ اور یہ سب

حالات آپ کے سامنے ہیں۔ باہمی آویزش پہلے سے کم نہیں زیادہ ہی ہوئی ہے۔

لیگ آف نیشنز اور یو۔این او کی کارکردگی پر جناب قدرت اللہ شہاب نے اپنے مخصوص انداز میں یوں تبصرہ فرمایا ہے:۔

"پہلی جنگِ عظیم کے بعد دُنیا میں امن و امان کو فروغ دینے کے لیے لیگ آف نیشنز وجود میں آئی تھی لیکن یہ انجمن کفن چوروں کی ثابت ہوئی اور اقوامِ عالم کی بہت سی قبریں آپس میں تقسیم کرنے کے بعد اس نے آرام سے جنیوا میں دم توڑ دیا۔

دوسری جنگِ عظیم کے بعد اقوامِ متحدہ کی تنظیم نو یو۔این۔اے نے جنم لیا۔ اس ادارے کا رہنما اُصول "جس کی لاٹھی اس کی بھینس" ہے جب کوئی لاٹھی والا طاقتور ملک جارحیت سے کام لے کر کسی چھوٹے اور کمزور ملک کی بھینس زبردستی ہنکا کر لے جاتا ہے تو یو۔این۔اے فوراً جنگ بندی کا اعلان کرکے فریقین کے درمیان سیز فائر لائن کھینچ دیتی ہے۔ جنگ بندی کے خط پر یو۔این۔او کی نامزد فوج اور مبصر متعین ہو جاتے ہیں جو اس بات کی خاص نگہداشت رکھتے ہیں کہ مسروقہ بھینس دوبارہ اپنے مالک کے پاس نہ جانے پائے۔ اس کے بعد یہ سارا معاملہ جنرل اسمبلی اور سیکیورٹی کونسل کی قرار دادوں میں ڈھل ڈھل کر نہایت پابندی کے ساتھ یو۔این۔اے کے سرد خانوں میں جمع ہوتا رہتا ہے۔ (شہاب نامہ ص ۱۱۰۷)

اب بڑے بڑے مفکرین اس مصیبت سے نجات کا حل تلاش کرنے میں مصروف ہیں۔ اور ان کے فکر کا نتیجہ اس شکل میں سامنے آرہا ہے کہ جب تک تمام دنیا میں ایک عالمگیر حکومت قائم نہ ہو، عالمی امن کی ضمانت دینا ناممکن ہے۔ بالفاظِ دیگر اس عالمی حکومت کا اقتدارِ اعلیٰ صرف ایک ہی ہونا چاہیئے۔

اگر انسانی فکر صحیح راہ پر گامزن رہی تو اسے جلد ہی یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ اقتدارِ اعلیٰ صرف ایسی ہستی ہونی چاہیئے جس کی نگاہ میں دنیا بھر کے انسانوں کے حقوق و مفادات یکساں حیثیت رکھتے ہوں اور ظاہر ہے کہ یہ صفت کسی انسان میں یا ادارہ میں نہیں ہو سکتی۔ انسان میں اس لیے نہیں کہ وہ بہرحال کسی نہ کسی قوم اور علاقہ سے تعلق رکھتا ہوگا اور اسے بہرحال ترجیح دے گا اور ادارہ کی اس لیے نہیں کہ ان کے مفادات آپس میں

ٹکراتے رہیں گے۔

ان حالات کے پیشِ نظر وثوق کے ساتھ یہ کہا جا سکتا ہے کہ جب تک دنیا اسلام کی طرف رجوع نہ کرے گی۔ عالمی امن کا قیام ناممکن ہے۔ اسلام ہی ایسا دین ہے جس میں عالمگیر دین ہونے کے تمام اوصاف موجود ہیں جس کی تفصیل آئندہ "ربط ملت کے تقاضے" میں آئے گی۔

۲۔ نظامِ اقتدار کے بجائے نظامِ اطاعت

نظامِ خلافت کی دوسری اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس میں حاکم اور محکوم کا وہ تصور سرے سے مفقود ہے جو آج کل کے نظام ہائے حکومت میں پایا جاتا ہے۔ اسلامی معاشرہ میں حاکمِ اعلیٰ اللہ تعالیٰ خود ہے۔ قانون اور حکم اسی کا چلتا ہے۔ آئین تحریری صورت میں موجود ہے۔ حاکم اور رعایا سب اسی کے تابع فرمان ہیں اور اسی کی منشا و مرضی معلوم کرنے اور اس پر عمل کرنے کے پابند۔ یہاں کوئی انسان کسی دوسرے انسان (حاکم یا اولوالامر) کا غلام نہیں کہ اس کے خودساختہ قوانین و احکام کی اطاعت و پابندی لازم ہو۔ اس معاشرہ میں حق و باطل، عدل و انصاف اور حقوق و فرائض پہلے سے طے شدہ ہوتے ہیں۔ جن کا حاکم کو بھی ایسے ہی علم ہوتا ہے۔ جیسے اس کی رعایا کے ایک ایک فرد کو۔ خلیفہ یا امیر ان حقوق و فرائض میں اپنی طرف سے نہ کوئی اضافہ کر سکتا ہے نہ ہی ان میں کمی کا مجاز ہے اور اگر وہ ایسا کرے تو یہی نہیں کہ اس کی اطاعت ناجائز ہوتی ہے، بلکہ اس کی مسندِ خلافت بھی معرضِ خطر میں پڑ جاتی ہے۔ بالفاظِ دیگر اس معاشرہ کا حکمران کوئی مطلق العنان یا مقتدرِ اعلیٰ شخصیت نہیں ہوتی بلکہ قانونی لحاظ سے وہ عام آدمی کی سطح پر ہی ہوتا ہے۔ اس کی حکمرانی صرف ان معنوں میں ہے کہ وہ خدائی قوانین کی مشترکہ اطاعت کے لیے طریقِ کار وضع کرے اور رعایا میں اس کی تنقید کے لیے تدبیری قوانین بنائے اور ان کا نفاذ کرے۔ وہ اللہ کے احکام پہلے اپنی ذات پر نافذ کرتا ہے پھر دوسروں کو ساتھ لے کر چلتا ہے۔

اِس تصورِ حیات کا فائدہ یہ ہے کہ رعایا حکمران کے ایسے قوانین و احکام کی بسر و چشم اطاعت کرتی ہے کیونکہ اس کا بھی عین مقصود یہی کچھ ہوتا ہے اس طرح راعی اور رعایا کے درمیان حاکم و محکوم کے نفرت انگیز تصور کے بجائے اخوت، ہمدردی اور مساوات جیسے ارفع

---

[1] یہی جمہوریت، ملوکیت اور اسلام کا بنیادی فرق ہے۔

جذبات فروغ پاتے ہیں۔

نظامِ اطاعت کی ہمہ گیری پھر اس مشترکہ ذمہ داری نظامِ اطاعت کی ہمہ گیری بھی ملاحظہ فرمایئے۔ ارشادِ نبوی ہے :-

کلکم راعٍ وکلکم مسئول عن رعیتہٖ (متفق علیہ)

تم سے ہر ایک حکمران ہے اور اپنی رعایا کے متعلق وہ مسئول ہے۔

یہاں کلکم کا لفظ خاصا توجہ طلب ہے۔ گویا اسلامی معاشرہ کا ہر فرد اپنی حد تک حکمران بھی ہے اور اس سلسلہ میں جواب دہ بھی۔ ایک گھر کا سربراہ افرادِ خانہ کے لیے۔ ایک شہر کا حکمران اپنے شہر کے لیے، اسی طرح علاقہ کا حکمران علاقہ کے لیے اور پوری ریاست کا حکمران پوری رعایا کے لیے خدا کے ہاں بھی مسئول ہوگا اور حقوق کے اتلاف یا زیادتی کی شکل میں عام رعایا بھی اس سے باز پرس کر سکتی ہے۔

۳۔ ریاست اور قومیت کے بجائے ملّت کا تصوّر اسلامی نظامِ سیاست میں رعایا کا وہ مفہوم مطلق نہیں پایا جاتا جو دوسرے نظام ہائے حکومت میں پایا جاتا ہے۔ مثلاً ریاست کی جو مختلف تعریفیں کی گئی ہیں۔ ان کے مطابق ریاست کے ترکیبی اجزا چار ہیں۔ (۱) آبادی (۲) علاقہ (۳) حکومت اور (۴) اقتدارِ اعلیٰ۔ لیکن نظامِ خلافت کے لیے مخصوص علاقہ کی کوئی شرط نہیں ہے۔ نظامِ خلافت ریاست کی بجائے ملّت کا تصوّر پیش کرتا ہے۔ یہ کسی مخصوص علاقہ کی قید سے آزاد ہے اور اس کا مقصد عمدہ عالمی نظام قائم کرنا اور اس کی تعمیر و بلندی ہے۔ اسلام نے صرف اپنے وطن اور سرزمین کے لوگوں کو اپنا پیغام نہیں دیا۔ بلکہ یہ پیغام تمام دُنیا کے لیے یکساں ہے۔ ارشادِ باری ہے :-

یَاَیُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّ اُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا۔ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ (۴۹/۱۳)

لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور تمھاری قومیں اور قبیلے بنائے تاکہ ایک دوسرے کی شناخت کرو۔ اور خدا کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو زیادہ پرہیزگار ہے

اسی طرح اسلام کے پیغامبر کو بھی محض اپنے وطن کی خدمت کے لیے نہیں بھیجا گیا تھا۔ ارشادِ باری ہے۔

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّ نَذِيْرًا (۳۴/۲۸)

اور اے محمد! ہم نے تم کو تمام لوگوں کو خوشخبری سُنانے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے۔

دنیا کا خدا رب العالمین ہے جس کی ربوبیت عامہ کسی وطن یا مقام سے مخصوص نہیں ہے۔اس کا پیغام امن ونجات دُنیا بھر کے لیے یکساں ہے۔ملّت کی تعریف میں جماعت، امیر اور ان دونوں کے مابین حقوق وفرائض کا تعلق تو پایا جاتا ہے لیکن وطن یا علاقہ کا کوئی تصور نہیں ملتا۔ارشادِ نبوی ہے۔

لا اسلام الا بالجماعة، ولا جماعة الا بالامير ولا امير الا بالسمع والطاعة۔

جماعت کے بغیر اسلام نہیں۔اور امیر کے بغیر جماعت نہیں اور امیر کا حق ہے کہ اس کا حکم سُنا جائے اور اس کی اطاعت کی جائے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ملّت اسلامیہ کی تنظیم کا جو نقشہ پیش فرمایا ہے۔اس میں بھی علاقہ یا وطن کا تصوّر معدوم ہے۔اسی تصوّر کو علاّمہ اقبال نے یوں واضح کیا۔ع

ہر ملک مِلکِ ماست کہ ملک خدائے ماست

اسلام انسانیت کی وحدت اور اتحاد پر زور دیتا ہے اور یہ اصُول دراصل اسلام کے عقیدۂ توحید کے ساتھ وابستہ ہے۔انسانی وحدت قائم کرنے کے لیے ایک منتخب گروہ کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔جو دوسرے انسان کی رہنمائی کر سکے۔یہ منتخب گروہ مسلمان ہیں۔

تمام مسلمان ملّتِ اسلامیہ کے رکن ہوتے ہیں۔اور ملّت کی تنظیم کے ذریعہ انسانیت کے اتحاد وترقی کی کوشش کرتے ہیں۔ملّت کی بنیاد توحید اور ختمِ نبوّت کے بنیادی اصُولوں پر قائم ہے۔توحید کا اصُول اطاعتِ خداوندی کی دعوت دیتا ہے اور انسانی اعمال کی رہنمائی کرتا ہے۔نبوّت کی وجہ سے ملّت کا نظم وضبط قائم ہے۔حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ملّت کے رہنما ہیں اور آپؐ کی ذاتِ اقدس کی وجہ سے ملّت کا نظم وضبط قائم ہے۔ملّت کی تنظیم کا تصوّر قومیت کے اس محدود نظریہ کو ردّ کرتا ہے۔جس کی بنیاد جغرافیائی اتصال، یا نسل ورنگ اور لسانی اتحاد پر ہے۔مسلم ملّت کی بنیاد دینِ اسلام ہے۔اور اس لحاظ سے تمام مسلمان خواہ وہ کسی ملک، نسل یا ذات سے تعلق رکھتے ہوں۔ملّت کے اراکین متصوّر ہوں گے۔علاقائی، نسلی، لونی، لسانی

غرضیکہ کسی طرح کے بھی تعصب کی اسلام میں کوئی گنجائش نہیں۔ وطن کے اختلاف کی بنیاد پر جداگانہ قوموں کا تصور بھی یورپ کی پیدا کردہ لعنت ہے۔ وطن پرستی اور قوم پرستی موجودہ دور کے سب سے بڑے معبود ہیں جن کی پرستش کی جا رہی ہے۔ علامہ اقبال کے الفاظ ہیں :-

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے۔
جو پیرہن ہے اس کا وہ مذہب کا کفن ہے

ملتِ اسلامیہ کے افراد مختلف زبانیں بولنے، مختلف نسلوں سے تعلق رکھنے، مختلف رنگوں کے حامل ہونے، مختلف علاقائی حدود میں بسنے اور مختلف لباس اور مقامی رسم و رواج رکھنے کے باوجود ایک ہی طرز پر سوچتے اور ایک ہی سرچشمۂ ہدایت سے رہنمائی حاصل کرتے ہیں۔ اور یہ حقیقت ان سب کو ملتِ واحدہ میں پرو دیتی ہے۔ دراصل اسلام ایک ایسے آفاقی نظام کے قیام کا خواہشمند ہے۔ جس میں نظریہ اور عمل میں مکمل اتفاق و یگانگت پائی جائے اور جو تمام بنی نوع انسان کے ہر شعبۂ زندگی میں رہنمائی کرے۔

۴۔ غیر جماعتی نظامِ حکومت

بعض حضرات جو اسلام میں سیاسی پارٹیوں کے وجود کے قائل نہیں وہ اسلامی نظام کو یک جماعتی نظام سے تعبیر کرتے ہیں۔ کیونکہ آج کل دنیا میں دو ہی قسم کے نظام ہائے حکومت رائج ہیں۔

۱۔ جمہوری نظام جس میں سیاسی پارٹیوں اور خصوصاً حزبِ اختلاف کا وجود لازمی قرار دیا گیا ہے۔

۲۔ یک جماعتی نظام جیسا کہ کمیونسٹ یا سوشلسٹ ممالک میں رائج ہے۔

وہ یہ سوچ ہی نہیں سکتے کہ غیر جماعتی نظامِ حکومت (NO PARTY SYSTEM) بھی قابلِ عمل ہو سکتا ہے۔

یک جماعتی حکومت بھی مخالف عنصر کو پہلے سے فرض کر لیتی ہے اگرچہ اس عنصر کو بزور دبا کر معطل رکھا جاتا ہے۔ لیکن اس نظام میں انتہائی غیر منصفانہ اقتصادی ناہمواری اور خطرناک مجلسی عدمِ مساوات ہمیشہ موجود رہتے ہیں۔ دورِ حاضر میں تو یہ نظام کمیونسٹ یا سوشلسٹ ممالک میں رائج ہے۔ قرونِ اولیٰ میں فرعونِ مصر کی حکومت کو بطور مثال پیش کیا جا سکتا ہے۔

گو اسلامی معاشرہ میں بھی کاروبارِ حکومت کی کلیدی آسامیاں اور حقِ انتخاب

ومشورہ میں اقلیتیں شامل نہیں ہوسکتیں لیکن وہ اس نظامِ حکومت میں مقہور و مجبور نہیں ہوتیں۔ وہ اپنے معاشرتی، قانونی اور معاشی حقوق مسلمانوں کے برابر ہی رکھتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی نظامِ حکومت میں اقلیتیں ہمیشہ حکومت کی خیر خواہ رہی ہیں اور معاون و مددگار ثابت ہوئی ہیں۔

۵۔ غیر طبقہ دارانہ حکومت

اسلام نے معاشرتی وسیاسی لحاظ سے ہر مسلمان کا درجہ مساوی قرار دیا ہے۔ اگر کسی کو دوسرے پر افضلیت ہے تو فقط تقویٰ کی بنا پر ہے۔ لہٰذا اسلامی ریاست میں خلیفہ یا امیر کے خاندان یا قبیلہ کو شاہی خاندان کی حیثیت ہرگز حاصل نہیں ہوتی۔ ملوکیت میں تمام کلیدی اسامیوں پر شاہی خاندان مسلط ہوتا اور ہر طرح کے مادی فوائد حاصل کرتا ہے اور جمہوریت میں برسرِ اقتدار پارٹی تمام کاروبارِ سلطنت پر چھائی ہوتی ہے اور یہ ان کا حق ہوتا ہے لیکن اسلام میں ایسے حق کی کوئی گنجائش نہیں۔ حتیٰ کہ امیر کے خاندان کے افراد کسی قسم کی سماجی یا مادی مراعات کا مطالبہ بھی نہیں کرسکتے۔ اسلامی ریاست میں عہدے فقط ذاتی استعداد، تقویٰ اور دیانت کی بنا پر تفویض کیے جاتے ہیں۔ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ نے بھی اس سلسلہ میں کمال احتیاط کا مظاہرہ کیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پرانے قبائلی طرزِ حکومت کے جاہلی نظریہ کی جڑ کٹ گئی اور امت بنیان مرصوص کی طرح متحد رہی۔

حضرت عثمانؓ کا ابتدائی چھ سالہ دَور بھی معاشرہ کے اسی مزاج سے ہم آہنگ تھا لیکن بعد میں حضرت عثمانؓ کے خاندان بنوامیہ نے چالاکی سے کچھ ناجائز حقوق ومراعات حاصل کرلیے۔ حضرت عثمانؓ ذہنی طور پر اس مادی دُنیا کے مخمصوں سے اس قدر دور تھے کہ دنیوی معاملات کے نظم ونسق میں حکمتِ عملی کو ہمیشہ ملحوظ رکھنا ان کے لیے مشکل تھا۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ وُہ فرشتہ سیرت اور رحم دل انسان تھے اور اپنے عزیز و اقارب سے حسنِ سلوک کرنے اور اپنے اختیار کو ان کے مفاد کے لیے استعمال کرنے کو نیکی تصوّر کرتے تھے (طبری جلد اول) یہ اموی عمال من مانی کارروائیاں کرنے اور ناجائز طور پر املاک غصب کرنے لگے جسے صحابہ اور عامۃ الناس نے شدت سے محسوس کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بعض مفسدہ پردازوں نے عوام کو برانگیختہ کردیا۔ بغاوت ہوئی جس کا خاتمہ حضرت عثمانؓ کی شہادت ہوئی۔ اس بغاوت کے بعض دوسرے اسباب میں سے ایک اہم سبب یہی اقربا نوازی تھی۔

حضرت علیؓ خلیفہ منتخب ہوئے تو انھوں نے ایسے تمام اموی عمال کو معزول کردیا یا معزولی

کے حکم نامے صادر فرما دیے۔ حالانکہ اب یہ خاندان خلیفہ کے خاندان سے تعلق نہ رکھتے تھے۔ یہی سلوک اگر بتدریج ہوتا تو شائد کسی کو احساس تک بھی نہ ہوتا۔ حضرت علیؓ کے دَور میں حکومت کو استحکام نصیب نہ ہونے کے اسباب میں سے ایک اہم سبب اموی خاندان سے اس قسم کا سلوک تھا۔

گویا اسلامی ریاست اور معاشرہ نہ تو کسی خاندان سے ناجائز ترجیحی سلوک کو برداشت کرتا ہے اور نہ ہی توہین آمیز سلوک کو۔ نتیجۃً دونوں صورتوں میں بگاڑ ہی پیدا ہوتا ہے۔

۶۔ اخلاقی بنیادیں اور اضافی ذمہ داریاں

اسلام میں سیاسی تنظیم ایک اخلاقی بنیاد رکھتی ہے۔ یہاں ریاست کا قیام اصل مقصود نہیں بلکہ یہ کسی دوسرے عظیم مقصد کے حصول کا ذریعہ ہے۔ لہٰذا ایک اسلامی ریاست کی ذمہ داریاں بھی دوسری ریاستوں سے کافی زیادہ ہیں۔ مثلاً ایک غیر اسلامی ریاست کی ذمہ داریاں محض یہ ہیں کہ پولیس کے ذریعے امن بحال رکھا جائے۔ انتظامیہ کے ذریعہ حکومت کا کاروبار چلایا جائے۔ اور فوج کے ذریعے سرحدوں کی حفاظت کی جائے۔ لیکن ایک اسلامی ریاست یہ ذمہ داریاں بھی پورا کرتی ہے۔ اور یہ اس کا ثانوی فریضہ ہے۔ اس کے قیام کے اولین مقاصد یہ ہیں :-

۱۔ نماز اور زکوٰۃ کا نظام قائم کیا جائے۔
۲۔ ملک سے ظلم وجور ختم کر کے عدل وانصاف قائم کیا جائے۔
۳۔ مکروہ کاموں کی روک تھام اور نیک کاموں کی حوصلہ افزائی کی جائے۔
۴۔ اور جو قوانین اس نظام کی راہ میں رکاوٹ کا سبب بنتی ہیں ان کو دُور کیا جائے۔ اسی کا نام جہاد ہے۔

اور اس ساری تگ و دَو کا مقصد عمدہ عالمی نظام قائم کرنا اور انسانیت کی تعمیر اور سربلندی ہے۔

یہ تو ظاہر ہے کہ ریاست کا آئین خواہ کتنا ہی بہتر ہو اور حکومت خواہ کسی طرز کی ہو۔ اگر اس سے اخلاقی اقدار کو جُدا کر لیا جائے تو کبھی مثبت نتائج برآمد نہ ہوں گے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام نے حکومت کے انتظام وانصرام کو وہ اہمیت نہیں دی جو اخلاقی اقدار کو دی ہے اور یہی اخلاقی بنیاد اسلامی طرزِ حکومت کو دوسرے تمام اقسام حکومت سے ممتاز کرتی ہے۔

۷۔ عدلیہ کی بالادستی

یوں تو تقریباً سب طرح کی حکومتیں عدلیہ کی بالادستی کا دعویٰ کرتی

رہتی ہیں۔ لیکن نظامِ خلافت کے سوا اس دعویٰ پر پورا اترنا ناممکن ہے۔ وجہ یہ ہے کہ نظامِ خلافت ہی واحد طرزِ حکومت ہے۔ جس میں مقتدرِ اعلیٰ اللہ تعالیٰ ہے۔ جس طرزِ حکومت میں جو بھی مقتدرِ اعلیٰ ہو گا حقیقت میں بالادستی اسی کی ہو گی۔ ملوکیت میں مقتدرِ اعلیٰ خود بادشاہ کی ذات ہوتی ہے۔ اس کے مُنہ سے نکلا ہوا لفظ ہی حکم ہے۔ اور وہی قانون ہے۔

جمہوریت میں سیاسی مقتدرِ اعلیٰ تو عوام ہوتے ہیں اور آئینی مقتدرِ اعلیٰ پارلیمنٹ ہوتی ہے۔ عدلیہ محض پارلیمنٹ کے بنائے ہوئے قانون کے مطابق فیصلہ کرنے کی پابند ہوتی ہے۔ حد یہ ہے کہ پارلیمنٹ خود یا وزیر اعظم یا صدر کو اگر عدالت کی طرف سے اپنے مفادات کے خلاف فیصلہ کرنے کا خطرہ ہو تو نیا قانون بنا کر عدلیہ کو بے بس کر سکتی ہے۔ اب ذرا انگلستان جیسے مہذب جمہوری ملک میں پارلیمنٹ کے اختیارات ملاحظہ فرمایئے:-

انگلستان کی پارلیمنٹ کے اختیارات کی لامحدودیت

انگلستان میں اقتدارِ اعلیٰ پارلیمنٹ کو حاصل ہے۔ ڈائسی (DYCEY) کے الفاظ میں "پارلیمنٹ قانونی طور پر ایسی با اختیار ہے کہ نابالغ کو بالغ قرار دے سکتی ہے۔ ناجائز بچہ کو جائز بنا سکتی ہے اور اگر یہ چاہے تو ایک شخص کو اپنے مقدمہ میں خود ہی جج بنا سکتی ہے۔" (یہ سب عدلیہ کے فرائض ہیں)

اب پارلیمنٹ کے مقابلہ میں عدلیہ کی بے بسی ملاحظہ فرمایئے۔

"عدالتیں صرف قانونی اقتدارِ اعلیٰ کو تسلیم کرتی ہیں اور اس کے بنائے ہوئے قانون کی روشنی میں مقدمات کا فیصلہ کرتی ہیں۔ انگلستان میں عدالتوں کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ پارلیمنٹ کے بنائے ہوئے کسی قانون کو ناجائز یا خلافِ ضابطہ قرار دے سکیں۔ وہ صرف اس کی ترجمانی کرنے کی مجاز ہیں۔"

"ایک آزاد مملکت میں قانونی مقتدرِ اعلیٰ ایک مقررہ جماعت یا فرد ہوتا ہے۔ اس کا اختیار لامحدود ہوتا ہے اور اس کی منشاء کو نہ تقسیم کیا جا سکتا ہے اور نہ اس کو منتقل کیا جا سکتا ہے۔ اس کے احکام کو قوانین کی حیثیت حاصل ہوتی ہے اور کوئی ان کو چیلنج نہیں کر سکتا۔ اگرچہ وہ اخلاق اور مذہب کے اصُولوں کی خلاف ورزی ہی کیوں نہ کریں۔ شہریوں کے جو حقوق ہوتے ہیں وہ قانونی مقتدرِ اعلیٰ کے عطا کردہ ہوتے ہیں اور اس کے خلاف کوئی حقوق نہیں ہوتے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ جب چاہے ان حقوق کی تنسیخ کر سکتا ہے۔"

(اصول سیاسیات ص۱۰۶ ۔ صفدر رضا صدر شعبہ سیاسیات گورنمنٹ کالج سرگودھا)
"اسمبلی کے ارکان کی تقاریر پر عدلیہ باز پرس نہیں کرسکتی" (آئینِ پاکستان : دفعہ ۱۱۱)
"اسمبلی کی کسی بھی کارروائی کو عدالت میں چیلنج نہیں کیا جاسکتا" (تحریک آزادی اور دستورِ پاکستان ص۴۵۲)

پاکستان کے آخری دستور (اپریل ۱۹۷۳ء) میں اب تک ایسی دفعات موجود ہیں جن کی رُو سے سربراہِ مملکت، وزیرِ اعظم، گورنر اور وزرائے اعلیٰ پر نہ تو کوئی فوجداری مقدمہ دائر ہوسکتا ہے ۔ نہ عدالت انھیں ایسے مقدمہ میں ملوث قرار دے سکتی ہے اور نہ ہی کوئی بڑی سے بڑی عدالت انھیں طلب کرسکتی ہے ۔

ہمارے قومی اسمبلی کے ارکان کو بھی اجلاس کی کارروائی سے ۱۴ دن پہلے اور ۱۴ دن بعد تک کوئی دیوانی یا محصولاتی عدالت یا انتخابی ٹریبونل طلب نہیں کرسکتے ۔ نہ ہی ایسی کارروائی کر سکتے ہیں جس میں رُکن اسمبلی فریق ہو۔ (دستورِ پاکستان ص۴۵۳)

اور آج جب کہ مغربی طرزِ انتخاب کو شریعت بنچ میں چیلنج کیا گیا ہے ۔ تو جمہوریت نواز دل کی طرف سے یہ آوازیں اُٹھ رہی ہیں کہ جب اس شریعت بنچ کو آئین میں ترمیم و تنسیخ کا اختیار ہی حاصل نہیں تو اس کارروائی کا فائدہ ہی کیا ہے ؟

اسی طرح یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اگر شریعت بنچ اس طرزِ انتخاب کو غیر شرعی قرار دے دے تو آئین کا کیا بنے گا جو اسی طرزِ انتخاب کے بعد قومی اسمبلی نے بنایا ۔ اور پھر پاکستان کی آئینی حیثیت کیا ہوگی ؟ جب کہ یہ کثرتِ رائے کے معیارِ حق ہونے کے اُصول پر وجود میں آیا تھا" یہ اور اس قسم کی دوسری باتیں سب اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہیں کہ آئینی اقتدارِ اعلیٰ (اسمبلی) یا سیاسی اقتدارِ اعلیٰ (عوام) کے مقابلہ میں عدلیہ کی کوئی وقعت نہیں ہے ۔

اب اسلامی عدلیہ کا حال دیکھیے : وہ سربراہ مملکت کو طلب ہی نہیں کرسکتی ۔ اس کے خلاف بلاجھجک فیصلہ بھی کرسکتی ہے ۔ حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ دونوں خلفاء کو عدالت نے اس دوران طلب کیا جب کہ وہ خود خلیفہ تھے ۔ جب سربراہ مملکت عدلیہ کے سامنے یوں بے بس ہو تو دوسرے افراد کو کوئی قانونی رعایت یا گنجائش کیسے مل سکتی ہے ۔ یہ محض اس وجہ سے ہے کہ فرد کے حقوق و فرائض تو خود شریعت نے مقرر کر دیے ہیں ۔ اب ان میں نہ عدالت کمی بیشی کرسکتی ہے اور نہ سربراہِ مملکت ۔ دونوں مقتدرِ اعلیٰ (اللہ تعالیٰ) کے سامنے ایک

جیسے مجبور اور جوابدہ ہیں"۔ عدلیہ پر کسی بڑی سے بڑی شخصیت کا قطعاً کوئی دباؤ نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا "قانون کی بالادستی" اسلامی خلافت کی ایک ایسی امتیازی خصوصیت ہے جس کی کوئی دوسری حکومت مثال پیش نہیں کر سکتی۔

۸۔ انسان کی غلامی سے نجات

ملوکیت میں ایک انسان کی غلامی ہوتی ہے۔ جمہوریت میں پارلیمنٹ کی۔ اسی طرح دوسرے نظام ہائے حکمرانی میں جو فرد یا ادارہ مقتدرِ اعلیٰ ہوگا۔ وہ حاکم اور عوام یا رعایا اس کی غلام ہوگی۔ بادشاہ یا ادارہ جب چاہے نئے احکام و قوانین جاری کر سکتا ہے۔ عوام کے بنیادی حقوق معطل کر سکتا ہے۔ نیز کئی طرح کی پابندیاں لگا سکتا ہے جب کہ خلافت میں امیر اور رعایا پر ایک ہی قانون نافذ ہوتا ہے۔ دونوں اللہ کے بندے اور غلام ہوتے ہیں۔ کوئی انسان کسی حاکم یا ادارے یا دوسرے انسان کا غلام نہیں ہوتا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اہلِ نجران کے نام جو نامہ مبارک لکھا تھا۔ اس میں درج ذیل الفاظ قابلِ غور ہیں۔

من محمد النبی رسول اللہ الی اسقف نجران فانی احمد الیکم اِلٰہ ابراھیم واسحٰق ویعقوب، امّا بعد فانی ادعوکم الی عبادۃ اللہ من عبادۃ العباد الخ (البدایۃ والنہایۃ ج ۵ ص۵۳)

یہ خط محمد رسول اللہ کی طرف نجران کے سردار کے نام ہے۔ میں تمہارے سامنے ابراہیم، اسحٰق و یعقوب کے معبود کی حمد کرتا ہوں۔ ازاں بعد تمہیں بندوں کی غلامی سے نجات دلا کر اللہ تعالیٰ کی غلامی اور عبدیت کی طرف بلاتا ہوں ...... تا آخر

۶۔ پارلیمنٹ اور شوریٰ کا تقابلی مطالعہ

ایک صاحب فرماتے ہیں :۔

تعاونوا علی البر والتقویٰ کو پارلیمنٹری پارٹی کی اصل قرار دیا جا سکتا ہے۔ جو لوگ پارٹیوں کو گوارا نہیں کرتے وہ چاہتے ہیں کہ ہر دو سال بعد جنگ جمل، ۵ سال بعد جنگ صفین اور دس سال بعد کربلا بپا کرتے رہیں۔

ملاحظہ فرمایئے کہ جب انسانی سوچ غلط راستے پر پڑ جائے اور اس میں تعصب پیدا ہو جائے تو کیا کیا گل کھلاتی ہے۔ صاحب موصوف کا خیال ہے کہ مندرجہ بالا واقعات اس لیے پیش آئے کہ پارٹیوں کے وجود کو گوارا نہ کیا گیا۔ بالفاظ دیگر حضرت علیؓ کو چاہیئے تھا کہ وہ حضرت معاویہ کی سیاسی پارٹی کو برداشت کر لیتے۔ اسی طرح حضرت معاویہ کو بھی چاہیئے تھا کہ حضرت علیؓ کی سیاسی پارٹی کو برداشت کر لیتے تاکہ یہ ہنگامے نہ ہوتے۔ اور یہ دونوں فریق (حزب اقتدار اور حزب اختلاف) مل بیٹھ کر کوئی سیاسی سمجھوتہ کر لیتے۔

قطع نظر اس بات کے کہ حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ محض الگ الگ سیاسی پارٹیاں نہ تھیں بلکہ متوازی حکومتیں تھیں، تاہم اگر فرض کریں وہ الگ الگ پارٹیاں ہی تھیں تو کیا ایسی متحارب پارٹیوں کا وجود ملت اسلامیہ میں برداشت کرنے کا کوئی جواز ہے؟ یا محض اس وجہ سے برداشت کر لینا چاہیئے کہ جمہوری طرز کا تقاضا یہی کچھ ہے۔ کیا ان معرکوں کی اصل وجہ مسلمانوں کے سیاسی اختلاف سے زیادہ باغی اور بدمعاش عنصر کی مفسدہ پردازیاں نہ تھیں؟ جو مسلمان اپنی باطنی خباثت کی وجہ سے فریقین کو جنگ میں صرف اس لیے جھونک رہے تھے کہ صلح و آشتی کی صورت میں انکی اپنی خیر نہیں؟ مندرجہ بالا معرکوں کے اسباب و علل سے متعلق ہمیں زیادہ تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں۔ ہم سر دست یہ پوچھتے ہیں کہ موجودہ پارلیمنٹ جہاں سیاسی پارٹیوں کا وجود گوارا ہی نہیں بلکہ ضروری سمجھا جاتا ہے۔ وہاں تو "سب ٹھیک" ہی رہتا ہے۔ یہ پاکستان دولخت کیسے ہو گیا۔ مجیب اور بھٹو میں کیا اختلاف تھا کہ ملک ہی تقسیم کرنا پڑا۔ وہاں مسلمانوں کا کتنا جانی اور مالی نقصان ہوا۔ یہ لوگ تو پارٹیوں کے وجود کو گوارا کرتے ہیں۔ اگر آپس کے اختلاف حل کرنے کا یہی طریقہ بہترین ہے تو اسمبلیوں میں کرسیوں سے جنگ کیوں

ہوتی ہے اور حزبِ اختلاف کی غنڈوں سے مرمت کیوں کروائی جاتی ہے؟

پھر کچھ دوست ایسے بھی ہیں جو موجودہ پارلیمنٹ کو شوریٰ کا نعم البدل قرار دیتے ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ وہ بے شک اسے شوریٰ سے بھی زیادہ مفید ادارہ سمجھیں مگر خدا را درمیان میں اسلام کا نام لاکر عوام کو گمراہ نہ کریں۔ اگر اسلام کا نام لینا ہے تو پھر اسلامی اقدار کے مطابق یہ دیکھنا ہوگا کہ آیا ایسے ادارہ کے وجود کا جواز بھی ہے یا نہیں؟ ذیل میں ہم ان دونوں اداروں کا موازنہ پیش کرتے ہیں۔

نظامِ خلافت میں شوریٰ کی حیثیت قطعاً وہ نہیں ہے جو جمہوری نظام میں مقننہ کی ہے۔ ان دونوں کی بنیاد الگ الگ، اصولِ تشکیل الگ اور اغراض و مقاصد الگ، غرض کوئی چیز ایک دوسرے سے نہیں ملتی۔ اب ہم اس فرق کو ذرا تفصیل سے واضح کریں گے۔

۱۔ اقتدارِ اعلیٰ پارلیمانی نظام میں آئینی اقتدارِ اعلیٰ خود پارلیمنٹ ہے اور سیاسی اقتدارِ اعلیٰ عوام ہوتے ہیں۔ جب کہ شوریٰ کا اقتدارِ اعلیٰ اللہ تعالیٰ ہے۔ اگر ہم اپنے آئین کے دیباچہ میں سنہری اور جلی الفاظ میں یہ درج کر دیں کہ پاکستان کا مقتدرِ اعلیٰ اللہ تعالیٰ ہے لیکن اگر طرزِ انتخاب کے بنیادی اصول جمہوری ہی رہیں گے یعنی بالغ رائے دہی اور کثرتِ رائے پر فیصلہ تو یہاں اللہ کی حاکمیت کبھی قائم نہیں کی جاسکتی اور نہ یہاں اسلام کا بول بالا ہوسکتا ہے۔ اسکی وجہ پر تفصیل سے روشنی ڈالی جاچکی ہے (ملاحظہ ہو "کیا جمہوریت کو مشرف بہ اسلام کیا جاسکتا ہے؟")

۲۔ پارلیمنٹ کا کام عوام کی خواہشات کے مطابق قانون سازی ہے اگر ۱۰۰ میں سے ۵۱ ممبر یہ کہہ دیں کہ سود کے بغیر معیشت نہیں چل سکتی تو سود آئینی طور پر جائز ہوجائے گا۔ جبکہ شوریٰ کو قانون سازی کی ضرورت ہی نہیں ہوتی۔ وہ کتاب و سنت کی شکل میں پہلے ہی موجود ہے۔ ذیلی اور انتظامی قوانین و ضوابط کے لیے قانون فہمی اور نفاذ کے لیے صرف ضوابط کا کام اس کے ذمہ ہوتا ہے۔

ہمارے بعض دوست کہتے ہیں کہ قراردادِ مقاصد منظور ہونے کے بعد شریعت کے منافی قوانین بنانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ جن باتوں کے متعلق کتاب و سنت سے واضح احکام مل سکتے ہیں وہاں مشورہ کی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی۔ مشورہ صرف مباح امور میں کیا جاتا ہے۔

لیکن ہمیں افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ قراردادِ مقاصد کی منظوری (۱۹۴۹ء) کے بعد سے لے کر آج تک ہمارے آئین میں بے شمار ایسی دفعات موجود ہیں جو کتاب و سنت کے منافی ہیں۔

حالانکہ کئی بار اسلامی مشاورتی کونسلیں اور نظریاتی کونسلیں اسی غرض سے تشکیل دی جاتی رہی ہیں۔ پھر یہی نہیں بلکہ آئندہ ایسے نئے قوانین بھی بنتے رہے جو صریحاً کتاب وسنت کے منافی تھے۔ مثلاً عائلی قوانین جو ایوب خان کے دَور میں پاس ہوئے۔ اور جس کے خلاف علماء نے احتجاج بھی کیا تھا۔

ہمارے آئین میں ایسے قوانین کی فہرست بہت طویل ہے جو کتاب وسنت سے متصادم ہیں مگر ہمارے جمہوریت پسندوں کو نظر نہیں آتے۔ ایسے غیر شرعی قوانین کی موجودگی کا اس سے واضح ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے کہ موجودہ حکومت نے شریعت بنچ، شرعی وفاقی عدالت اور اسلامی نظریاتی کونسل جیسے ادارے محض اس غرض سے قائم کیے ہیں کہ ہمارے اس آئین کی شریعت کے مطابق تطہیر کی جائے۔

۳۔ اہلیت شوریٰ کے ممبر فہم وبصیرت والے پختہ کار اور نیک اور متقی ہوتے ہیں۔ وہ خدا کے سامنے جوابدہی کے تصور کو مدِّ نظر رکھ کر حتی الامکان خیر خواہی سے مشورہ دیتے ہیں۔ اور چونکہ اس مشاورت کا مقصد اقرب الی الحق پہلو کی تلاش اور اللہ کی رضا کی جستجو ہوتا ہے لہٰذا ان میں نہ کسی مسئلہ پر اپنی رائے پر اصرار ہوتا ہے اور نہ ہی اَنا کا سوال پیدا ہوتا ہے۔ پارلیمنٹ کے ممبر کی اہلیت یہ ہے کہ اس کی عمر ۲۵ سال سے کم نہ ہو اور اس کا نام فہرست میں درج ہو۔ نیز پچھلے ۵ سال کے عرصہ میں کسی عدالت سے فوجداری جرم میں سزا یافتہ نہ ہو۔ اس کی سزا کی مدت ۲ سال قید ہے۔ (آرڈر ۵ ۱۹۷۷ء آرٹیکل ۱۰)

یہ صاحب چور ہوں، خائن ہوں، ڈاکو، ملک دشمن یا غدّار ہوں کوئی چیز ان کے انتخاب میں آڑے نہیں آسکتی۔

علمی لحاظ سے خواہ وہ قرآن کریم کا ایک لفظ بھی نہ جانتا ہو۔ اسلامی تعلیمات سے یکسر نابلد ہو۔ نظریاتی لحاظ سے خواہ وہ نظریۂ پاکستان کا ہی دشمن ہو، سوشلزم کا حامی ہو۔ انتقام اور خونی انقلاب کے نعرے لگاتا ہو۔ بیرونی حکومتوں کا ایجنٹ ہونا بھی ثابت ہو۔ لسانی اور علاقائی تعصبات کو خوب بھڑکاتا ہو۔ کوئی بات اس کی انتخابی اہلیت پر اثر انداز نہیں ہو سکتی۔ اندازہ لگائیے اسلامی جمہوریہ پاکستان کے قانون ساز ادارہ میں — جہاں کتاب وسنت سے استنباط کرنے کی ضرورت ہوتی ہے — یہ صاحب کیا کردار ادا کر سکتے ہیں؟ کیا یہ پوری قوم اور خود اسلام سے بدترین مذاق نہیں؟ ایسے لوگ اپنے پیسہ اور علاقہ میں غنڈہ گردی کے اثر و رسوخ

کی بنیاد پر اسمبلیوں تک پہنچ جاتے ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ اس سینکڑوں کی تعداد میں سے دس آدمی بھی بمشکل ایسے نکل سکیں گے جو معاملہ زیر بحث کو سمجھ کر کچھ مشورہ دینے کی اہلیت رکھتے ہوں۔

علاوہ ازیں اسمبلی میں حزبِ اختلاف کا وجود اس بات کا متقاضی ہوتا ہے کہ وہ کبھی حزبِ اقتدار کو خیر خواہی سے مشورہ نہیں دے سکتا۔ باہمی رقابت اور اَنا کا مسئلہ یہ دونوں باتیں مثبت اندازِ فکر اختیار کرنے کی راہ میں حائل ہوتی ہیں اور ہمارے خیال میں ہمارے تنزل و انحطاط کی سب سے بڑی وجہ یہی طریق مشورہ اور پارلیمان ہے۔ ہم نے پہلے ۳۰ سال میں اصل منزل کو کھویا ہی ہے کچھ پایا نہیں۔

پارلیمنٹ سرمایہ دار اور عیار لوگوں پر مشتمل ہوتی ہے۔ اس کے پلیٹ فارم سے سرمایہ بولتا ہے۔ سرمایہ یا پارٹی فنڈ کے بغیر جمہوریت ایک قدم بھی آگے نہیں چل سکتی۔ پارلیمنٹ سرمایہ کا تحفظ کرتی ہے اور سرمایہ دار اس کا تحفظ کرتا ہے۔ یہ سرمایہ داری کا نظام ہے۔ ذہانت و فطانت کا نہیں۔ اس سے جمہوریت کے لبادے میں امراء کی حکومت قائم ہو جاتی ہے۔ جو عوام کے نام پر غریب عوام استحصال کرتی ہے جب کہ شورائی نظام میں امیر و غریب کا کوئی مسئلہ نہیں وہاں صرف اہلِ تقویٰ کو آگے لایا جاتا ہے تاکہ وہ امورِ سلطنت کو اللہ کی رضا و مرضی کے مطابق سرانجام دیں۔ یہی وجہ ہے کہ شورائی نظام میں صاحب الرائے اور متقین کی تلاش و جستجو کرنا پڑتی ہے لیکن پارلیمانی نظام میں ہر دولت مند اقتدار حاصل کرنے کے لیے خود بے چین نظر آتا ہے۔

اسمبلی اور دوسرے بلدیاتی اداروں کے ممبروں (عوام کے نمائندگان) میں عملاً مندرجہ اوصاف کا موجود ہونا ضروری ہے۔

۱۔ سرمایہ دار اور اقتدار کا بھوکا ہو۔ یہ سرمایہ خواہ وہ اپنی گرہ سے خرچ کرے یا اسے پارٹی مہیا کرے۔

۲۔ عیار ہو۔ اپنے گن گانے اور حریف کی تذلیل کے فن سے آگاہ ہو۔ جائز و ناجائز کاموں میں کود جانے کی جسارت رکھتا ہو۔ جوڑ توڑ کے فن سے بھی آشنا ہو۔ خوفِ خدا اور اسلامی اقدار اس کے سامنے ہیچ ہوں۔

۳۔ تھانہ اور عدالتوں میں اسے دسترس ہو تاکہ بدمعاش لوگوں کی سرپرستی کر سکے۔ ان کے جرم

پر پردہ ڈال کر انھیں بے گناہ ثابت کر کے انھیں سزا سے بچا سکے تاکہ یہی لوگ انتخابات کے دوران اس کے دستِ راست اور ممد و معاون ثابت ہوں اور اس کا حساب چکا سکیں۔ اس طرح یہ دونوں مِل کر عوام کے حقوق کا استحصال کرتے ہوں۔

اگر ہمارے نمائندہ میں ان اوصاف میں سے کسی ایک کی بھی کمی ہو تو اس کی کامیابی کے امکانات کم ہی رہ جاتے ہیں۔ ایسے ہی لوگوں کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ وہ اہل شورےٰ کا نعم البدل ہیں۔

۴۔ کثرتِ رائے معیارِ حق کا اصُول بہت بڑی قباحت ہے جو مندرجہ بالا صورتِ حال کے پیشِ نظر گوارا کرنا پڑتی ہے۔ ورنہ اندریں صورتِ حال کسی معاملہ کا فیصلہ ہونا ناممکن ہے۔ جمہوری نظام میں یہ اصُول بہ امرِ مجبوری اختیار کیا گیا ہے جس کی حیثیت بنائے فاسد علی الفاسد سے زیادہ کچھ نہیں۔ اس اصُول سے معاملہ کا نزاع تو ختم ہو سکتا ہے لیکن راہ صواب سے اس کا کچھ تعلق نہیں ہوتا۔

اس کے برعکس شوریٰ میں مشورہ طلب معاملہ کے لیے دلیل کی جستجو ہوتی ہے۔ میرِ مجلس ہر ممبر سے دلیل کا خواہاں ہوتا ہے پھر جس سے دلیل میسر آجائے۔ وہ خواہ اقلیت کی بجائے صرف فرد واحد ہی ہو، جب میرِ مجلس اس پر مطمئن ہو جائے تو اس کے مطابق فیصلہ کر دیتا ہے۔

پارلیمنٹ میں چونکہ فیصلہ کی بنیاد کثرت رائے ہے اس لیے کثرت رائے حاصل کرنے کے ہر جائز و ناجائز طریقہ استعمال کیا جاتا ہے۔ دوسری پارٹیوں کے ممبروں کو ہم رائے بنانے کے لیے گٹھ جوڑ شروع ہو جاتا ہے جو مزید مناقشت اور انتشار کا باعث بنتا ہے۔ لیکن شوریٰ ایسی قباحتوں سے پاک ہوتی ہے اور مشورہ پوری خیر خواہی سے دیا جاتا ہے۔ گویا پارلیمنٹ کے ممبر انتخاب کے بعد نئے سرے سے جرائم کے ارتکاب میں مشغول ہو جاتے ہیں جبکہ شوریٰ کے ممبروں کا اصل مقصد ہی جرائم کا استیصال ہوتا ہے۔

۵۔ حق انتخاب اور طریق انتخاب : پارلیمنٹ کے ممبر کاروبارِ حکومت میں اپنا حق سمجھ کر نمائندگی کے لیے درخواست گزارتے ہیں۔ فیصلہ چونکہ کثرت رائے پر ہوتا ہے۔ لہٰذا انھیں اپنی تشہیر اور دوسرے رقیبوں کے مقابلے میں اپنی اہلیت اور پاکیزگی ثابت کرنے کے لیے اور دوسرے فریق کی تذلیل کے لیے اشتہارات، پوسٹر، گھر گھر جا کر ووٹ کے لیے بھیک مانگنا، جلسے جلوس وغیرہ سرانجام دینے کے لیے کثیر مصارف برداشت کرنا پڑتے ہیں۔ وہاں کئی

قسم کے جائز و ناجائز ہتھکنڈے بھی استعمال کرنا پڑتے ہیں۔ یہ سب باتیں ایسی ہیں جو کتاب و سنت کی رُو سے ناجائز اور قبیح جرائم ہیں۔ جب منتخب ہو کر اسمبلیوں میں پہنچ جاتے ہیں تو انھیں سب سے زیادہ فکر اس زرِ کثیر کی ہوتی ہے جو اس مہم پر صرف ہوا ہے۔ اس کی تلافی کے لیے وہ کئی طرح کی بددیانتیوں کے مرتکب ہوتے اور خزانہ عامرہ پر ہاتھ صاف کرتے ہیں۔

اس کے برعکس شوریٰ کے ممبروں کا انتخاب بالکل سادہ اور فطری طریق پر ہوتا ہے۔ امیر مشورہ سے حسب ضرورت مشیروں کا انتخاب (SELECTION) کر لیتا ہے۔ ایسے لوگ اپنی اہلیت کی بنا پر از خود ہی معاشرہ کی سطح پر ابھر آتے ہیں۔ لہٰذا ان کے انتخاب میں دقت نہیں ہوتی۔ اس سلسلہ میں کسی مخصوص علاقہ کے لوگ بھی ایسے آدمیوں کی نشاندہی کر سکتے ہیں۔ اور ان کے عزل و نصب میں عوام کی اس آزادانہ رائے کو بھی خاصا دخل ہوتا ہے۔ ان کے انتخاب کے لیے کسی مصنوعی طریقہ یا انتخابی مہم کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ یہاں مشیر کا نہ تو دولت مند ہونا ضروری ہوتا ہے۔ نہ اسے کچھ خرچ کرنا پڑتا ہے۔ لہٰذا انھیں نہ تو مذکورہ جرائم کا مرتکب ہونا پڑتا ہے اور نہ ہی رشوت اور غبن کے ذریعہ انھیں اپنی دولت بڑھانے کی فکر ہوتی ہے۔

۶۔ مدت منصب: جمہوریت میں پارلیمنٹ کی ممبرشپ ایک حق ہے۔ اب اسی طرح کے دوسرے حق دار اس انتظار میں رہتے ہیں کہ انھیں یہ حق کب نصیب ہوتا ہے۔ لہٰذا اس منصب کی مدت معین کر دی گئی ہے۔ جب کہ شوریٰ کی ممبرشپ حق نہیں بلکہ ایک ذمہ داری ہے۔ اور یہ مشیر خدا کے سامنے جوابدہی کے تصور کو سامنے رکھ کر اپنا فریضہ سرانجام دیتے ہیں۔ لہٰذا یہاں مدت منصب کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

۷- امیر اور شوریٰ کا انتخاب

اولوالامر کے اوصاف

۱- مسلمان ہونا ایک اسلامی ریاست کے خلیفہ یا امیر اور اسی طرح باقی سب اولوالامر ـــ جن میں اہلِ شوریٰ یا اربابِ حل و عقد، انتظامیہ اور عدلیہ کے ممتاز ارکان شامل ہیں ـــ کا مسلمان ہونا ضروری ہے۔ کیونکہ اسلامی ریاست ایک نظریاتی ریاست ہوتی ہے اور وہ لوگ جو اس نظریہ پر ایمان ہی نہ رکھتے ہوں وہ اس کا کاروبار کیسے چلا سکتے ہیں۔ ارشادِ باری ہے :-

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنْكُمْ (۴/۵۹)

اے ایمان والو! حکم مانو اللہ کا اور حکم مانو رسولؐ کا اور حاکموں کا جو تم میں سے ہوں۔

دوسرے مقام پر فرمایا :

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا بِطَانَةً مِنْ دُونِكُمْ لَا يَأْلُونَكُمْ خَبَالًا (۳/۱۱۸)

اے ایمان والو! نہ بناؤ بھیدی کسی کو اپنوں کے سوا۔ وہ کمی نہیں کرتے تمہاری خرابی میں۔

گو امیر یا اولوالامر کی یہ صفت بادی النظر میں چنداں اہم معلوم نہیں ہوتی لیکن اس کی اہمیت اور وضاحت اس لحاظ سے ضروری ہے۔ جب ہم دیکھتے ہیں کہ پاکستان ـــ جو قرارداد مقاصد مارچ ۱۹۴۹ء کی رُو سے اسلامی جمہوریہ پاکستان بن چکا تھا ـــ کے دستور ۱۹۵۶ء اور ۱۹۶۲ء میں جب یہ شق شامل کی گئی کہ "صدرِ مملکت کا مسلمان ہونا ضروری ہے" تو قومی اسمبلی میں بعض مسلمان حضرات نے ہی اس پر اعتراض کیا تھا کہ محض مذہبی اختلاف کی بنا پر غیر مسلموں کو ان کے بنیادی حقوق سے محروم کر دیا گیا ہے۔ دوسرے یہ کہ اس شرط کی موجودگی میں خود ملک بھی ایک قابل ترین شخص کی خدمات سے فائدہ اُٹھانے سے محض اس لیے محروم رہ سکتا ہے کہ وہ غیر مسلم ہے[۱]" پھر یہ بھی درج ہے کہ قائم مقام صدر ـــ جو قومی اسمبلی کا سپیکر ہوتا ہے ـــ کے لیے ضروری نہیں کہ وہ مسلمان ہو[۲]۔ غور فرمائیے ایسی پارلیمنٹ

۱-۲ تحریک آزادی و دستورِ پاکستان طبع چہارم ص ۴۱۵ از فاروق اختر نجیب۔

اسلام کی کیا خدمت کر سکتی ہے۔

ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ ہماری سپریم کورٹ کے چیف جسٹس (قاضی القضاۃ) جسٹس کارنیلیس رہ چکے ہیں جو ایک عیسائی تھے اور آج کل بھی سپریم کورٹ کے ایک سینئر جسٹس دراب پٹیل عیسائی ہیں۔ اسی طرح دوسری کئی کلیدی اسامیوں پر غیر مسلم یا کمیونسٹ لوگ براجمان ہیں۔ یہ چیز اسلامی تعلیمات کے بھی خلاف ہے اور ہمارے دستور کی اس دفعہ کے بھی خلاف ہے جس میں اللہ تعالیٰ کی حاکمیت کا اقرار کیا گیا ہے اور یہ سب کچھ اس لیے ہو رہا ہے کہ ہم جمہوریت کو سینہ سے لگائے ہوئے ہیں جس کی بنیاد ہی لادینیت پر ہے۔

۲۔ علوم قرآن وحدیث میں مہارت امیر اور اولوالامر سب کے لیے ضروری ہے کہ علوم قرآن وسنت کے اس قدر عالم ہوں کہ احوال وظروف کے مطابق نصوص سے استنباط کا ملکہ رکھتے ہوں: ارشادِ باری ہے۔

وَإِذَا جَآءَهُمْ أَمْرٌ مِّنَ الْأَمْنِ أَوِ الْخَوْفِ أَذَاعُوا بِهِ وَلَوْ رَدُّوهُ إِلَى الرَّسُولِ وَإِلَىٰ أُولِي الْأَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِينَ يَسْتَنبِطُونَهُ مِنْهُمْ (۴/۸۳)

اور جب ان کے پاس امن یا خوف کی کوئی خبر پہنچتی ہے تو اسے مشہور کر دیتے ہیں اور اگر اس کو پیغمبر اور اپنے سرداروں کے پاس پہنچاتے تو تحقیق کرنے والے اس کی تحقیق کر لیتے۔

۳۔ متقی ہونا امیر یا اولی الامر کے لیے یہی کافی نہیں کہ وہ علومِ قرآن وحدیث میں ماہر ہو بلکہ اس کا عامل اور متقی ہونا بھی ضروری ہے۔ جتنا کوئی زیادہ پرہیزگار ہوگا اتنا ہی اسلامی معاشرہ کا معزز رکن شمار ہوگا۔ بموجب ارشاد باری تعالیٰ:۔

إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ (۴۹/۱۳)

اور خدا کے نزدیک تم میں سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو زیادہ پرہیزگار ہے۔

۴۔ ذمہ داریوں کو نباہنے کی اہلیت ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُكُمْ أَن تُؤَدُّوا الْأَمَانَاتِ إِلَىٰ أَهْلِهَا (۴/۵۸)

اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ امانتیں اس کے مستحق کے حوالے کرو۔

۵۔ عمر کی پختگی اگر چالیس سال یا اس کے لگ بھگ ہو تو بہتر ہے۔ کیونکہ انسان چالیس کے بعد پختہ عمر ہوتا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:۔

حَتّٰىٓ اِذَا بَلَغَ اَشُدَّهٗ وَبَلَغَ اَرْبَعِيْنَ سَنَةً (۴۶/۱۵)

یہاں تک کہ انسان بھرپور جوان ہوتا اور ۴۰ سال کی عمر کو پہنچتا ہے۔

مندرجہ بالا پانچ اوصاف "ہر صاحب امر" میں پائے جانے چاہئیں۔ اب اولی الامر کی تین شاخیں ہو جاتی ہیں۔

۱۔ اہل شوریٰ کی نمایاں صفت یہ ہونی چاہیئے کہ علوم قرآن وسنت میں مہارت کے علاوہ وہ ممارست کی بنا پر اجتہاد واستنباط کر سکتے ہوں۔ جیسا کہ اوپر بیان ہوا۔ اہل شوریٰ کی یہ نمایاں صفت ہونی چاہیئے۔

۲۔ انتظامیہ کے اولو الامر بالخصوص فوج کے افسروں کے لیے جسم کا مضبوط اور بہادر ہونا بھی ضروری ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے :-

اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰهُ عَلَيْكُمْ وَزَادَهٗ بَسْطَةً فِى الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ (۲/۲۴۷)

اللہ نے تم میں سے اسے انتخاب کیا اور اسے علم اور جسم (طاقت) میں کشادگی دی گئی ہے۔

۳۔ قاضی کے اوصاف اور جو اولو الامر عدلیہ سے تعلق رکھتے ہوں تو ان میں صاحب بصیرت اور قوت فیصلہ کا مالک ہونا، یہ صفات بھی ضروری ہیں! ارشادِ باری تعالیٰ ہے :-

وَاٰتَيْنٰهُ الْحِكْمَةَ وَفَصْلَ الْخِطَابِ۔ (۳۸/۲۰)

ہم نے اسے حکمت اور فیصلہ کن بات کرنے کی صلاحیت دی۔

امام بخاریؒ نے کتاب الاحکام میں ایک باب یہ بھی باندھا ہے کہ قاضی کے اوصاف کیا ہونے چاہئیں ؟ وہ لکھتے ہیں :-

وقال الحسن اخذ اللّٰہ علی الحکام ان	امام حسن بصری نے کہا اللہ تعالیٰ نے حاکموں سے یہ عہد لیا
لا یتبع الھوی	(۱) خواہش نفس کی پیروی نہ کریں (غیر جانبدار رہیں)
ولا یخشوا الناس	(۲) لوگوں سے نہ ڈریں (بلکہ اللہ سے ڈریں)
ولا یشتروا بایاتی ثمنًا قلیلًا۔	(۳) اللہ کے احکام کو تھوڑے سے دنیوی مفاد (رشوت وغیرہ) لے کر پس پشت نہ ڈالیں۔

اور خلیفہ حضرت عمر بن عبدالعزیز قاضی کے لیے مندرجہ ذیل شرائط ضروری قرار دیتے تھے۔

وقال مزاحم بن زفر قال لنا	اور مزاحم بن زفر نے کہا کہ ہم سے عمر بن عبدالعزیز

عمر بن العزیز: خَمْسٌ اِذَا اَخْطَأَ الْقَاضِي مِنْهُنَّ خَصْلَةً كَانَتْ فِيهِ وَصْمَةٌ ان يكون فَهِيمًا۔	خلیفہ نے کہا کہ قاضی کے لیے پانچ باتیں ضروری ہیں۔ ان میں سے ایک بھی نہ ہو تو وہ عیب دار ہے: (۱) سمجھ والا ہو (قرآن و حدیث میں فہم سلیم رکھتا ہو)
حَلِيمًا	(۲) بُرد بار ہو۔
عَفِيفًا	(۳) حرام کاموں اور بدکاری سے پاک ہو۔
صَلِيبًا	(۴) حق و انصاف پر پکا اور مضبوط ہو۔
عالمًا سؤلا عَنِ العِلْمِ۔	(۵) عالم ہو اور علم کی باتیں دوسرے اہل علم سے تحقیق کرتا ہو۔

(بخاری۔ کتاب الاحکام باب متے یستوجب الرجل القضاء

سربراہِ مملکت کا انتخاب

اولی الامر کی مندرجہ بالا صفات کے علاوہ سربراہِ مملکت میں ایک صفت کا اضافہ ضروری ہے اور وہ یہ کہ اسے عوام کا اعتماد بھی حاصل ہو جیسا کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے سقیفہ بنی ساعدہ میں الائمۃ من قریش کہہ کر اس اصول کی تصریح فرما دی تھی۔ امیر کا انتخاب اہلِ شوریٰ ہی کی ذمہ داری ہے اور اہلِ شوریٰ چونکہ اُمت کے بہترین آدمیوں پر مشتمل ہوتی ہے اس لیے عموماً شوریٰ میں سے ہی اَتقیٰ اور اہل تر آدمی کو امیر منتخب کر لیا جاتا ہے۔ حضرت ابوبکرؓ نے حضرت عمرؓ کو نامزد فرمایا۔ حضرت ابوبکر کے دورِ خلافت میں حضرت عمرؓ شوریٰ کے ممبر بھی تھے اور قاضی القضاۃ کے عہدہ پر بھی فائز تھے۔

حضرت عمرؓ نے جن چھ آدمیوں کو خلافت کے لیے نامزد فرمایا یہ سب آپ کی شوریٰ کے ارکان اور عشرہ مبشرہ میں سے تھے۔ ایک اور صحابی سعدؓ بن زید بھی آپ کی شوریٰ کے رُکن اور عشرہ مبشرہ میں سے تھے اور بقیدِ حیات تھے لیکن وہ حضرت عمرؓ کے رشتہ دار تھے۔ لہٰذا آپ نے ان کا نام اس کمیٹی میں شامل نہیں کیا۔

اب ذرا صدر پاکستان کی اہلیت کا بھی مطالعہ فرمایئے:

۱۔ مسلمان ہو (۱۹۶۲ء سے پہلے مسلمانی بھی شرط نہ تھی)

۲۔ ۳۵ سال سے کم عمر نہ ہو اور اس فہرست میں اس کا نام درج ہو۔

۳۔ قومی اسمبلی کا ممبر بننے کا اہل ہو۔ اور قومی اسمبلی کے ممبر کی اہلیت درج ذیل ہے:۔

(ا) بالغ شہری اور رائے دہندہ ہو۔
(ب) کسی منافع بخش عہدے پر متمکن نہ ہو۔
(ج) دیوالیہ یا ایبڈو زدہ نہ ہو۔
(د) سیاسی اور اخلاقی جرائم میں پچھلے ۵ سالوں میں ۲ سال تک قید کی سزا نہ بھگت چکا ہو۔
(ہ) صوبائی یا قومی اسمبلی کا رکن یا کسی صوبے کا گورنر نہ ہو۔
اب پارلیمنٹ کے ممبر کی اہلیت و کردار اور شوریٰ کے ممبر کی اہلیت و کردار کا آپ خود موازنہ کر سکتے ہیں۔

شوریٰ کی ہیئت اور ارکان کی تعداد

شوریٰ کے ارکان کتنے ہوں، ان کے اجلاس کتنی دیر بعد ہوں اور کہاں ہوں۔ یہ سب باتیں مشورہ طلب امر کی اہمیت اور ضرورت کے پیش نظر ہونی چاہئیں۔ حضرت عمرؓ کے دورِ خلافت میں نظامِ حکومت خوب مستحکم ہو چکا تھا۔ اور اس دور میں مسلمانوں کی سلطنت بھی ہمارے پاکستان سے بہت بڑی تھی۔ لہٰذا آپ کے دَور کی شوریٰ کا اگر مطالعہ کیا جائے تو وہ ہمارے لیے نظیر کا کام دے سکتی ہے۔

یہ تو واضح ہے کہ اسلام میں جو شخص زیادہ متقی اور صالح ہوگا وہ شوریٰ کا زیادہ حقدار ہے۔ اس لحاظ سے مہاجرین اولین کو اسلامی معاشرہ میں سب سے زیادہ قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ اس کے بعد دوسرا درجہ عام مہاجرین و انصار کا تھا اور اس کے بعد تیسرا درجہ عام مسلمانوں کا تھا۔ تو مشورہ میں بھی یہی ترتیب ملحوظ رکھی جاتی تھی۔

مہاجرین متقدمین پر مشتمل ایک مجلسِ شوریٰ مسجدِ نبوی میں موجود رہتی تھی جس میں صرف مہاجرین صحابہؓ ہی شریک ہوتے تھے جہاں روزانہ انتظامات اور ضروریات پر گفتگو ہوتی تھی۔ صوبجات اور اضلاع کی روزانہ خبریں جو دربارِ خلافت میں پہنچتی تھیں حضرت عمرؓ ان کو اس مجلس میں بیان کرتے تھے۔ بحث طلب امور کا فیصلہ ہوتا اور موجود لوگوں سے استصواب کیا جاتا تھا۔ چنانچہ مجوسیوں پر جزیہ مقرر کرنے کا مسئلہ بھی اوّل اسی مجلس میں پیش ہوا تھا۔ مورخ بلاذری نے اس مجلس کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا ہے۔

کان للمهاجرین مجلس فی المسجد فکان عمر یجلس معهم فیه
ویحدثهم عما ینتهی الیه من امر الآفاق فقال یومًا "ما ادری

کیف اصنع المجوس۔

حضرت عمرؓ کے دورِ خلافت میں مہاجرین پر مشتمل ایک مجلس مسجد نبوی میں تھی۔ حضرت عمرؓ ان کے ساتھ بیٹھتے اور سلطنت کے اطراف سے آنے والی خبروں پر گفتگو کرتے۔ ایک دن فرمایا: مجھے یہ سمجھ میں نہیں آرہا کہ مجوسیوں کے ساتھ کیسے معاملہ کیا جائے"

اس طرح کی مجلس کو ہم رئیس مملکت کے مشیروں کا نام دے سکتے ہیں۔

دوسری مجلس مہاجرین و انصار پر مشتمل تھی اور اس مجلس میں دونوں گروہوں کی موجودگی لازمی تھی۔ اس مجلس کے ارکان کی تعداد تو معلوم نہیں ہوسکی۔ البتہ چھ ارکان کا ذکر عام ملتا ہے جو مہاجرین سے تھے اور یہ وہی بزرگ ہیں جن کو حضرت عمرؓ نے خلافت کے لیے نامزد فرمایا تھا یعنی حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ، حضرت طلحہؓ، حضرت زبیرؓ، حضرت سعدؓ بن ابی وقاص اور حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف اور تین انصار کا نام بھی ملتا ہے۔ معاذ بن جبلؓ، ابی بن کعبؓ اور زید بن ثابتؓ۔

جب کوئی اہم معاملہ پیش ہوتا تو یہ اجلاس بلایا جاتا۔ اس کے انعقاد کا طریقہ یہ تھا کہ پہلے ایک منادی اعلان کرتا تھا کہ اَلصَّلٰوۃُ جَامِعَۃٌ یعنی سب لوگ نماز کے لیے جمع ہوجائیں۔ کیونکہ ان میں سے بعض ارکان مسجدِ نبوی سے دُور بھی رہائش پذیر تھے۔ جب یہ ارکان مسجد میں جمع ہوجاتے تو حضرت عمرؓ دو رکعت نماز پڑھاتے (جیسا کہ ہمارے ہاں تلاوت سے افتتاح ہوتا ہے) نماز کے بعد منبر پر بیٹھ کر خطبہ فرماتے اور بحث طلب مسئلہ پیش کیا جاتا۔

بعض دفعہ حضرت عمرؓ یوں بھی کرتے کہ پہلے ایک گروہ سے مشورہ کر لیا، پھر دوسرے سے جیسا کہ آپ نے طاعون زدہ علاقے شام میں داخل ہونے کے وقت کیا اور عراق کی زمینوں کا مسئلہ مہاجرین و انصار کے مشترکہ اجلاس میں پیش کیا گیا تھا۔ ایسی مجالس میں ہر شخص کو اختیار ہوتا تھا کہ وہ اپنی رائے کا اظہار پوری آزادی اور بے باکی سے کرے۔

ایسی مجلس کو ہم موجودہ اسمبلی کا نام دے سکتے ہیں۔

اور جب کوئی معاملہ اس مجلس میں بھی طے نہ ہو پاتا[1] تو پھر یہ مسئلہ اجلاسِ عام میں پیش کیا جاتا۔ معرکہ نہاوند میں حضرت عمرؓ کی بذاتِ خود روانگی کا مسئلہ بھی ایسا ہی تھا لیکن عام اجلاس کے باوجود یہ مسئلہ پھر بھی اہلِ شوریٰ کے رائے کے مطابق طے ہوا اور حضرت عمرؓ نے سپہ سالاری

---

[1] واضح رہے کہ یہاں طے ہونے سے مراد میرِ مجلس کا انشراحِ صدر یا قلبی اطمینان ہے جو محض آراء کی گنتی سے نہیں ہوتا۔ اور جب کوئی صورت نہ رہے تو پھر کثرتِ رائے کا سہارا لیا جاتا ہے۔

کا خیال ترک کر دیا۔ عراق کی مفتوحہ زمینوں کا معاملہ بھی اجلاسِ عام میں پیش ہوا لیکن پھر بھی یہ طے نہ ہو سکا۔ بالآخر حضرت عمرؓ کو قرآن کی آیت کا ایک حصّہ ایسا یاد آگیا جو اس مسئلہ میں نص قطعی کا درجہ رکھتا تھا۔ چنانچہ اسی کے مطابق حضرت عمرؓ نے فیصلہ دیا۔

اس طرح کی مجلس کو ہم استصواب عام کہہ سکتے ہیں۔ اس مجلس کے ارکان کی تقرری کی ضرورت نہیں ہوتی۔

ان مجالس میں گو آخری فیصلہ کا اختیار حضرت عمرؓ کو تھا مگر بحیثیتِ مشیر وہ بھی بالکل مساوی درجہ رکھتے تھے۔ آپ کا ارشاد ہے :

انی لم ازعجکم الا لان تشرکوا فی امانتی فیما حملت من امورکم فانی واحدٌ کاحدکم ولست ارید ان تتبعوا ھذا الذی ھو ھوای[1]۔

مَیں نے تمہیں اس لیے تکلیف دی ہے کہ تم میرے اس بارِ امانت میں شریک ہو جو تمہارے ہی امور کے متعلق ہیں۔ میں بھی تم جیسا ہی ایک فرد ہوں اور نہیں چاہتا کہ تم میری رائے یا خواہش کے پیچھے لگو۔

پہلے امیر ہو یا شوریٰ ؟

آج کل یہ سوال بڑی شدّ و مد سے اُٹھایا جا رہا ہے کہ موجودہ دَور میں نہ تو شوریٰ موجود ہے جو امیر کا انتخاب کرے اور نہ امیر موجود ہے جو شوریٰ کو منتخب کرے تو آغاز کار کہاں سے اور کیسے ہو؟ "پہلے انڈا یا مرغی"؟ والا معاملہ ہو تو کیا کیا جائے ؟

تو اس کا جواب یہ ہے کہ پہلے امیر ہونا چاہیئے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود شوریٰ کو منتخب فرمایا تھا۔ شوریٰ کے ارکان کے لیے ضروری ہے کہ تقویٰ کی بنیاد پر ان کی SELECTION ہو۔ امیر کے تقرر میں مشورہ اور انتخاب مستحسن ضرور ہے۔ لیکن لازمی نہیں۔ جیسا کہ ہم خلافت کے مباحث سے تفصیل سے ذکر کر چکے ہیں اور امیر کے لیے ایک مخصوص طرز انتخاب متعین نہ کرنے میں غالباً یہی شرعی حکمت تھی اور یہ بھی وضاحت کر چکے ہیں کہ ملتِ اسلامیہ کا اصل مقصد اسلامی نظامِ حیات کا قیام ہے۔ سربراہِ مملکت کا تقرر اصل مقصود نہیں۔ بلکہ اس کے حصول کا ذریعہ ہے۔ امیر کے انتخاب کے لیے شورائی صورت بہتر ضرور ہے۔ جب کہ اور بھی بہت سے طریقوں سے جواز ثابت ہے۔ ان باتوں سے ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں۔

---

[1] کتاب الخراج۔ امام ابو یوسف۔

کہ سربراہِ مملکت خواہ کسی بھی طریقہ سے برسر اقتدار آجائے اگر وہ اللہ تعالیٰ کی شریعت کے مطابق نظام بپا کرتا ہے تو اس کے تقرر کو چیلنج نہیں کیا جا سکتا۔ نہ اسے یہ طعنہ دیا جا سکتا ہے کہ وہ غیر آئینی طریقہ سے یا چور دروازے سے آیا ہے بلکہ اس کی اطاعت واجب و لازم ہو جاتی ہے۔ (تفصیل ملی وحدت" کے تحت ملاحظہ فرمائیے)۔

نظریۂ ضرورت اس کی تازہ مثال موجودہ حکومت اور صدر ضیاء الحق کا برسر اقتدار آنا" ہے۔ جس کو ہماری عدالت نے نظریہ ضرورت کے تحت جائز قرار دیا ہے۔

ہمارے خیال میں عدالت کا یہ فیصلہ شریعت کے عین مطابق ہے اور اس کی تائید درج ذیل حدیث سے بھی ہوتی ہے۔

عن انس ابن مالك قال : خطب رسول الله صلى الله عليه وسلم فقال "اخذ الراية زَيْدٌ فَأُصِيبَ، ثُمَّ اخذها جعفرٌ فاصيب، ثُمَّ اخذهٗ عبد الله ابن رواحة فاصيب، ثم اخذها خالد بن وليد عن غير إمرَةٍ ففتح عليه (بخاری. کتاب الجهاد والسير. باب من تَأمَّرَ فِي الحرب من غير امرَةٍ)

حضرت انس بن مالک کہتے ہیں: ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ سنایا اور فرمایا کہ (جنگ موتہ میں) سرداری کا جھنڈا زید بن حارثہؓ نے سنبھالا وہ شہید ہوئے، پھر جعفر بن ابی طالب نے سنبھالا وہ بھی شہید ہوئے، پھر عبداللہ بن رواحہ نے سنبھالا وہ بھی شہید ہوئے (ان تینوں کا حکم تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود یکے بعد دیگرے دیا تھا) پھر خالد بن ولید نے جھنڈا سنبھالا کہ ان کی سرداری کا حکم نہیں دیا گیا تھا (وہ آپ ہی ضرورت دیکھ کر سردار بن گئے) تو اللہ تعالیٰ نے ان کو فتح دی۔

لہٰذا اب اگلا مرحلہ یہ ہوگا اور اس بات کا امیر کو حق ہے ۔۔۔ کہ وہ اپنی شوریٰ کا انتخاب حسبِ دستور خود کرے۔ صوبائی گورنر اپنی شوریٰ کا انتخاب بھی اسی طرح کریں گے جس طرح ہائی کورٹ کے ججوں کا انتخاب مشورہ سے ہوتا ہے۔ جس کی تفصیل گزر چکی ہے۔

شوریٰ کا انتخاب کیسے ہو؟

ہمارے موجودہ جمہوری نظام میں سربراہِ مملکت عدلیہ اور انتظامیہ کی کلیدی اسامیوں

کے انتخاب خود کرتا ہے اور اس سلسلہ میں اسے وسیع اختیارات حاصل ہیں۔ مثلاً وہ پاکستان کی سپریم کورٹ کے چیف جسٹس کا تقرر خود کرتا ہے۔ پھر اس کے مشورہ سے دوسرے ججوں کا تقرر کرتا ہے۔ اسی طرح وہ سپریم کورٹ کے چیف جسٹس اور متعلقہ صوبہ کے گورنر کے مشورہ سے ہائی کورٹوں کے چیف جسٹس ـــــ پھر سپریم کورٹ کے چیف جسٹس، متعلقہ صوبہ کے گورنر اور متعلقہ ہائی کورٹ کے چیف جسٹس کے مشورہ سے ہائی کورٹ کے ججوں کا تقرر کرتا ہے۔ گویا متذکرہ افراد سے وہ صرف مشورہ کرنے کا پابند ہے اس مشورے کو قبول کرنے کا پابند نہیں۔ یعنی ان تقرریوں میں اسے وسیع اختیارات حاصل ہیں۔ وہ عارضی جج اور اٹارنی جنرل کا تقرر بھی کرتا ہے۔

یہ عدلیہ کی بات تھی۔ انتظامیہ میں اسے اس سے زیادہ وسیع اختیارات حاصل ہیں بیسیوں محکموں کے کلیدی مناصب، افواج پاکستان کے بڑے بڑے عہدہ دار اور بیرونی ممالک میں سفیروں کے تقرر تک کے اختیارات اسے حاصل ہیں۔ ان تقرریوں میں بھی وہ مشورہ کا پابند ضرور ہے۔ لیکن اس مشورے کو قبول کرنے کا پابند نہیں۔

ہمارے خیال میں جس طرح سربراہِ مملکت عدلیہ کے جج منتخب کرتا ہے۔ بعینہٖ اسی طرح اسے اپنی شوریٰ تشکیل دینی چاہیئے۔ اس مقصد کے لیے سب سے پہلے صرف ایک نہایت متقی اور عالم شخص کا انتخاب کرنا چاہیئے پھر صدر اس کے مشورے سے حسبِ ضرورت جتنے افراد مجلسِ شوریٰ میں شامل کرنا چاہتا ہے منتخب کرلے۔ اس مجلسِ شوریٰ میں ماہرینِ فن بھی حسبِ ضرورت شامل کیے جاسکتے ہیں۔ جو کم از کم مسلمانی کی شرط ضرور پوری کرتے ہوں۔

موجودہ جمہوری نظامِ حکومت میں عدلیہ اور انتظامیہ کے بڑے بڑے عہدوں کا تقرر خود صدرِ مملکت کرتا ہے لیکن مقننہ حق بالغ رائے دہی (بشمول خواتین) کی بنیاد پر نیز ووٹ کی برابر قیمت تصور کرتے ہوئے ـــــ کثرت رائے کے اصُول پر عوام منتخب کرتے ہیں۔ لیکن نظامِ خلافت میں ان تینوں شعبوں کے اولی الامر خلیفہ کی مرضی کے مطابق مقرر کیے جاتے ہیں۔ امیر متعلقہ افراد سے مشورہ کرنے کا پابند ضرور ہے مگر اسے قبول کرنے کا پابند نہیں البتہ نظامِ خلافت میں کسی خاص علاقہ کے لوگ ولی امر انتخاب کرکے اس کی سفارش کرسکتے ہیں۔ اسی طرح اہلِ علاقہ کی شکایت پر کسی حاکم کو معزول بھی کیا جاسکتا ہے بشرطیکہ یہ سفارش یا شکایت صحیح معیار پر پوری اُترتی ہو۔

ربطِ ملّت کے تقاضے

اور نظامِ خلافت کی طرف پیش رفت

ہم پہلے بتلا چکے ہیں کہ دینِ اسلام اپنے پیروکاروں سے اتفاق واتحاد کا تقاضا کرتا ہے اور اس میں تفرقہ وانتشار کو کفر کے مترادف قرار دیا گیا ہے ملی وحدت کے بقا کے سلسلہ میں ہم بہت سی آیات واحادیث درج کر چکے ہیں۔

اور یہ بھی بتلا چکے ہیں کہ ملّتِ اسلامیہ کسی مخصوص علاقہ یا قوم یا نسل کی پابند نہیں ہوتی۔ آج کل ریاست کا تصور — جس کا ایک لازمی عنصر علاقہ بھی ہوتا ہے — اسلام میں مفقود ہے۔ کیونکہ یہ عالمگیریت کا متقاضی ہے۔ اس کے احکام اللہ رب العالمین کے نازل کردہ ہیں جس کی نظر کسی ایک قوم یا علاقہ کے مفادات پر نہیں۔ بلکہ اس کی نظر میں پوری دنیا کی یکساں فلاح وبہبود ہے۔ علامہ اقبال کے الفاظ میں ؎

عقلِ خود بیں غافل از بہبودِ غیر — سودِ خود بیند نہ بیند سودِ غیر
وحیِ حق بینندۂ سودِ ہمہ — در نگاہش سود وبہبود ہمہ

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم صرف عرب کے لیے نہیں تمام دنیا کے لیے مبعوث ہوئے تھے۔ ارشادِ باری ہے:

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا (۳۴/۲۸)

اے رسولؐ! ہم نے تجھے تمام عالمِ انسانیت کے لیے نذیر اور بشیر بنا کر بھیجا ہے۔

اور آپؐ کا لایا ہوا پیغام (قرآن کریم) بھی تمام دنیا کے لیے ہے جو یاایھا الناس کے الفاظ سے دنیا بھر کے لوگوں کو خطاب کرتا ہے۔

هٰذَا بَصَآئِرُ لِلنَّاسِ۔ (۴۵/۲۰)

یہ (قرآن) تمام لوگوں کے لیے دانائی کی باتیں ہیں۔

اسی طرح اس اُمت کا مرکز بھی دنیا بھر کے انسانوں کے لیے ہے۔

اِنَّ اَوَّلَ بَيْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِيْ بِبَكَّةَ مُبٰرَكًا وَّهُدًى لِّلْعٰلَمِيْنَ (۳/۹۶)

پہلا گھر جو لوگوں (کے عبادت کرنے) کے لیے مقرر کیا گیا تھا وہی ہے، جو مکہ میں ہے۔

بابرکت اور جہان کے لیے موجبِ ہدایت ہے۔

اسی طرح اُمت مسلمہ کو، جو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر سے مامور ہے۔ دنیا بھر کے انسانوں کے اعمال پر نگرانی کی ذمہ داری سونپی گئی ہے۔ ارشاد باری ہے۔

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ (۳: ۱۰۹)

تم بہترین امت ہو جو لوگوں کے لیے بھیجی گئی۔ تم (لوگوں کو) نیکی کا حکم دیتے اور بری باتوں سے روکتے ہو۔

تفرقہ کی اقسام

یہ ہے ملت اسلامیہ کا صحیح تصور۔ ایسی ہی اُمت حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تشکیل فرمائی تھی جس میں حبشی، رومی، فارسی، عربی سب ہم مرتبہ تھے۔ اگر کسی کو تفوق اور فضیلت تھی تو محض تقویٰ کی بنیاد پر تھی۔ لیکن آج اس اُمت میں وحدت نام کی کوئی چیز باقی نہیں رہی۔ اور کئی قسم کے تفرقہ و انتشار کا شکار رہے۔ اس وحدت پر سب سے زیادہ کاری ضرب قوم و وطن کے موجودہ نظریہ نے لگائی ہے۔ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ حجۃ الوداع میں بڑے واضح الفاظ میں فرمایا تھا۔

"لوگو! بے شک تمھارا رب ایک ہے اور تمھارا باپ ایک ہے۔ عربی کو عجمی پر اور عجمی کو عربی پر، سرخ کو سیاہ پر اور سیاہ کو سرخ پر کوئی فضیلت نہیں۔ برتری صرف تقویٰ کے سبب سے ہے۔ تم سب آدم کی اولاد ہو اور آدم مٹی سے پیدا کیے گئے تھے۔"

وطن کے اختلاف کی بنیاد پر جُداگانہ قوموں کی تشکیل یورپ کی پیدا کردہ لعنت ہے۔ وطن پرستی اور قومیت پرستی آج کے سب سے بڑے معبود ہیں۔ جنھوں نے مسلمانوں کو بیسیوں ممالک میں تقسیم کر کے ذلیل و خوار کیا اور تباہی و بربادی کے جہنم میں دھکیل دیا ہے۔

دوسری لعنت کسی قوم میں ــــ ملت نہیں بلکہ قوم میں ــــ سیاسی پارٹیوں کا وجود ہے جو موجودہ جمہوریت کا عطا کردہ تحفہ ہے اور جس کے بغیر جمہوریت زندہ نہیں رہ سکتی۔ اسی جمہوریت کو ہم سینہ سے لگائے ہوئے ہیں اور کسی قیمت پر اسے جُدا کرنے پر آمادہ نہیں۔ پاکستان میں موجودہ مارشل لاء کے نفاذ سے پیشتر ان کی تعداد ایک سو سے تجاوز کر گئی تھی۔ ظاہر ہے کہ ایسے حالات میں ملت کی وحدت کا تصور بھی ناممکن ہے۔

تیسری لعنت وہ مذہبی فرقے ہیں جو اپنی الگ الگ فقہ کو سینے سے چمٹائے ہوئے ہیں اس بات پر مصُر ہیں کہ

كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ (۳۰/۳۲)

سب فرقے اسی سے خوش ہیں جو ان کے پاس ہے۔

کے مصداق جو کچھ ان کے پاس ہے بس وہی ٹھیک ہے۔ باقی سب غلط ہیں۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ قرآن تو سب کا ایک ہے۔ اور سنت بھی ایک ہے لیکن فقہ چار ہیں۔ بلکہ اگر شیعہ حضرات کی فقہ جعفریہ بھی شامل کرلیں تو پانچ ہیں جس کا واضح مطلب یہ ہے کہ کوئی بھی فقہ دین کا حصہ نہیں ہے۔ اور نہ ہی کسی ایک مخصوص فقہ پر اصرار کرنا واجب ہے اس سے دوسرا نتیجہ یہ بھی نکلتا ہے کہ اگر پہلے ۵ فقہ موجود ہیں تو اب موجودہ زمانہ کے تقاضوں کو مدِنظر رکھتے ہوئے چھٹی فقہ بھی اگر مرتب کرلی جائے تو اس میں کوئی ہرج نہیں ہے۔ اس کا دوسرا حل یہ بھی ہے کہ ایسے فروعی مسائل، جن میں ہر فریق کے پاس اولہ شرعیہ موجود ہوں۔ جیسے حنفی، شافعی وغیرہ کے مختلف فیہ مسائل) ان میں سے کسی ایک جانب کو جو سنت سے قریب تر ہو اگر امیر یا خلیفہ متعین کرکے لوگوں کو اس پر عمل کرنے کا حکم دے تو ان کا فرض ہوگا کہ اس کا اتباع کریں اگرچہ بحیثیت حنفیت یا شافعیت اس کے مذہب کے خلاف ہو۔

ملکی تفریق اور اس کا حل

موجودہ دور میں ربط ملت کا تقاضا یہ ہے کہ تمام مسلم ممالک کسی ایک ملک کے سربراہ کو ـــــ جو خلیفہ کے زیادہ سے زیادہ اوصاف سے متصف ہو ـــــ اپنا سربراہ تسلیم کرلیں۔ اور ہمارا خیال یہ ہے کہ یہ سعادت سعودی عرب کے حصہ میں آنی چاہیئے کیونکہ اتحاد بین المسلمین میں وہ پیش پیش ہونے کے علاوہ کافی ایثار سے کام لے رہا ہے۔ مسلمانوں کا بین الاقوامی مرکز بھی وہیں ہے اور دوسرے ممالک سے نسبتاً وہی زیادہ شریعت کے احکام کا پاسبان بھی ہے۔ اگر مسلمان ممالک کے سربراہ یا ان میں سے چند ایک بھی ایثار کی مثال پیش کرتے ہوئے اسے اپنا سربراہ تسلیم کرلیں تو ربطِ ملت کی داغ بیل پڑ سکتی ہے۔

گو موجودہ دور کی دو سپر طاقتوں ـــــ امریکہ اور روس ـــــ کی اسلام دشمنی اور معاندانہ سرگرمیوں نے مسلمان ممالک کو یہ سوچنے پر مجبور کر دیا ہے کہ اگر مسلمان زندہ رہنا چاہتا ہے تو اس کی صورت صرف ان کا آپس میں اتحاد و اتفاق ہے۔ تاہم مسلمانوں کی یہ سوچ ابھی مشترکہ تجارت اور مشترکہ دفاع وغیرہ جیسے مسائل تک محدود ہے۔ گو ایسا اتحاد بھی ایک نیک فال ہے۔ تاہم یہ ربط ملت اور ملی وحدت کے تقاضے پورے نہیں کرتا اور وہ صرف اس صورت میں پورے ہو سکتے ہیں جب کہ یہ اتحاد و اتفاق محض اللہ کی خوشنودی اور اللہ کے دین کی سربلندی کے لیے ہو۔ دنیوی

مفادات کی حیثیت اس میں ثانوی حیثیت رکھتی ہو۔

اگر مسلمان قوم کی خوش نصیبی اور اللہ کی مہربانی سے ایسے حالات پیدا ہو جائیں تو منسلکہ ممالک کے سربراہ ــــ یا جنھیں وہ منتخب کریں شوریٰ کے ممبر قرار پائیں گے۔ شوریٰ کے ممبروں کے لیے علاقائی تقسیم مناسب نہ ہوگی بلکہ اہل شوریٰ کے اوصاف سے متصف افراد کسی ملک سے ایک سے زیادہ بھی منتخب کیے جا سکتے ہیں اور یہ بھی ممکن ہے کہ کسی ملک سے ایسا کوئی نمائندہ نہ جا سکے اور یہ سب کچھ اللہ کی رضامندی کے لیے ہونا چاہیئے۔ بطور حق کے نہیں بلکہ بطور ذمہ داری ادائیگی کے یہ کام سرانجام دینے چاہئیں۔

اللہ کے فضل و کرم سے مسلمان ممالک کے پاس ہر طرح کے وافر وسائل موجود ہیں۔ کسی کے پاس دولت ہے کسی کے پاس افرادی اور عسکری قوت تو کسی کے پاس سائنس اور ٹیکنالوجی کے معتدبہ وسائل موجود ہیں۔ اگر ایسا وفاق عمل میں آجائے تو مسلمان قوم دُنیا کی سپر طاقت بن کر اسلام کو سربلند کر کے یہ تقاضا پُورا کر سکتی ہے۔

هُوَ الَّذِیٓ اَرۡسَلَ رَسُوۡلَهٗ بِالۡهُدٰی وَدِیۡنِ الۡحَقِّ لِیُظۡهِرَهٗ عَلَی الدِّیۡنِ کُلِّهٖ وَلَوۡ کَرِهَ الۡکٰفِرُوۡنَ۔ (۹/۳۳)

وہی تو ہے جس نے اپنے پیغمبر کو ہدایت اور دینِ حق دے کر بھیجا تاکہ اس دین کو (دنیا کے) تمام دینوں پر غالب کر دے اگرچہ کافر ناخوش ہی ہوں۔

پاکستان آج کل جن حالات سے دوچار ہے اور جس سطح پر کھڑا ہے اس کے لیے تو اور بھی ضروری ہے کہ ایسے الحاق کی جلد از جلد کوشش کرے اور دوسرے ممالک کو اس کی زیادہ سے زیادہ ترغیب دے۔ اس سے پاکستان کے بیشتر مسائل ـ بالخصوص نظام اسلامی کی ترویج۔ معاشی مسائل اور اسلام کی سربلندی۔ بطریقِ احسن حل ہو سکتے ہیں۔

سیاسی تفریق اور اس کا حل

ربط ملت کے لیے اندرون ملک کام کرنے کے یہ ہیں کہ مغربی طرزِ انتخاب کا سلسلہ یکسر بند کر دیا جائے۔ اور سیاسی پارٹیوں کو ختم کر دیا جائے۔ یہ غیر اسلامی فعل اسلام کے راستہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ ۱۹۷۳ء کے آئین کو یکسر منسوخ کر دیا جائے۔ یہ آئین کوئی خدا کا نازل کردہ آئین نہیں ہے جس پر منتخبہ پارلیمنٹ جیسے غیر اسلامی ادارے کے بغیر کسی کو ترمیم و تنسیخ کا اختیار نہ ہو۔

ہم بہ دلائل یہ ثابت کر چکے ہیں کہ شوریٰ سے زیادہ اہم معاملہ امیر کا تقرر ہے۔ امیر اگر

شوریٰ کے ذریعے منتخب ہوا ہو تو بہتر ہے ورنہ کسی بھی طریقہ سے کوئی شخص اقتدار حاصل کرلیتا ہے تو اگر وہ اسلامی نظام کا نفاذ کرتا ہے تو وہ امیر برحق ہے۔اس کی اطاعت واجب و لازم ہے۔ اس کے تقرر کو چیلنج کرنا اور اس کی آئینی حیثیت کو زیر بحث لانا جمہوریت پرستوں کا کام تو ہو سکتا ہے اسلام میں اس کی کوئی گنجائش نہیں۔

شوریٰ کی تشکیل اور اس کے فرائض

سربراہِ مملکت کے لیے لازم ہے کہ وہ موجودہ پارلیمنٹ کی جگہ اپنے لیے شوریٰ کے ممبروں کا انتخاب کرے۔اور اس کی صورت بالکل ویسی ہوگی جیسے وہ سپریم کورٹ کے جج اور ہائی کورٹ کے ججوں کے باہم مشورے سے انتخاب کرتا ہے۔ایسے انتخاب میں مختلف علاقوں کے علمائے حق کے مشورہ اور رائے سے بھی استفادہ کرنا چاہیئے۔مجلسِ شوریٰ میں مختلف فنون کے ماہرین کی شمولیت بھی ضروری ہے تاکہ انتظامی امُور میں مشورہ کے وقت ان کے علم اور تجربہ سے فائدہ اٹھایا جا سکے۔ایسے مشیروں کی تعداد کا تعین ملکی ضروریات کے پیشِ نظر جتنی سربراہِ مملکت مناسب تصوّر کرے مقرر کرنی چاہیئے۔

صوبائی گورنر اسی طریق پر اپنی الگ مجلسِ شوریٰ منتخب کرسکتے ہیں۔

اگر سربراہِ مملکت زمانہ کے تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے مناسب سمجھے تو خواتین کا ایک الگ نمائندہ ادارہ بھی قائم کیا جا سکتا ہے جو ملک بھر کی چند نمائندہ خواتین پر مشتمل ہو اور جس کا اہم فریضہ خواتین سے متعلقہ قانون سازی میں مشورے دینا ہو۔اس طرح ایک طرف تو خواتین کو ملکی سیاسیات میں عملی طور پر ملوث کرکے اصل ذمہ داریوں سے ان کی توجہ ہٹانے کی ضرورت باقی نہ رہے گی اور دوسری طرف شوریٰ خواتین کے مسائل سے صرفِ نظر نہ کرسکے گی۔

مجلسِ شوریٰ کے فرائض یہ ہوں گے :۔

۱۔ جن معاملات میں نص موجود ہے اس میں اگرچہ شوریٰ کوئی ردوبدل نہیں کرسکتی تاہم ان کے نفاذ کے لیے ضروری قواعد وضوابط مقرر کرے گی۔

۲۔ جن احکام میں کتاب وسنت کے احکام کی ایک سے زیادہ تعبیریں ممکن ہوں۔ان میں سے اس تعبیر کو قانونی شکل دینا جو کتاب وسُنّت سے قریب تر ہو۔

۳۔ جن معاملات میں احکام موجود نہ ہوں تو اسلام کے مزاج کے مطابق نئے قوانین وضع کرنا یا پہلے سے موجود فقہی قوانین میں سے کسی ایک کو اختیار کرکے اسے قانونی

تشکل دینا۔

۴۔ جن معاملات میں قطعاً کوئی اصولی رہنمائی نہ ملتی ہو توان کے متعلق شوریٰ مناسب قوانین بنا سکتی ہے بشرطیکہ وہ کسی شرعی حکم یا اصول سے متصادم نہ ہوں۔ اور

۵۔ اگر شوریٰ مناسب سمجھے تو پاکستان کے آئین کو ازسر نو کتاب وسنت کی روشنی میں مرتب کرے۔

مندرجہ بالا دفعات اس بات کی متقاضی ہیں کہ اہل شوریٰ کا صاحب علم وبصیرت اور متقی ہونا اشد ضروری ہے ورنہ ان کے غلط فیصلے شریعت کو مسخ کر سکتے ہیں۔

پھر جس طرح شوریٰ کے ممبروں کا عالم دین اور متقی ہونا ضروری ہے۔ اسی طرح انتظامیہ اور عدلیہ کے کلیدی مناصب کے لیے بھی یہ اوصاف ضروری ہیں۔ ان اسامیوں کو کسی غیر مسلم کے حوالے قطعاً نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ جو لوگ اسلامی نظریہ حیات پر ایمان نہیں رکھتے یا اس کے نفاذ میں کوشش نہیں کرتے وہ یقیناً اس کے نفاذ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہوں گے۔ جیسا کہ آج کل ہماری بیوروکریسی کا شیوہ ہے۔ لہٰذا ان کلیدی مناصب کی بتدریج تطہیر اشد ضروری ہے۔ ورنہ شوریٰ کی کارکردگی بھی مؤثر نتائج پیدا نہ کر سکے گی۔

عدلیہ کا دائرۂ کار نظامِ خلافت میں عدلیہ کا کام قانونِ شریعت کا نفاذ ہے۔ وہ انتظامیہ اور مقننہ کے دباؤ سے آزاد ہوتی ہے۔ گو قاضی القضاۃ اور دیگر قاضیوں کا تقرر امیر کرتا ہے۔ لیکن اس کے بعد امیر کو کوئی حق نہیں کہ وہ عدلیہ کے فیصلوں پر اثرانداز ہو۔ امیر کے خلاف عدالت میں دعویٰ بھی دائر کیا جا سکتا ہے اور اسے ایک عام شہری کی طرح عدالت کی طلبی پر عدالت میں حاضر ہونا اور جوابدہ ہونا پڑتا ہے۔ عدلیہ کی ایسی آزادی کی مثال انسان کے وضع کردہ کسی نظام میں بھی نہیں مل سکتی۔ اب سوال یہ ہے کہ آیا عدلیہ شوریٰ کے کسی طے شدہ قانونی مسئلہ کو اس بنا پر رد کر سکتی ہے کہ وہ کتاب وسنت کے خلاف ہے؟ خلافتِ راشدہ میں ایسی کوئی مثال نہیں ملتی۔ ہمارے خیال میں عدلیہ کو یہ اختیار تو ہو سکتا ہے کہ وہ ایسے قانونی مسئلہ کے خلاف آواز اُٹھائے لیکن اسے رد نہیں کرنا چاہیئے کیونکہ اس کام کے لیے ایک مستقل ادارہ (شوریٰ) موجود ہے۔ جس کے ارکان علم وتقویٰ کے لحاظ سے عدلیہ کے ارکان سے کسی طرح کم نہیں ہوتے۔

مذہبی تفریق اور اس کا حل

مذہبی فرقوں کی تفریق سے چھٹکارا حاصل کرنے کی واحد صورت یہ ہے کہ اصل ماخذ قرآن وسنت ہی قرار دیا جائے۔ اور فقہ کی تمام کتابوں سے نظائر کی حیثیت سے استفادہ کیا جائے۔ اگر ممکن ہو تو شوریٰ سابقہ تمام کتب فقہ کو سامنے رکھ کر موجودہ تقاضوں کے پیش نظر نئی فقہ کی تدوین کرے اور جب تک یہ صورت ممکن نہ ہو دو صورتیں اختیار کی جا سکتی ہیں۔

۱۔ عدالتیں پرسنل لاء کو ملحوظ رکھ کر مقدمات کے فیصلے کریں۔ فریقین جس فقہ کے پیروکار ہوں اسی کے مطابق ان کے مقدمات وخصومات کا فیصلہ کر دیا کریں۔

۲۔ اور دوسری وہی صورت ہے جس کی طرف ہم پہلے اشارہ کر آئے ہیں کہ ایسے فروعی مسائل جن میں ہر فریق کے پاس ادلہ شرعیہ موجود ہوں (جیسے حنفیہ، شافعیہ کے مختلف فیہ مسائل) ان میں سے کسی ایک جانب جو سنت سے قریب تر ہو اگر امیر یا خلیفہ متعین کر کے لوگوں کو اس پر عمل کرنے کا حکم دے تو ان کا فرض ہوگا کہ وہ اس کی اتباع کریں۔ اگرچہ بحیثیت حنفیت یا شافعیت اس کے مذہب کے خلاف ہو۔

اور ہم یہ سمجھتے ہیں کہ فروعی اختلاف کو ہوا دینے والا علمائے سوء کا وہ گروہ ہے جس کا روزگار ان مسائل سے وابستہ ہے۔ اور لاؤڈ سپیکر کا بے محابا استعمال اس تفرقہ بازی کے فروغ میں بہت ممد ثابت ہوتا ہے۔ لہٰذا لاؤڈ سپیکر کے آزادانہ استعمال پر پابندی بہت ضروری ہے۔ نیز اگر علماء اور آئمہ مساجد کی کفالت کی ذمہ داری حکومت لے لے۔ جس طرح کہ سعودی عرب میں ہے۔ تو یہ تفرقہ وانتشار کی فضا بہت حد تک کم کی جا سکتی ہے۔ بعد ازاں مختلف مذاہب کے مقتدر علماء کی مشترکہ مجلسوں میں ان اختلافات کو زیر بحث لا کر اور بھی کم کیا جا سکتا ہے۔

ضمیمہ

طرزِ حکومت پر

اسلامی نظریاتی کونسل کے سوالنامہ کا جواب!

نو تشکیل شدہ اسلامی نظریاتی کونسل نے صدرِ مملکت کے استصواب پر مورخہ ۱۳/ جون ۱۹۸۱ء کو "اسلامی نظامِ مملکت متعلقہ عام انتخابات" پر غور کیا اور اس سلسلے میں وقتاً فوقتاً کونسل کے جو اجلاس منعقد ہوئے، ان میں اس موضوع پر تفصیلی اظہارِ خیال کے بعد بعض مقدمات بطور راہنما اصول طے کیے گئے ـــــ بعد ازاں اس سلسلہ میں حسب ذیل سوالات مرتب کیے گئے:

۱۔ اس وقت بالغ رائے دہی کی جو صورت دُنیا میں رائج ہے، اسلامی نقطۂ نظر سے قابلِ قبول ہے یا نہیں؟

۲۔ کیا غیر مسلموں پر بھی اس کا اطلاق ہوگا؟

۳۔ کیا عورتوں پر بھی اطلاق ہوگا؟

۴۔ از روئے اسلام عام حقِ رائے دہی پر کوئی پابندی عائد کی جاسکتی ہے یا نہیں؟

۵۔ اگر پابندی عائد کی جاسکتی ہے تو وہ کیا پابندیاں ہوں گی؟

۶۔ منتخب کیے جانے والے افراد، اربابِ حل وعقد کے اوصاف اور شرائطِ اہلیت کیا ہوں گے؟

۷۔ رئیسِ مملکت کا طریقۂ انتخاب کیا ہوگا؟

مندرجہ بالا سوالات پر غور کرنے کے بعد موضوع سے متعلق عام بحث کے دوران حسب ذیل اکیس نکات مرتب کیے گئے۔

۱۔ اسلامی ریاست کی غرض وغایت اور اس کے مقاصد

۲- بالغ رائے دہی
۳- ووٹر رائے دہندگان کی عمر
۴- عورتوں کا حق رائے دہی
۵- غیر مسلموں کا حق رائے دہی
۶- مجلسِ شوریٰ کی حیثیت
۷- شرائطِ اہلیت مجلسِ شوریٰ
۸- پارٹی سسٹم اور انتخابات
۹- یک ایوانی مقننہ یا دو ایوانی مقننہ؟
۱۰- شرائط اہلیتِ صدر
۱۱- صدر کا انتخاب براہِ راست یا بالواسطہ؟
۱۲- شرائط نمائندگان
۱۳- شرائط رائے دہندگان
۱۴- نمائندگان کی عمر
۱۵- جداگانہ انتخاب
۱۶- انتخابی کالج (علاقہ واری، پیشہ ورانہ حلقہ رائے دہی)
۱۷- کیا صدر شوریٰ کے فیصلوں کا پابند ہوگا؟
۱۸- کیا صدر کی نامزدگی برائے انتخاب کے لیے کوئی ادارہ مختص کیا جائے؟
۱۹- صدر کا انتخاب ایک مخصوص مدت کے لیے ہوگا یا تاحیات؟
۲۰- نامزدگی صدر کے بعد انتخاب کا اختیار ایوان ہائے مرکزی و صوبائی کو ہوگا یا براہِ راست عوام کو ہوگا؟
۲۱- امیدوار کا خود کو اپنے آپ کو پیش کر کے اپنے لیے کنویسنگ کرنا۔

کونسل اپنی حد تک ان نکات پر غور و خوض کر چکی تھی، جن کو رپورٹ کی شکل میں مرتب کر کے دسمبر ۱۹۸۱ئہ میں پیش کرنا طے کیا گیا تھا کہ مورخہ ۱۲ نومبر ۱۹۸۱ئہ کو صدر صاحب نے کونسل کے ممبران سے خطاب کرتے ہوئے کونسل کو ہدایت کی کہ وہ اس مسئلہ میں اپنی سفارشات کو آخری شکل دینے سے پہلے ماہرین آئین، دانشور اور علماء حضرات

سے بھی مشورہ کرے۔

چنانچہ کونسل نے اس سلسلہ میں علماء سے رابطہ قائم کیا اور ان کو یہ سوالنامہ مع نکات، پہنچانے کے ساتھ ساتھ ان سے یہ درخواست بھی کی کہ وُہ اس سلسلہ میں اپنی رائے کونسل کو ۱۲ جنوری ۱۹۸۲ء تک پہنچا دیں۔

یہ سوالنامہ ادارہ "محدث" کو بھی موصول ہُوا تھا، جس کے جواب میں مشہور محقق، اہلِ قلم مولانا عبدالرحمٰن کیلانی نے ان نکات پر کتاب وسنت کی روشنی میں انتہائی مفید اور سیر حاصل بحث کی —— ہم نے یہ مسودہ کونسل کو اس کی متعینہ تاریخ تک روانہ کر دیا تھا۔ اور اب قارئین کے استفادہ کے لیے انہیں "محدث" کے زیرِ نظر کے صفحات میں بھی جگہ دے رہے ہیں —— فالحمد للہ علی ذٰلک!

واضح رہے کہ یہ جوابات کتاب وسنت ہی کی روشنی میں لکھنے کی ہدایت کی گئی تھی! —————— (ادارہ)

(۱) اسلامی ریاست کی غرض وغایت اور اس کے مقاصد

اسلام میں سیاسی تنظیم ایک اخلاقی بنیاد رکھتی ہے۔ یہاں ریاست کا قیام اصل مقصود نہیں بلکہ یہ کسی دوسرے عظیم مقصد کے حصول کا ذریعہ ہے مثلاً ایک غیر اسلامی ریاست کے قیام کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ پولیس اور عدالت کے ذریعہ امن بحال رکھا جائے، انتظامیہ کے ذریعہ کاروبارِ حکومت چلایا جائے اور فوج کے ذریعہ سرحدوں کی حفاظت کی جائے۔ ایک اسلامی ریاست یہ تمام ذمہ داریاں بھی پُوری کرتی ہے اور یہ اس کا ثانوی فریضہ ہے، اس کے قیام کے اولین مقاصد یہ ہیں:

"اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّکَّنّٰھُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ وَ اَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَ نَھَوْا عَنِ الْمُنْکَرِ" (الحج ۴۱)

"وُہ لوگ کہ جب ہم انہیں زمین میں حکومت عطا کریں تو وُہ نماز قائم کرتے، زکوٰۃ ادا کرتے، نیک کاموں کا حکم کرتے اور بُرے کاموں سے روکتے ہیں۔"

مندرجہ بالا ارشادِ ربانی میں نظامِ صلوٰۃ کو معاشرہ میں تقویٰ پیدا کرنے کے لیے، زکوٰۃ کو معاشی ناہمواریاں دُور کرنے کے لیے، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو معاشرہ سے فحاشی ختم کرنے امن اور نظامِ عدل قائم کرنے، نیز معاشرہ کو اخلاقی بنیادوں پر استوار کرنے کے لیے تجویز فرمایا گیا ہے۔

اب بعض دوسرے احکامِ قرآنی بھی ملحوظ رکھے جائیں تو مختصراً ایک اسلامی ریاست کے اغراض و مقصد مندرجہ ذیل سامنے آتے ہیں :

۱۔ نماز اور زکوٰۃ کا نظام نافذ کیا جائے۔

۲۔ ملک سے ظلم و جور ختم کر کے اسلامی عدل و انصاف قائم کیا جائے۔

۳۔ فحاشی، بے حیائی اور بیہودہ کاموں کی روک تھام کی جائے۔

۴۔ اور جو باتیں اس نظام میں رکاوٹ کا سبب بنتی ہیں ان کو دُور کیا جاتے اور اسی کا نام جہاد ہے۔

۵۔ اسلام کے پیغام کو دوسروں تک پہنچا کر انسانیت کی تعمیر اور عالمی نظامِ امن کے لیے تگ و دو کی جائے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام نے حکومت کے انتظام و انصرام کو وُہ اہمیت نہیں دی جو اخلاقی اقدار کو دی ہے۔ یہی اخلاقی بنیاد اسلامی طرزِ حکومت کو دُوسری تمام اقسامِ حکومت سے ممتاز کرتی ہے۔ بالفاظِ دیگر جو ریاست مندرجہ بالا امور کو بروئے کار نہیں لاتی۔ وُہ اگرچہ نام کے لحاظ سے اسلامی ہو، وُہ اسلامی کہلانے کے مستحق نہیں ہوتی۔

۲۔ بالغ رائے دہی

اسلامی نقطۂ نظر سے بالغ رائے دہی کا تصور موجودہ جمہوری تصور سے یکسر مختلف ہے۔ اس اختلاف کے مختلف پہلو درج ذیل ہیں :

ووٹ حق ہے یا ذمہ داری؟

موجودہ تصور کے لحاظ سے ووٹ ایک حق ہے جسے آدمی جس طرح چاہے استعمال کر سکتا ہے۔ کسی دوسرے کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وُہ اس حقدار سے یہ پوچھے کہ تم نے اس حق کو کس چیز کی بنیاد قرار دے کر استعمال کیا؟ مثلاً کسی حلقہ میں دس امیدوار کھڑے ہیں۔ ایک ووٹر اپنی مرضی سے کسی ایک نمائندہ کو اپنا ووٹ دے دیتا ہے تو کوئی شخص اس سے یہ نہیں پوچھ سکتا کہ اس نے اپنا ووٹ اسے کیوں دیا ہے لیکن اسلام اس رائے دہی کو ایک ذمہ داری قرار دیتا ہے۔ نمائندہ کی اہلیت و صلاحیت بتلا کر ووٹر سے مطالبہ کرتا ہے کہ جس شخص میں وُہ دیانتداری سے یہ یہ صفات دیکھے اور ان صفات میں وُہ دوسروں سے آگے ہو صرف اسے ہی ووٹ دیا جائے۔ ارشادِ باری ہے :

"اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُکُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰۤی اَھْلِھَا" (النساء : ۵۸)

"اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ امانتیں اس کے مستحق کے حوالے کرو۔"

اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"اَلْمُسْتَشَارُ مُؤْتَمَنٌ" (متفق علیہ)

"جس سے مشورہ طلب کیا جائے اسے امانتداری سے مشورہ دینا چاہیے"

ووٹر کی حیثیت بھی مستشار کی ہوتی ہے۔ وہ کسی ایک نمائندہ کو ووٹ دے کر اس بات کی عملی شہادت پیش کرتا ہے کہ واقعی وہی شخص اس امانت کی سپردگی کا اہل تھا۔ چونکہ اس لحاظ سے ووٹر کی دیانت کا امتحان ہوتا ہے لہٰذا یہ حق نہیں بلکہ ایک بھاری ذمہ داری بن جاتی ہے۔

۲۔ ہر ووٹ کی یکساں قیمت:

موجودہ تصور رائے دہی میں ہر رائے کی قیمت یکساں قرار دی گئی ہے۔ یہ نظریہ بھی اسلامی نقطہ نظر سے باطل ہے۔ ارشادِ باری ہے:

"هَلْ يَسْتَوِي الَّذِينَ يَعْلَمُونَ وَالَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ" (الزمر: ۹)

"کیا عالم اور جاہل برابر ہو سکتے ہیں؟"

دوسرے مقام پر فرمایا:

"هَلْ يَسْتَوِي الْأَعْمَىٰ وَالْبَصِيرُ۔" (الرعد: ۱۶)

"کیا نابینا اور بینا برابر ہیں؟"

اور رسولِ اکرمؐ نے جنگِ بدر کے قیدیوں کے متعلق جب مجلس مشاورت قائم کی کہ ان کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے تو حضرت ابوبکرؓ کی رائے یہ تھی کہ انہیں فدیہ لے کر چھوڑ دیا جائے، اور اکثر صحابہؓ حضرت ابوبکرؓ کے ہمنوا تھے۔ حضرت عمرؓ نے اس رائے سے اختلاف کیا اور کہا کہ میری رائے یہ ہے کہ ان سب کو تہ تیغ کر دیا جائے۔ چند صحابہ اس رائے کے بھی ہمنوا تھے۔ خود رسولِ اکرمؐ کی رائے بھی وُہی تھی جو حضرت ابوبکرؓ کی تھی لیکن اس کے باوجود آپؐ نے حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کو مخاطب کر کے فرمایا:

"لَوِ اجْتَمَعْتُمَا مَا عَصَيْتُكُمَا۔" (درمنثور ج ۳ ص ۲۰۲)

"اگر تم دونوں اس رائے پر متفق ہو جاتے تو میں اس کے خلاف نہ کرتا۔"

اس سے واضح ہوتا ہے کہ رسولِ اکرمؐ کی نظر میں ان دو اصحابؓ کی رائے باقی صحابہؓ کے مقابلہ میں زیادہ قدر و قیمت رکھتی تھی۔

۳۔ ہر بالغ کا حق رائے دہی: موجودہ دور میں ہر بالغ کو یہ حق دیا جاتا ہے۔ اگر کسی بالغ کا نام

فہرست رائے دہندگان میں چھپنے سے رہ جائے تو وُہ قانونی طور پر اس پر گرفت کر سکتا اور اس حق کا مطالبہ کر سکتا ہے۔ اسلامی نقطۂ نظر سے یہ تصور بھی یکسر باطل ہے کیونکہ قرآنِ کریم نے بشمار مقامات پر معاشرہ کی اکثریت کو جاہل، ظالم اور فاسق قرار دیا ہے، جن سے رائے لینا یا ان آراء پر عمل پیرا ہونا ایک گمراہ کن امر ہے۔ ارشادِ باری ہے:

"اِنْ تُطِعْ اَكْثَرَ مَنْ فِی الْاَرْضِ يُضِلُّوْكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ" (الانعام ۱۱۶)

"اے نبیؐ! اگر آپ لوگوں کی اکثریت کے پیچھے لگیں گے تو وُہ آپ کو اللہ کی راہ سے بھکا دیں گے۔"

اس آیت نے معاشرہ کی اکثریت کو حق رائے دہی سے خارج قرار دے دیا ہے۔

اب اگر عقلی لحاظ سے دیکھا جائے تو بھی یہ ہر بالغ کے حق رائے دہی کا اصول باطل ثابت ہوتا ہے۔ اگر آپ اپنے کسی ذاتی معاملہ میں مشورہ کرنا چاہیں تو ہر کس و ناکس سے رائے نہیں لیتے۔ بلکہ صرف اس شخص کو مشورہ کا مستحق سمجھتے ہیں، جو معاملہ فہم اور سمجھدار ہو اور یہ تو ظاہر ہے کہ کسی بھی معاشرہ میں ذی شعور اور دانشمند طبقہ کی تعداد قلیل ہی ہُوا کرتی ہے اور یہی لوگ فی الحقیقت رائے دینے کے اہل ہوتے ہیں۔ ارشادِ باری ہے:

"اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰۤى اَهْلِهَا" (النساء ۵۸)

"اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ امانتیں اس کے اہل کے حوالے کرو۔"

اب اگر کسی ووٹر کو یہ شعور ہی نہ ہو کہ نمائندہ کی اہلیت کیا ہے تو اسے ووٹ یا رائے دینے کا حق کیونکر دیا جا سکتا ہے؟

یہی وجہ ہے کہ خلفائے راشدین کے انتخاب میں موجودہ فضول بالغ رائے دہی مفقود نظر آتا ہے۔

عموماً یہ کہہ دیا جاتا ہے کہ عہدِ نبوی یا خلفائے راشدینؓ میں براہ راست یا بالواسطہ انتخاب کا کوئی باضابطہ نظام موجود نہ تھا، لہٰذا مدینہ میں موجود بزرگ صحابہؓ ہی (جو تمام عرب قبائل کے نمائندہ کی حیثیت رکھتے تھے) خلیفہ کے انتخاب میں حصہ لیتے رہے۔

یہ بات بھی حقیقت کے خلاف ہے۔ مسلمانوں کی باقاعدہ مردم شماری کا رواج تو رسولِ اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی زندگی میں پڑ چکا تھا جیسا کہ مندرجہ ذیل حدیث سے واضح ہے:

عَنْ حُذَيْفَةَ قَالَ قَالَ النَّبِىُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "اُكْتُبُوْا لِىْ مَنْ تَلَفَّظَ بِالْاِسْلَامِ مِنَ النَّاسِ - فَكَتَبْنَا لَهٗ اَلْفًا وَّخَمْسَ مِائَةٍ" (بخاری)

کتاب الجہاد والسیر - باب کتابۃ الامام الناس)

"حضرت حذیفہؓ کہتے ہیں، ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ "ہر وہ شخص جس نے اسلام کا کلمہ پڑھا ہے ان کے نام لکھ کر مجھے دیے جائیں"۔ سو ہم نے آپؐ کے لیے فہرست تیار کی تو ایک ہزار پانچ سو ہوئے"۔

اور حضرت عمرؓ کے زمانہ میں تو مردم شماری کا الگ محکمہ بھی قائم ہو گیا تھا۔ اگر بالغ رائے دہی فی الواقع کوئی پسندیدہ چیز تھی تو کسی بھی دور میں ان رجسٹروں سے کیوں نہ کام لیا گیا جبکہ انتخابی فہرستیں پہلے ہی موجود تھیں؟

۴۔ رائے دہی اور کثرتِ رائے:

موجودہ دور میں کسی امر کے فیصلہ کا طریق کار یہ ہوتا ہے کہ ہر ووٹر یا ممبر سے ووٹ لیا جائے ان سب ووٹوں کی قیمت یکساں سمجھی جائے، بعد میں گنتی کی جائے، جس طرف ووٹ زیادہ ہوں اس کے حق میں فیصلہ کر دیا جائے۔ اب یہ معاملہ خواہ صدرِ مملکت کے انتخاب سے تعلق رکھتا ہو یا کسی اور عہدہ کے انتخاب سے، خواہ کسی انتظامی معاملہ سے تعلق رکھتا ہو یا قانون سازی سے، ہر جگہ یہی اصول کارفرما نظر آتا ہے۔ اسلامی نقطۂ نظر سے کثرتِ رائے سے فیصلہ کا اصول ایک ثانوی یا اضطراری حیثیت رکھتا ہے، صدرِ مملکت یا کسی دوسرے عہدیدار کے انتخاب کے وقت کثرتِ رائے کی بجائے اس شخص کی اہلیت کو مدِنظر رکھا جاتا ہے۔ انتظامی امور اور ذیلی قانون سازی کے وقت "دلیل کی تلاش" کی جاتی ہے اور اس کی بہت سی مثالیں ہم اپنی کتاب "خلافت و جمہوریت" کے "حصّہ دوم" میں پیش کر چکے ہیں۔

اب اگر کسی معاملہ کے دو یا دو سے زیادہ پہلو ہوں اور دلائل کا وزن ہر طرف یکساں ہو، یا کسی طرف کوئی بھی دلیل نہ ہو تو اس وقت کثرتِ رائے کے اصول پر فیصلہ کرنے کا سہارا لیا جاتا ہے۔ کثرتِ رائے سے فیصلہ کا فائدہ صرف یہ ہے کہ اس سے نزاع کا فیصلہ ہو جاتا ہے لیکن وضوحِ حق سے اس کا کچھ تعلق نہیں ہوتا، اس کی مثال بالکل ایسے ہی سمجھیے جیسے کسی نزاع کا فیصلہ قرعہ اندازی سے کرایا جاتا ہے۔

غیر مسلم اقوام کی مجبوری یہ ہے کہ ان کے پاس سرے سے دلیل یا اس کے ماخذ اپنی اصلی صورت میں موجود ہی نہیں یا وہ ان سے باغی ہو چکے ہیں لیکن مسلمانوں کے پاس بحمداللہ کتاب و سنت اپنی اصلی شکل میں موجود ہیں، اور یہی دلیل کے ماخذ ہیں۔ پھر مسلمان ان سے بحمداللہ باغی بھی نہیں ہے۔

تو پھر آخر بالغ رائے دہی کے ذریعہ کثرتِ رائے پر فیصلہ کے اصول کو کیوں اپنایا جائے ؟

۵۔ فیصلہ کے وقت میر مجلس کے اختیارات :

موجودہ دور میں فیصلہ کثرتِ رائے کے اصول پر ہوتا ہے۔ میر مجلس محض بے اختیار ہوتا ہے، یا زیادہ سے زیادہ اس کی رائے کی قیمت دو آراء کے برابر قرار دی جاتی ہے۔ اسلامی نقطۂ نظر سے یہ اصول بھی غلط ہے۔ اللہ تعالیٰ نے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو مسلمانوں سے مشورہ کا حکم دیا تو فرمایا:

" وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ " (آل عمران ۱۵۹)

" اور اپنے کاموں میں ان سے مشورہ لیجئے۔ پھر جب کام کا عزم کرلیں تو اللہ پر بھروسہ رکھیے۔"

اس آیت میں " عَزَمْتَ " کے الفاظ سے یہ بالکل واضح ہے کہ آخری فیصلہ کا اختیار آپؐ کو دیا گیا ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں فیصلہ میر مجلس کے بجائے کثرتِ رائے کی بنیاد پر درست ہوتا تو آیتِ مذکورہ کے الفاظ مندرجہ ذیل دو صورتوں میں سے کسی ایک طرح پر نازل ہونے چاہئیں تھے:

" وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ فَإِذَا عَزَمُوْا فَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ "

" ان مسلمانوں سے اپنے کام میں مشورہ کیجئے۔ پھر جب وُہ کام کا عزم کرلیں تو اللہ پر بھروسہ کیجئے۔"

یا " وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ وَاتَّبِعْ أَكْثَرَهُمْ وَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ "

" ان مسلمانوں سے اپنے کام میں مشورہ کیجئے پھر کثرتِ رائے کو تسلیم کیجئے اور اللہ پر بھروسہ کرکے کام کر ڈالیے۔"

بلکہ اس سے آگے مجھے یہ کہنے میں بھی باک نہیں کہ اگر کثرتِ رائے ہی معیارِ حق ہوتا تو انبیاءؑ کی بعثت یا نزولِ وحی کی ضرورت ہی نہ تھی۔ مشورہ میں اقرب الی الحق کی تلاش کی جاتی ہے۔ اب ایسی دلیل اگر اقلیت کے پاس ہو تو فیصلہ اسی کے مطابق ہونا چاہیے۔ جنگِ بدر کے قیدیوں کے متعلق آپؐ نے مشورہ کے بعد فیصلہ اپنے طبعی رجحان اور کثرتِ رائے کے مطابق دیا تو اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے گرفت ہوئی کیونکہ ان حالات میں حضرت عمرؓ کی رائے اقرب الی الحق تھی۔ اس واقعہ سے دو باتیں ثابت ہوتی ہیں۔

۱۔ فیصلہ کے وقت اللہ کی منشا یا دلیل کی تلاش کرنا چاہیے اسے کثرتِ رائے پر نہ چھوڑنا چاہیے۔

۲۔ اگر میر مجلس کسی وقت غلط فیصلہ بھی کردے تو بھی اس سے آخری فیصلہ کا اختیار چھینا نہیں جاسکتا۔

اقلیت تو درکنار اگر تمام ترکثرت کے مقابلہ میں صرف ایک آدمی کی رائے ہی اقرب الی الحق ہو تو میرِ مجلس اسی کے مطابق فیصلہ کرنے کا پورا اختیار رکھتا ہے۔ اس کی مثال حضرت ابوبکرؓ کا زمین سے نپٹنا اور جیشِ اسامہؓ کو روانہ کرنا ہے۔ جس کی تفصیل ہم مذکورہ بالا کتاب میں پیش کر چکے ہیں۔

۳۔ ووٹرز (رائے دہندگان) کی عمر

ووٹر کے لیے عمر کی کوئی قید نہیں الّا یہ کہ وُہ بالغ ہو۔ کچھ آدمی جلد بالغ ہو جاتے ہیں۔ کچھ ذرا دیر سے ہوتے ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی عمر رسول اکرمؐ کی وفات کے وقت صرف تیرہ یا چودہ سال تھی۔ آپؐ کی زندگی میں حضرت عبداللہؓ رائے تو درکنار فتوائے بھی دیا کرتے تھے۔ حکومتِ وقت اگر انتظامی امور کا لحاظ رکھتے ہوئے اور لوگوں کی عمرِ بلوغت کی اوسط کا لحاظ رکھتے ہوئے کوئی حد مقرر کر بھی دے تو اس میں چنداں مضائقہ نہیں۔

پھر جب انسان بڑھاپے کی وجہ سے حواس کھو بیٹھے اور ذہول کا شکار ہو جائے تو اس سے رائے لینے کی کوئی معقول وجہ نظر نہیں آتی۔ اگر ایسی صورت تا حینِ حیات واقع نہ ہو تو اس سے رائے لینے میں کوئی حرج نہیں۔

۴۔ عورتوں کا حقِ رائے دہی

یہ تو سب اہلِ علم خوب جانتے ہیں کہ اسلام نے عورت کو سیاست و امارت کی ذمہ داریوں سے سبکدوش کر دیا ہے اور عورت و مرد کا دائرۂ کار الگ الگ مقرر کر دیا ہے۔ حضرت علیؓ اور فاطمہؓ کے درمیان گھریلو کاموں کی سرانجام دہی کے سلسلہ میں جھگڑا پیدا ہوا تو رسول اکرمؐ نے یہی فیصلہ فرمایا تھا کہ گھر کے اندر کے کام تو فاطمہؓ سرانجام دے اور گھر کے باہر کے کام علیؓ۔ عورتوں سے جہاد کی فرضیت کو بھی ساقط قرار دیا گیا ہے۔ رسولِ اکرمؐ نے حضرت عائشہؓ کے ایک استفسار کے جواب میں یہی فرمایا تھا کہ "عورتوں کا جہاد حج ہے" (بخاری) اہلِ فارس نے کسریٰ کی بیٹی پوران دخت کو، جو نوشیرواں کی بیٹی اور شیرویہ کی بہن تھی، اپنا بادشاہ بنا لیا، جب رسولِ اکرمؐ کو یہ خبر پہنچی تو آپؐ نے فرمایا: "وُہ قوم کیسے فلاح پا سکتی ہے جس نے ایک عورت کو اپنا سربراہ بنا لیا ہے"؟ (بخاری) ایک دفعہ آپؐ نے یوں بھی فرمایا کہ:

"اِذَا کَانَ اُمَرَاءُکُمْ خِیَارَکُمْ وَاَغْنِیَاءُکُمْ سُمَحَاءَکُمْ وَاُمُوْرُکُمْ شُوْرٰی

بَیْنَکُمْ فَظَهْرُ الْاَرْضِ خَیْرٌ لَّکُمْ مِّنْ بَطْنِهَا، وَاِذَا کَانَ اُمَرَاؤُکُمْ شِرَارَکُمْ وَ اَغْنِیَاؤُکُمْ بُخَلَاءَکُمْ وَ اُمُوْرُکُمْ اِلٰی نِسَاءِکُمْ فَبَطْنُ الْاَرْضِ خَیْرٌ مِّنْ ظَهْرِهَا۔" (ترمذی بحوالہ مشکوٰۃ۔ باب تغیر الناس)

"جب تمہارے حکمران اچھے لوگ ہوں اور تمہارے دولت مند سخی ہوں اور تمہارے معاملات باہمی مشورے سے طے پائیں تو تمہارے لیے زندگی موت سے بہتر ہے، مگر جب تمہارے حکمران بدکردار ہوں اور دولت مند بخیل ہوں اور تمہارے معاملات بیگمات کے حوالے ہوں تو تمہاری موت تمہاری زندگی سے بہتر ہے۔"

رسول اکرم کے ان سب ارشادات سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام نے عورت کو سیاست و امارت کے میدان میں نکلنے کی اجازت نہیں دی۔ یہی وجہ ہے کہ ہمیں دورِ نبوی یا خلفائے راشدین میں ایک بھی مثال ایسی نہیں ملتی کہ کسی عورت کو سربراہِ مملکت تو درکنار کسی کلیدی آسامی پر بھی فائز کیا گیا ہو، اور اس کی وجوہ درج ذیل ہیں،

۱۔ اسلام نے عائلی نظام پر بھرپور توجہ دی ہے، لہٰذا عورت کی اصل ذمہ داری، بال بچوں کی صحیح تربیت قرار دی گئی ہے۔

۲۔ عورت کو حمل اور وضع حمل، حیض اور نفاس کے مراحل سے گزرنا پڑتا ہے۔ ان ایام میں اس کے احساسات و جذبات کا اعتدال پر رہنا ناممکن ہوتا ہے۔ وہ مہمات امور کی طرف توجہ دینے سے قاصر ہوتی ہے۔

۳۔ عورت فطری طور پر بھی انفعال پذیر واقع ہوئی ہے۔ وہ کسی اہم معاملہ میں اعتدال پر رہنے کی بجائے فوری اثر قبول کر جاتی ہے۔

۴۔ جسمانی ساخت کے لحاظ سے عورت مرد کی نسبت کمزور واقع ہوئی ہے۔ اس کی طبیعت، شجاعت اور تہور کی بجائے رحم و کرم کی طرف زیادہ مائل ہوتی ہے۔

اب مشکل یہ آن پڑی ہے کہ عہدِ حاضر نے ہر میدان میں عورت کو مرد کے برابر لا کھڑا کیا ہے عورتوں کو زیادہ سے زیادہ حقوق دینے پر زور دیا جا رہا ہے اور ان کے عالمی سال اور ہفتے منائے جا رہے ہیں۔ ان کے حسن کی نمائش کے مقابلے برپا کیے جا رہے ہیں۔ کھیلوں کے میدان میں انہیں برابر کا شریک کیا جا رہا ہے۔ گھر کی چار دیواری کو ظالمانہ قید سے تشبیہ دے کر مخلوط ادارے قائم

کیے جا رہے ہیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ عورت کو سیاسی لحاظ سے صرف ووٹ دینے کا ہی مساوی حق نہیں بخشا گیا بلکہ وہ ہر قسم کی کلیدی آسامی حتیٰ کہ صدرِ مملکت کی کرسی پر براجمان بھی ہو سکتی ہے۔

ان حالات میں ہمیں سنجیدگی سے غور کرنا ہے کہ اسلام نے گھر سے باہر عورت کو کیا کچھ کرنے کی اجازت دی ہے؟

۱- عورت کام کاج کے سلسلے میں باہر جا سکتی ہے لیکن پردہ کے ساتھ۔ تبرجِ جاہلیت کی یہاں کوئی گنجائش نہیں۔

۲- اگر مردوں کی کمی ہو تو عورتوں کو میدانِ جہاد میں شریک بھی کیا جا سکتا ہے اور وہ خود بھی شریک ہو سکتی ہیں، لیکن ان کا کام زخمیوں کی مرہم پٹی، مریضوں کی تیمارداری، فوجیوں کے لیے خوراک کی تیاری اور سامان کی فراہمی تک ہی محدود رہے گا، وہ باقاعدہ لڑائی میں حصہ نہیں لیں گی۔ جیسا کہ غزوۂ احد کے دوران بعض واقعات ملتے ہیں۔ (بخاری) اگر مردوں کی کمی نہ ہو تو اس صورت میں عورت کی جہاد میں شمولیت کو ناپسند کیا گیا ہے۔ جنگِ خیبر کے دوران از خود ہی چند عورتیں شریکِ سفر ہو گئیں۔ رسولِ اکرمؐ کو علم ہوا تو آپؐ نے اس بات کو ناگوار محسوس فرمایا، انہیں بلا کر ان سے شرکت کی وجہ پوچھی گئی تو انہوں نے کہا، "ہم نے سوت کات کر کچھ رقم اکٹھی کی اور ہمارا ارادہ تھا کہ جہاد میں شامل ہو کر زخمیوں کی مرہم پٹی اور تیمارداری کریں گی۔" آپؐ نے انہیں واپس نہیں کیا بلکہ اموالِ غنیمت میں سے بھی تھوڑا بہت حصہ انہیں دے دیا۔ (ابوداؤد)

۳- حضرت عثمانؓ کے انتخاب کے دوران حضرت عبد الرحمٰن بن عوفؓ نے حضرت عائشہؓ سے بھی مشورہ لیا تھا۔ ایسے ہی کئی صحابہ حضرت عائشہؓ سے دینی مسائل پوچھتے تھے اور ان سے اپنے امور میں مشورہ بھی لیتے تھے، تاہم یہ یاد رہنا چاہیے حضرت عائشہؓ کسی وقت بھی مجلسِ شوریٰ کی ممبر نہیں بنائی گئیں۔

۴- عورتوں کے مخصوص معاملات میں ان کی رائے یا شہادت پر انحصار کیا جا سکتا ہے۔ بچہ کی پیدائش کے معاملہ میں دایہ کی شہادت کسی دوسرے مرد کے مقابلہ میں زیادہ وقیع سمجھی جائے گی۔

۵- چھوٹے بچوں کی تربیت کا فریضہ عورت مرد کی نسبت بہتر طور پر سرانجام دے سکتی ہے۔

۶- حضرت عائشہؓ نے جنگِ جمل میں ایک فریق کے طور پر حصہ لیا تو حضرت علیؓ نے ان کے متعلق فرمایا:

"فَاِنَّكِ خَرَجْتِ غَاضِبَةً لِلّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ تَطْلُبِيْنَ اَمْرًا كَانَ عَلَيْكِ مَوْضُوْعًا- مَا بَالُ النِّسْوَةِ وَالْحَرْبِ وَاِصْلَاحٍ بَيْنَ النَّاسِ -"

(الامامة والسياسة لابن قتيبة ص ۷۰)

"آپ اللہ اور رسولؐ (کے احکام یعنی قصاص حضرت عثمانؓ) کے لیے غضبناک ہو کر ایک ایسے معاملہ کے لیے نکلی ہیں جس کی ذمہ داری سے آپ سبکدوش تھیں۔ بھلا عورتوں کا جنگ اور لوگوں میں مصالحت سے کیا تعلق؟"

گویا حضرت علیؓ کو بھی یہ بات بخوبی معلوم تھی کہ حضرت عائشہؓ کا اس شمولیت سے مقصد سیاسی امور میں شرکت نہیں تھا بلکہ محض قصاص عثمانؓ کا مطالبہ تھا۔ اس کے باوجود حضرت علیؓ نے حضرت عائشہؓ کے اس طرح گھر سے باہر نکلنے اور لڑائی میں حصہ لینے کو پسند نہیں فرمایا۔

اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ جو اس جنگ میں غیر جانب دار تھے اور جنھیں خود رسول اکرمؐ نے نیک بخت کہہ کر پکارا تھا (بخاری، کتاب المناقب) کی حضرت عائشہؓ کی جنگ میں شمولیت کے متعلق یہ رائے تھی:

"اِنَّ بَيْتَ عَائِشَةَ خَيْرٌ لَّهَا مِنْ هَوْدَجِهَا" (حوالہ ایضاً ص ۷۱)

"حضرت عائشہؓ کا گھر ان کے لیے ہودج سے بہتر تھا"

یہ ہیں وہ واقعات جن سے ہم زیادہ سے زیادہ عورتوں کے حقوق کی گنجائش نکال سکتے ہیں اور وہ ہمارے خیال میں یہ ہیں:

۱۔ انتخاب امیر میں ووٹ کا حق تو اسلام نے سب مردوں کو بھی نہیں دیا، عورتوں کو کیسے دیا جاسکتا ہے؟

۲۔ جن عورتوں میں مشورہ دینے کی صلاحیت موجود ہو، ان سے رائے لی جاسکتی ہے لیکن انہیں پولنگ سنٹر پر حاضر ہونے کی تکلیف نہیں دی جائے گی، بلکہ ان کے گھر پر اُن سے مشورہ کا انتظام کیا جائے گا۔

۳۔ ایسے ادارے جن کا تعلق عورتوں یا بچوں کے مسائل سے ہو، مثلاً "بہبود اطفال و نسواں" کلی طور پر عورتوں کی تحویل میں دیے جاسکتے ہیں۔ جہاں وہ آپس میں انتخاب بھی کرسکتی ہیں۔ اسی طرح تعلیم کے لیے عورتوں کے الگ مدارس بھی قائم کیے جاسکتے ہیں۔ عورتوں کے الگ ہسپتال بھی بنائے جاسکتے ہیں خواہ یہ ادارے حکومت کی تحویل میں ہوں یا نجی طور پر کام کر رہے ہوں۔

۴۔ کسی بھی میدان میں عورتوں اور مردوں کے اختلاط کو برداشت نہیں کیا جاسکتا۔

ان نتائج کی روشنی میں ہمیں عورت کے ووٹ کے اس حق کی کوئی ضرورت نظر نہیں آتی، جو موجودہ انتخابات میں پائی جاتی ہے۔

عموماً یہ بھی کہا جاتا ہے کہ مسلمانوں میں بھی کئی ایسی حکمران عورتیں ہیں جنھوں نے کاروبارِ حکومت کو نہایت خوبی سے سرانجام دیا ہے۔ مثال کے طور پر چاند بی بی، رضیہ سلطانہ اور نور جہاں کا نام لیا جاتا ہے۔ اور نیز یہ کہ آج کل بھی کئی عورتیں سربراہِ مملکت ہیں اور اپنے کام بہت اچھی طرح ادا کر رہی ہیں۔ ان واقعات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ عورتوں میں بھی حکمرانی کی صلاحیت موجود ہے تو پھر ان کے اس حق کو کیونکر دبایا جاسکتا ہے؟

ہم یہ عرض کریں گے کہ ایسے واقعات کی تعداد دنیا کی تاریخ میں شاید ایک فی صد سے زیادہ نہ ہوگی اور انہیں مستثنیات میں شمار کیا جائے گا اور مستثنیات سے اصول نہیں بدلا کرتے ہیں، مثلاً یہ ایک اصول ہے کہ عورت جسمانی لحاظ سے مرد کی نسبت کمزور ہوتی ہے مگر ہم دیکھتے ہیں کہ بعض عورتیں ایسی طاقتور اور دلیر ہوتی ہیں جنھوں نے دو تین ڈاکوؤں کا مقابلہ کیا اور ان پر غالب آگئیں تو ایسے شاذ و نادر واقعات سے یہ اصول نہیں بدل سکتا کہ عورت جسمانی لحاظ سے مرد سے کمزور ہوتی ہے۔ بالکل یہی صورت عورت کی حکمرانی کی ہے۔ اسلام نے اصول بیان کر دیا ہے کہ عورت میں مہمات امور کے سرانجام دینے کی اہلیت نہیں ہوتی۔ کسی نابغہ (Genus) کا مستثنیات میں شمار ہوگا جس کا بالعموم لحاظ نہیں رکھا جاتا۔

رہا عصرِ حاضر کے تقاضوں یا ان کے چڑھتے ہوئے سیلاب کا مسئلہ تو ہمارے خیال میں ایک مردِ مومن کو ؎ زمانہ با تو نہ سازد تو با زمانہ بساز

کی پالیسی اختیار کرنے کے بجائے ؎ زمانہ با تو نہ سازد تو با زمانہ ستیز

کی پالیسی پر عمل پیرا ہونا چاہیے کیونکہ اس کے ایمان کا یہی تقاضا ہے۔

۵۔ غیر مسلموں کا حقِ رائے دہی، ۵اجداگانہ انتخاب

امورِ مملکت میں غیر مسلموں کو شریک کرنے یا انتخاب کے سلسلہ میں ووٹ کا حق دینے کی ہمارے خیال میں کوئی گنجائش نہیں۔ ارشاد باری ہے:۔

"یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا بِطَانَةً مِّنْ دُوْنِكُمْ لَا یَاْلُوْنَكُمْ خَبَالًا" (آل عمران)[118]

"اے ایمان والو! اپنے سوا کسی دوسرے کو اپنا رازدار نہ بناؤ کیونکہ وہ تمہاری خرابی میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھیں گے۔"

ایک دوسرے مقام پر فرمایا:

"یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا عَدُوِّیْ وَعَدُوَّکُمْ اَوْلِیَآءَ تُلْقُوْنَ اِلَیْھِمْ بِالْمَوَدَّةِ وَقَدْ کَفَرُوْا بِمَا جَآءَکُمْ مِّنَ الْحَقِّ" (الممتحنہ:۱)

"اے ایمان والو! تم اپنے اور میرے دشمنوں کو دوست نہ بناؤ، تم انہیں دوستی کا پیغام بھیجتے ہو، حالانکہ وہ (دین) حق سے، جو تمہارے پاس آیا، منکر ہیں۔"

ان آیات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک مسلمان ریاست کی اسمبلی یا مجلس شوریٰ میں غیر مسلم ممبر نہیں ہو سکتا۔

ایک دوسرے مقام پر غیر مسلموں کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

"لَا یَرْقُبُوْنَ فِیْ مُؤْمِنٍ اِلًّا وَّلَا ذِمَّةً ۔ وَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُعْتَدُوْنَ ۔ فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوةَ فَاِخْوَانُکُمْ فِی الدِّیْنِ" ۔ (التوبہ:۱۱)

"یہ لوگ کسی مومن کے حق میں نہ تو رشتہ داری کا پاس کرتے ہیں نہ عہد کا۔ یہ لوگ حد سے تجاوز کرنے والے ہیں۔ پھر اگر یہ لوگ توبہ کر لیں اور نماز پڑھنے اور زکوٰۃ دینے لگیں تو وہ دین میں تمہارے بھائی ہیں۔"

چونکہ اسلامی ریاست ایک نظریاتی ریاست ہوتی ہے۔ لہٰذا ووٹر اور نمائندہ دونوں کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ وہ مسلمان ہوں۔ پھر ایک اسلامی مملکت میں شہریت کے حقوق حاصل کرنے کے لیے صرف مسلمان کہلانا ہی کافی نہیں، بلکہ نماز اور زکوٰۃ کی ادائیگی بھی لازمی ہے۔ آیت مذکورہ بالا میں ایک اسلامی مملکت کے شہری کے فرائض کو واضح طور پر بیان فرمادیا گیا ہے۔ بالفاظِ دیگر ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ ایک اسلامی مملکت میں نہ صرف یہ کہ غیر مسلم کو ووٹ دینے کا حق نہیں، بلکہ ایسے نام کے مسلمانوں کو بھی یہ حق نہیں دیا جا سکتا جو نماز اور روزہ کے پابند نہ ہوں۔ پھر جب ایک غیر مسلم کو ووٹ کا حق بھی نہیں تو وہ نمائندہ منتخب ہو کر اسمبلی یا مجلس شوریٰ میں کیونکر شامل کیا جا سکتا ہے؟

۶ ۔ مجلسِ شوریٰ کی حیثیت

مجلسِ شوریٰ دراصل ایک ایسا ادارہ ہے جو نئے پیش آمدہ مسائل پر غور و خوض کرنے میں

امیرِ مملکت کا مشیر ہوتا ہے۔ الجھے ہوئے معاملات میں امیرِ مملکت کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ وہ اس ادارہ کی طرف رجوع کرے، پیش آمدہ مسئلہ ان کے سامنے پیش کیا جائے تاکہ ہر شخص اس پر آزادی سے اپنی رائے دے سکے۔ حضرت عمرؓ نے اہلِ شوریٰ کو مخاطب کرتے ہوئے مجلسِ شوریٰ کے قیام کا مقصد یوں بیان فرمایا تھا:

"اِنِّی لَمْ اُزْعِجْکُمْ اِلَّا اَنْ تَشْرَکُوْا فِی اَمَانَتِیْ فِیْمَا حُمِّلْتُ مِنْ اُمُوْرِکُمْ فَاِنِّیْ وَاحِدٌ کَاَحَدِکُمْ وَلَسْتُ اُرِیْدُ اَنْ تَتَّبِعُوْا ھٰذَا الَّذِیْ ھُوَ ھَوَایَ" (کتاب الخراج - امام ابو یوسف)

"میں نے تمہیں صرف اس لیے تکلیف دی ہے کہ تم میرے اس بارِ امانت میں شریک ہو جو تمہارے ہی امور سے متعلق ہیں۔ میں بھی تم ہی جیسا ایک فرد ہوں اور نہیں چاہتا کہ تم لوگ میری رائے یا خواہش کے پیچھے لگو۔"

حضرت عمرؓ کے اس ارشاد سے مندرجہ ذیل باتوں کا پتہ چلتا ہے۔

۱۔ دورانِ مشورہ آزادی رائے کے لحاظ سے امیرِ مملکت اور مشیروں میں کوئی فرق نہیں ہوتا وہ سب ایک ہی سطح پر ہوتے ہیں۔

۲۔ امیرِ مملکت کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ جبراً اپنی رائے یا خواہش کو مشیروں پر ٹھونسے یا بغیر دلیل کے کوئی بات ان سے منوائے۔

۳۔ امیرِ مملکت کا فریضہ یہ ہے کہ وہ مشیروں کو پوری آزادی سے اظہارِ رائے کا موقعہ دے

چونکہ امیر کا انتخاب "اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللہِ اَتْقٰکُمْ" کے اصول کے تحت ہوتا ہے لہٰذا مشیروں کی آراء اور دلائل کا موازنہ کرنے کے بعد اقرب الی الحق راستہ انتخاب کرنے کا حق امیر کو دیا گیا ہے۔ مجلسِ شوریٰ کا کام یہ نہیں ہوتا کہ ملک کے لیے قانون سازی کے فرائض انجام دے۔ قانون سازی کا حق تو صرف اللہ کو ہے اور وہ سب کتاب و سنت میں موجود ہے۔ اب شوریٰ کا کام فقط یہ رہ جاتا ہے کہ وہ شرعی قوانین کے نفاذ کے سلسلہ میں پیش آمدہ رکاوٹوں کو دور کرنے کے لیے ذیلی قوانین (BYE LAWS) وضع کرے جو اصل قوانینِ شرعیہ کی حدود کے اندر ہوں۔ دورِ فاروقی میں جب ایران فتح ہو گیا تو یہ مسئلہ سامنے آیا، کہ اہلِ ایران جو مجوسی یا آتش پرست تھے اُن سے اہلِ کتاب کا سا سلوک کیا جائے یا مشرکین کا سا؟ مؤرخ بلاذری نے اس کا نقشہ یوں کھینچا ہے:

"كَانَ لِلْمُهَاجِرِيْنَ مَجْلِسٌ فِى الْمَسْجِدِ فَكَانَ عُمَرُ يَجْلِسُ مَعَهُمْ فِيْهِ وَيُحَدِّثُهُمْ عَمَّا يَنْتَهِى إِلَيْهِ مِنْ أَمْرِ الْآفَاقِ فَقَالَ يَوْمًا. "مَا أَدْرِىْ كَيْفَ أَصْنَعُ بِالْمَجُوْسِ"

"حضرت عمرؓ کے دور خلافت میں مہاجرین پر مشتمل مسجد نبویؐ میں ایک مجلس تھی۔ حضرت عمرؓ ان کے ساتھ بیٹھتے اور سلطنت کے اطراف سے آنے والی خبروں پر گفتگو کرتے۔ ایک دن فرمایا: مجھے یہ سمجھ نہیں آرہا کہ مجوسیوں کے ساتھ کیسے معاملہ کیا جائے؟"

اس الجھن کی وجہ یہ تھی کہ اہلِ ایران گو بظاہر آتش پرست اور مشرک تھے مگر وہ ایک الہامی کتاب "ژند" کو بھی مانتے تھے۔ اس مجلس نے بالآخر انہیں اہل کتاب کا درجہ دینے کا فیصلہ کیا، اور ان پر جزیہ عائد کر کے انہیں ذمیوں کے سے پورے حقوق کی منظوری دے دی۔

شوریٰ کا کام محض ذیلی قوانین بنانا نہیں ہوتا بلکہ وہ خالص انتظامی امور میں صدرِ مملکت کی اپنی آراء سے راہنمائی کرتی ہے۔ اور اس کو یہ حق ہے کہ اگر امیر مملکت اس سے مشورہ کیے بغیر کوئی ایسا کام کرتا ہے جو اس کی نظروں میں مستحسن نہیں تو اس سلسلہ میں از خود امیر کو مشورہ دے کر اس کی صحیح راہنمائی کرے۔

عراق پر لشکر کشی کے دوران حضرت عمرؓ خود سپہ سالار بن کر روانہ ہو چکے تھے۔ مدینہ میں اپنا قائم مقام حضرت علیؓ کو مقرر کر دیا تھا۔ جب چشمۂ صرار تک پہنچ گئے اور وہاں قیام فرمایا، تو حضرت عثمانؓ نے، جو شوریٰ کے ایک ممبر تھے، حاضر ہو کر عرض کیا کہ "مجھے آپ کا خود عراق کی طرف جانا مناسب معلوم نہیں ہوتا۔"

اتنی سی بات پر حضرت عمرؓ نے جلسۂ عظیم کا انعقاد کر کے اس میں یہ مسئلہ پیش کیا۔ حضرت عمرؓ کی سپہ سالاری کی وجہ سے فوج میں بڑا جوش پیدا ہو گیا تھا، لہٰذا کثرتِ رائے خلیفۂ وقت کے ارادے کے موافق معلوم ہوئی۔ تو اب حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے، یہ بھی شوریٰ کے ممبر تھے، یہ اعتراض کر دیا کہ خلیفۂ وقت کا مدینہ سے باہر جانا خطرہ سے خالی نہیں۔ اگر کسی دوسرے سالارِ لشکر کو جنگ میں ہزیمت ہو تو خلیفۂ وقت اس کا بآسانی تدارک کر سکتے ہیں۔ لیکن خدانخواستہ خلیفۂ وقت کو کوئی چشم زخم پہنچے تو پھر مسلمانوں کے کام کا سنبھلنا دشوار ہو جائے گا۔" اب یہ مسئلہ پھر شوریٰ میں پیش ہوا۔ حضرت علیؓ، یہ بھی شوریٰ کے ممبر تھے، کو مدینہ سے بلایا گیا اور تمام اکابر صحابہؓ

سے جو شوریٰ کے ممبر تھے مشورہ کیا گیا تو شوریٰ نے عبدالرحمٰنؓ بن عوف کی رائے کو پسند کیا۔
فاروقِ اعظمؓ نے دوبارہ اجتماعِ عام کو مخاطب کر کے فرمایا کہ "میں خود تمہارے ساتھ جانے کو تیار تھا، لیکن صحابہ کرامؓ کے تمام صاحب الرائے میرے جانے کو ناپسند کرتے ہیں، لہٰذا میں مجبور ہوں"۔
(طبری ج ۳ ص ۴۸۰ تا ۴۸۲ کی تلخیص)

یہ واقعہ شوریٰ کی حیثیت پر پوری روشنی ڈالتا ہے اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ عوام کی اکثریت کی رائے پر اصحاب الرائے یا شوریٰ کے چند ممبروں کی رائے کو کتنی فوقیت حاصل ہے۔
شوریٰ کی حیثیت کو پورے طور پر اجاگر کرنے کا دوسرا واقعہ حضرت علیؓ کا انتخاب ہے، جو عامیانہ دباؤ کے تحت ہوا تھا جس میں اہلِ شوریٰ کے تھوڑے سے افراد نے حصّہ لیا تھا۔ کچھ ایسے بھی تھے جنھیں غنڈہ عناصر نے مجبور کر کے ان سے حضرت علیؓ کی جبری بیعت لی تھی۔ انتخاب میں اہلِ شوریٰ کی عدم شرکت ہی کا یہ نتیجہ تھا کہ حضرت علیؓ کے دور میں حکومت کو استحکام نصیب نہ ہوا۔ جب بھی آپؓ سے حضرت عثمانؓ کے قصاص کا مطالبہ کیا جاتا تو آپؓ کہہ دیتے کہ جب تک مسلمان اپنے اس امرِ خلافت پر متحد نہ ہو جائیں، یہ مطالبہ کیونکر پورا کیا جا سکتا ہے؟ حضرت علیؓ کی خلافت کی اس حیثیت کا احساس ان حضرات کو بھی تھا جو آپؓ کے قریبی رشتہ دار اور مصاحب تھے۔ حضرت علیؓ نے جب حضرت عثمانؓ کے مقرر کردہ عاملین کو معزول کرنا چاہا تو حضرت ابن عباسؓ نے انہیں مشورہ دیا کہ فی الحال ان عاملین کو معزول نہ کرنا چاہیے جس کی ایک وجہ یہ بھی بیان کی کہ "ممکن ہے وہ لوگ آپؓ کی خلافت ہی کو چیلنج کر دیں اور کہیں کہ یہ خلافت ہی شوریٰ کے بغیر حاصل ہوئی ہے"۔ (طبری ج ۴ ص ۴۳۹)

۷۔ شرائط اہلیت مجلس شوریٰ

۱۰۔ شرائط اہلیت صدر
۱۱۔ شرائط رائے دہندگان
۱۲۔ شرائط نمائندگان
۱۴۔ نمائندگان کی عمر

مندرجہ بالا نکات کی ترتیب ہمارے خیال میں یوں ہونی چاہیے ۱۔ شرائط یا اہلیت رائے دہندہ ۲۔ شرائط اہلیت نمائندگان یا ممبر شوریٰ۔ ۳۔ شرائط اہلیتِ صدر ۴۔ نمائندگان کی عمر۔

ہم اسی ترتیب سے ان کے جوابات سپردِ قلم کریں گے۔

۱- شرائط ووٹر یا رائے دھندہ :

ہم پہلے وضاحت سے بتلا چکے ہیں کہ ایک اسلامی مملکت کے امورِ ریاست و سیاست میں مشورہ دینے کے لیے کم ازکم دو بنیادی شرائط کا پایا جانا ضروری ہے

(۱) یہ کہ وُہ مسلمان ہو اور

(۲) یہ کہ وُہ نماز اور زکوٰۃ ادا کرتا ہو۔ یہ دو بنیادی شرائط پوری کرنے پر وُہ مملکت کا شہری اور رائے دینے کا حقدار بن سکتا ہے۔ اب ان دو شرائط کے علاوہ باقی شرائط درج ذیل ہیں:

۳- بصیرت :

ارشادِ باری ہے:

"اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰۤى اَهْلِهَا" (النساء:۵۸)

"اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ امانتیں اس کے مستحق کے حوالے کرو۔"

تو یہ اسی صورت میں ممکن ہے جب کہ رائے دہندہ اسلامی نقطۂ نظر کو ملحوظ رکھتے ہوئے کسی نشست یا منصب کے مختلف امیدواروں میں سے بہتر کا انتخاب کر سکتا ہو۔

۴- امانت :

ارشادِ نبویؐ ہے:

"اَلْمُسْتَشَارُ مُؤْتَمَنٌ" (متفق علیہ) یعنی جس سے مشورہ طلب کیا جاتے، اسے امانتداری سے مشورہ دینا چاہیے ورنہ وُہ اس امانت کی خیانت کا مرتکب ہو گا۔ اگر یہ مشورہ کوئی راز کی بات ہے تو اس کو ظاہر کرنا بھی خیانت ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ کسی شخص کا مسلمان ہونا یا نماز اور زکوٰۃ ادا کرنا تو ہر ایک کو معلوم ہو سکتا ہے لیکن بصیرت یا امانت تو ایسی باطنی صفات ہیں جو بظاہر معلوم نہیں ہو سکتیں پھر کسی مسلمان کے متعلق سوءِ ظن کرنا بھی ناجائز ہے۔ لہٰذا اسلامی نقطۂ نظر سے زیادہ سے زیادہ یہی گنجائش دی جا سکتی ہے کہ ہم ہر بالغ اور عاقل کو صاحبِ بصیرت بھی تصور کر لیں اور امین بھی۔ اور ہر اس عاقل، بالغ شہری مرد کو رائے دہی کا حق دے دیں جو مسلمان ہو اور نماز اور زکوٰۃ کا پابند ہو۔

یہ تو ایک ووٹر کی ایجابی اہلیتیں تھیں۔ اب کچھ ایسی نااہلیتیں بھی ملاحظہ فرمائیے جن کی وجہ سے ووٹر کا حقِ رائے دہی سلب ہو جاتا ہے:

یہ تو واضح ہے کہ ووٹ ایک عملی شہادت ہے جس کے ذریعہ ایک ووٹر اپنے قلبی اطمینان اور یقین کے ساتھ اس بات کی شہادت دیتا ہے کہ موجودہ امیدواروں میں سے فلاں امیدوار اس کے نزدیک اہل تر ہے۔ لہٰذا ہر وہ شخص جس کی شہادت از روئے اسلام ناقابلِ قبول ہوگی، رائے دینے کا بھی نااہل قرار پائے گا۔ اور ایسے اشخاص درج ذیل ہیں:

۱۔ فاسق کی شہادت:

ارشادِ باری ہے:

"یٰاَیُّہَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اِنْ جَاءَکُمْ فَاسِقٌ بِنَبَاٍ فَتَبَیَّنُوْا۔" (الحجرات ۶)

"اے ایمان والو! اگر کوئی فاسق تمہارے پاس کوئی خبر لے کر آئے تو اس کی تحقیق کرلیا کرو۔"

معلوم ہوا کہ فاسق کی شہادت معتبر نہیں ہے، لہٰذا کسی فاسق کو ووٹ کا اہل قرار نہیں دیا جاسکتا۔

فاسق کی مختلف اقسام بیان کرتے ہوئے فقہاء نے مندرجہ ذیل قسم کے افراد کی شہادت کو ناقابلِ قبول قرار دیا ہے:

۱۔ نماز، روزہ وغیرہ کا تارک، ۲۔ یتیم کا مال کھانے والا ۳۔ زانی ۴۔ لواطت کا مرتکب ۵۔ چور اور ڈاکو ۶۔ ماں باپ کی حق تلفی کرنے والا ۷۔ خائن اور خائنہ

۲۔ قاذف کی شہادت:

ارشادِ باری ہے:

وَالَّذِیْنَ یَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ ثُمَّ لَمْ یَاْتُوْا بِاَرْبَعَةِ شُہَدَاءَ فَاجْلِدُوْہُمْ ثَمٰنِیْنَ جَلْدَةً وَّلَا تَقْبَلُوْا لَہُمْ شَہَادَةً اَبَدًا (النور ۴)

"اور جو لوگ پاکدامن عورتوں پر بدکاری کی تہمت لگائیں پھر ان پر چار گواہ نہ لا سکیں تو ان کو اسّی کوڑے مارو اور کبھی ان کی شہادت قبول نہ کرو۔"

۳۔ جھوٹی گواہی دینے والے کی شہادت:

جھوٹی گواہی دینا کبیرہ گناہ ہے جو ایمان کے منافی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مومنوں کی ایک صفت یہ بھی بیان فرمائی ہے:

وَالَّذِیْنَ لَا یَشْہَدُوْنَ الزُّوْرَ (الفرقان) "اور وہ لوگ جو جھوٹی گواہی نہیں دیتے۔"

اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی نے پوچھا کہ کبیرہ گناہ کون کون سے ہیں تو آپؐ نے فرمایا:

" اَلْاِشْرَاکُ بِاللّٰہِ وَعُقُوْقُ الْوَالِدَیْنِ وَقَتْلُ النَّفْسِ وَشَہَادَۃُ الزُّوْرِ۔

(بخاری، کتاب الشہادات)

" خدا سے شرک کرنا، والدین کی نافرمانی، کسی کو قتل کرنا اور جھوٹی گواہی دینا۔

لہٰذا ایسا شخص جس کی جھوٹی گواہی ثابت ہو جائے آئندہ اس کی شہادت قابلِ قبول نہیں ہوتی۔ حضرت معمرؒ فرماتے ہیں ؛

"عَنْ مَعْمَرٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ رَدَّ شَہَادَۃَ رَجُلٍ فِیْ کِذْبَۃٍ کَذَبَہَا۔ (القضاء لابی عبید)

" معمرؒ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شخص کی گواہی مردود قرار دی جو پہلے کسی معاملہ میں جھوٹی گواہی دے چکا تھا۔"

جھوٹی گواہی دینا ایک قابلِ تعزیر جرم ہے۔ حضرت عمرؓ ایسے جھوٹے گواہوں کو کئی طرح کی سزائیں دیتے تھے۔ کبھی طویل عرصہ کے لیے مقید کیا جاتا، کبھی کوڑے لگائے جاتے اور کبھی سر مونڈ کر چہرہ پر سیاہی لگا دیتے اور یہ سب سزائیں جھوٹی شہادت کی مناسبت سے دی جاتی تھیں۔

۴۔ قریبی تعلق داروں کی شہادت :

باپ کی گواہی بیٹے کے حق میں اور اسی طرح بیٹے کی گواہی باپ کے حق میں، بیوی کی گواہی خاوند کے حق میں اور اسی طرح خاوند کی گواہی بیوی کے حق میں، غلام کی گواہی آقا کے حق میں اور اسی طرح آقا کی گواہی غلام کے حق میں ناقابلِ قبول ہیں۔ (بیہقی)

آج بحمداللہ غلامی کا دستور نہیں رہا جو عہدِ نبوی میں تھا۔ تاہم موجودہ دور میں کسی کارخانہ یا فیکٹری کے مزدوروں کی تقریباً وہی حیثیت ہے جو اس دور میں نجی غلاموں کی تھی۔ لہٰذا ہم تصریحاتِ بالا سے یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ کسی امیدوار کے حق میں اس کی بیوی، بیٹوں اور ملازموں یا مزدوروں کا ووٹ قابلِ قبول نہیں ہے۔

اب ہم عصرِ حاضر کا لحاظ رکھتے ہوئے مختصراً ایک نمائندہ کی اہلیت اور نا اہلیت کی شرائط بیان کرتے ہیں؛

۱۔ ووٹر کے لیے مسلمان ہونا ضروری ہے۔

۲۔ عملی طور پر وہ نماز، زکوٰۃ اور روزہ کا پابند ہو ورنہ اسے رائے دینے کا کوئی حق نہ ہوگا۔

۳۔ اس کا نمائندہ سے قریبی تعلق نہ ہو جس کی وضاحت پہلے گزر چکی ہے۔

۴۔ جس شخص کی جھوٹی گواہی پہلے ثابت ہو چکی ہو اُسے بھی رائے دینے کا حق نہیں۔

۵۔ کسی اخلاقی جرم میں سزا یافتہ نہ ہو، نہ ہی کسی پر تہمت لگانے کا مرتکب ہو چکا ہو یعنی (الف یا ب) سے تعلق نہ رکھتا ہو، بالفاظِ دیگر فاسق و فاجر نہ ہو بلکہ اچھی شہرت رکھنے والا ہو۔ بُری شہرت کا فیصلہ دو معتبر شہادتوں کی بناء پر بھی کیا جا سکتا ہے اور اس کی تحقیق کے لیے دوسرے ذرائع بھی اختیار کیے جا سکتے ہیں۔

۶۔ عاقل بالغ ہونے کے ساتھ کم از کم معمولی لکھنا پڑھنا بھی جانتا ہو۔ اتنی سیاسی سوجھ بھی رکھتا ہو کہ نمائندہ یا حاکم کے لیے کن اوصاف سے متصف ہونا ضروری ہے۔

مندرجہ بالا شرائط کو ہم مزید اختصار سے بیان کرنا چاہیں تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ ایک ووٹر کے لیے مسلمان، بالغ، عاقل اور متقی ہونا ضروری ہے۔

ان تصریحات سے آپ بخوبی اندازہ کر سکتے ہیں کہ اسلامی نقطۂ نظر سے پاکستان میں کتنے فیصد ایسے لوگ رہ جاتے ہیں جو صحیح معنوں میں رائے دہی کے مستحق سمجھے جا سکتے ہیں۔

شرائط اہلیت نمائندہ برائے مجلس شوریٰ

مجلسِ شوریٰ کے ممبروں کا کام مملکت کے داخلی اور خارجی امور کے متعلق صدر کو مشورہ دینا یا ذیلی قوانین بنانا ہے ایسے مشورہ میں چونکہ کتاب و سنت کی مذکورہ حدود کے اندر رہ کر اقرب الی الحق رائے کی تلاش ہوتی ہے لہٰذا اس شوریٰ کے ممبر کے لیے رائے دہندہ کی تمام شرائط پوری کرنے کے علاوہ مندرجہ ذیل دو شرائط کا پورا کرنا بھی ضروری ہے:

۱۔ یہ کہ وہ کتاب و سنت کا عالم ہو۔ اور

۲۔ کتاب و سنت سے استنباط یا نتائج اخذ کرنے کا ملکہ رکھتا ہو۔

یہ دونوں صفات مجلسِ شوریٰ کے ممبروں کے علاوہ عدلیہ اور انتظامیہ کے حکام کے لیے بھی ضروری ہیں۔ ارشادِ باری ہے:

"وَإِذَا جَاءَهُمْ أَمْرٌ مِّنَ الْأَمْنِ أَوِ الْخَوْفِ أَذَاعُوا بِهِ ۖ وَلَوْ رَدُّوهُ إِلَى الرَّسُولِ وَإِلَىٰ أُولِي الْأَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِينَ يَسْتَنبِطُونَهُ مِنْهُمْ" (النساء)

"اور جب اُن کے پاس امن یا خوف کی کوئی خبر پہنچتی ہے تو اسے مشہور کر دیتے ہیں

اور اگر اس کو پیغمبرؐ اور اپنے حاکموں کے پاس پہنچاتے تو تحقیق کرنے والے اس کی تحقیق کر لیتے۔"

۳۔ صدر کی اہلیت:

اولی الامر سے مراد وُہ حکامِ بالا ہیں جو کلیدی آسامیوں پر فائز ہوتے ہیں۔ خواہ یہ مقننہ (شوریٰ) سے تعلق رکھتے ہوں یا عدلیہ سے یا انتظامیہ سے۔ اہل شوریٰ کی صفات تو ہم بیان کر چکے ہیں۔ انتظامیہ کے اور بالخصوص فوج کے اولی الامر کے لیے کتاب و سنت کا عالم ہونے کے علاوہ صحتمند، مضبوط جسم کا مالک ہونا بھی ضروری ہے۔ ارشادِ باری ہے:

اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰهُ عَلَيْكُمْ وَزَادَهٗ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ (البقرۃ: ۲۴۷)

"اللہ تعالیٰ نے طالوت کو بادشاہت کے لیے منتخب کیا ہے اور اسے علم اور جسم (طاقت) میں وافر حصّہ عطا فرمایا ہے۔"

اور عدلیہ کے اولی الامر کے لیے صاحبِ بصیرت ہونے کے علاوہ قوتِ فیصلہ کا مالک ہونا بھی ضروری ہے۔ ارشادِ باری ہے:

"وَاٰتَيْنٰهُ الْحِكْمَةَ وَفَصْلَ الْخِطَابِ (صٓ: ۲۰)

"ہم نے داؤدؑ کو حکمت اور فیصلہ کن بات کرنے کی صلاحیت دی۔"

عدلیہ کے اولی الامر کے لیے چند اور شرائط بھی ضروری ہیں، مثلاً وُہ حلیم، محتاط اور حق و انصاف کے معاملہ میں مضبوط ہونا چاہیے لیکن اس کی تفصیل کا یہ موقعہ نہیں۔

اب دیکھیے، صدر کا ان تینوں طرح کی صفات سے مجملاً متصف ہونا ضروری ہے۔ ایسے انسان تو کم ہی ہوتے ہیں جو ہر لحاظ سے جامع صفات ہوں، تاہم صدارت کا مستحق وہی شخص ہو سکتا ہے جس میں مندرجہ بالا صفات زیادہ سے زیادہ پائی جاتی ہوں۔

مندرجہ بالا تصریحات سے یہ واضح ہوتا ہے کہ تقویٰ ایک ایسی جامع صفت ہے جس کا رائے دہندہ، نمائندۂ اولی الامر اور صدر سب میں پایا جانا ضروری ہے۔ تقویٰ سے مراد ہر معاملہ میں عنداللہ مسئولیت کا تصور ہے اور یہ تصور ہر معاملہ میں اور ہر مقام پر انسان کی راہِ راست کی طرف راہنمائی کرتا ہے۔ متقی شخص مشیر ہو تو غلط مشورہ نہیں دے سکتا۔ قاضی ہو تو غلط فیصلہ نہیں کر سکتا اور افسر ہو تو ظلم و جور نہیں کر سکتا۔ پھر تقوےٰ کے بھی مختلف درجات ہیں۔ لہٰذا اگر محض تقوےٰ کی بنیاد پر ہی اولی الامر اور صدر کا انتخاب کیا جائے تو ہمارے خیال میں یہ بھی درست ہو گا۔ ارشادِ باری ہے:

"اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ" (الحجرات:۱۳)

"اللہ کے نزدیک تم میں سے معزز وُہ ہے جو زیادہ پرہیزگار ہے"

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"رَأْسُ الْحِكْمَةِ مَخَافَةُ اللّٰهِ"

"اصل دانائی خدا کا خوف ہے"

بالفاظِ دیگر ووٹر یا رائے دہندہ صرف متقی شخص ہو سکتا ہے اور اولی الامر وُہ اشخاص ہوں گے جو تقوٰے کے بلند مقام پر ہوں گے اور صدر وُہ شخص ہو گا جو تقوٰے میں ان سب سے بڑھ کر ہو گا۔

۴۔ نمائندہ کی عمر:

نمائندہ اور اسی طرح دوسرے اولی الامر کے لیے پختہ عقل (MATURED) ہونا ضروری ہے۔ قرآنِ کریم کی ایک آیت سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ انسان چالیس سال کی عمر تک پہنچ کر پختہ عقل ہوتا ہے۔ ارشادِ باری ہے:

"حَتّٰى اِذَا بَلَغَ اَشُدَّهٗ وَ بَلَغَ اَرْبَعِيْنَ سَنَةً" (الاحقاف:۱۵)

"یہاں تک کہ جب انسان بھرپور جوان ہوتا اور چالیس سال کی عمر کو پہنچتا ہے"

اور اس رائے کی عملی شہادت یہ ہے کہ انبیاءؑ کو بالعموم نبوت چالیس سال یا اس کے بعد ہی عطا ہوئی، اسی طرح خلفائے راشدینؓ میں کوئی بھی ایسا نہیں کہ جب وُہ منصب خلافت پر فائز ہوا ہو تو اس کی عمر چالیس برس سے کم ہو۔

تاہم چالیس سال کی شرط ایسی نہیں جس کا استثنا نہ ہو۔ اصل شرط پختہ عقل ہونا ہے۔ حضرت عمرؒ بن عبدالعزیز جب خلیفہ منتخب ہوئے تو آپ کی عمر ۳۷ سال تھی اور جب شہید ہوئے تو ۳۹ سال کے تھے، حالانکہ ان کا شمار خلفائے راشدین میں ہوتا ہے۔ جس طرح بلوغت حالات، زمانہ اور علاقہ کے تحت الگ الگ ہے اسی طرح پختہ عقل ہونے کی عمریں بھی الگ ہو سکتی ہیں۔ اسی طرح بعض انسان پیدائشی طور پر ذہین ہوتے ہیں وُہ چھوٹی عمر میں ہی ایسے پختہ عقل ہوتے ہیں کہ بڑے بزرگ ان کی باتوں سے دنگ رہ جاتے ہیں۔

ان حالات میں محض عمر کی قید لگانا مشکل ہے اور اگر کوئی شرط عائد کرنا ہی ہو تو ہمارے خیال میں چالیس سال کی شرط ہی بہتر ہے۔

۱۱- صدر کا انتخاب براہِ راست ہو یا بالواسطہ؟

۱۸- کیا صدر کی نامزدگی برائے انتخاب کیلیے کوئی ادارہ مختص کیا جائے؟

صدر کے براہِ راست انتخاب، جسے آج کی زبان میں بالغ رائے دہی کی بنیاد پر انتخاب کہا جاتا ہے، کی کوئی مثال ہمیں تاریخ اسلام میں نہیں ملتی۔ جو اصحاب خلیفہ منتخب ہوئے یا نامزد کیے گئے، سب اہل شوریٰ سے تعلق رکھتے تھے۔ حضرت ابوبکرؓ حضور اکرمؐ کی شوریٰ کے معزز رکن تھے، حضرت عمرؓ دورِ نبویؐ اور صدیقی میں شوریٰ کے معزز رکن رہے، جنھیں حضرت ابوبکرؓ نے نامزد کیا تھا۔ حضرت عمرؓ نے اپنی وفات کے دوران جن چھ حضرات کا انتخابی بورڈ بنا کر فرمایا کہ ان میں سے کسی ایک کو خلیفہ بنا لیا جائے، یہ سب اصحابِ مجلس شوریٰ کے ارکان تھے۔ شہادتِ عثمانؓ کے بعد باغی گروہ نے جن تین حضرات کو خلافت کا مستحق سمجھا، یعنی حضرت علیؓ، حضرت طلحہؓ اور حضرت زبیرؓ، یہ بھی اہل شوریٰ تھے۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ جب باغی عنصر نے عوام کو ساتھ ملا کر حضرت علیؓ کو خلافت کے لیے مجبور کر دیا تو حضرت علیؓ نے فرمایا:

> "یہ اہل شوریٰ اور اہلِ بدر کا کام ہے جسے وہ منتخب کریں وہی خلیفہ ہوگا۔ ہم جمع ہوں گے اور اس معاملہ پر غور کریں گے۔" (ابن قتیبہ۔ الامامۃ والسیاسۃ ج ا ص ۴۱)

تصریحاتِ بالا سے دو باتیں سامنے آتی ہیں:

۱- خلفائے راشدین کے آخری دور تک براہِ راست انتخابِ خلیفہ کا کوئی تصور موجود نہیں تھا، بلکہ انتخابِ صدر کا کام صرف مجلسِ شوریٰ کے ذمہ تھا۔

۲- مجلسِ شوریٰ اپنے میں سے ہی کسی ایک کو خلیفہ منتخب کرتی تھی مجلسِ شوریٰ سے باہر خلیفہ کا انتخاب کبھی عمل میں نہیں آیا۔

ان حقائق کی روشنی میں ہم پورے وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ اسلامی نقطۂ نظر سے بالواسطہ انتخاب ہی صحیح صورت ہے۔

۱۷- کیا صدر شوریٰ کے فیصلوں کا پابند ہوگا؟

ہم پہلے بالغ رائے دہی کی شق نمبر ۵ "فیصلہ کے وقت میرِ مجلس کے اختیارات" کے تحت تفصیل سے لکھ آئے ہیں کہ میرِ مجلس یا صدر شوریٰ سے مشورہ کرنے کا پابند ضرور ہے لیکن وہ فیصلہ میں

کثرتِ آراء کا پابند نہیں۔ اگر وہ مناسب سمجھتا ہو تو تمام شوریٰ کے متفقہ فیصلہ کے خلاف بھی فیصلہ دے سکتا ہے۔ جیساکہ حضرت ابوبکرؓ نے جیشِ اسامہؓ اور مانعینِ زکوٰۃ کے سلسلہ میں کیا۔ اس سلسلہ میں جمہوریت نوازوں کی طرف سے جتنے اعتراض کیے جاتے ہیں ان کا جائزہ ہم اپنی کتاب "خلافت و جمہوریت" کے صفحہ ۱۴۵ تا صفحہ ۱۵۵ میں بڑی تفصیل سے پیش کر چکے ہیں۔ ممکن ہے بعض حضرات صدر کے اس اختیار کو ملٹی ڈکٹیٹر شپ (آمریت) کا نام دیں۔ لیکن یہ بات حقیقت کے خلاف ہے۔ صدر بھی دلیل کے بغیر اپنی مرضی کو دوسروں پر ٹھونس نہیں سکتا۔ حضرت ابوبکرؓ نے صحابہؓ کے بھرے مجمعے میں مانعین زکوٰۃ سے جہاد کے لیے یہ دلیل پیش کی تھی:

"اِنَّ اللہَ لَمْ یَفْرُقْ بَیْنَ الصَّلٰوۃِ وَالزَّکٰوۃِ ثُمَّ جَمَعَہُمَا۔"

(کنز العمال ج ۳ ص ۱۴۲)

"اللہ تعالیٰ نے نماز اور زکوٰۃ میں کوئی فرق نہیں فرمایا، بلکہ دونوں کو اکٹھا ہی ذکر کیا ہے۔"

حضرت عمرؓ نے عراق کی زمینوں کو قومی تحویل میں لینے کا ارادہ کیا تو جب تک قرآن سے دلیل سمجھ میں نہیں آئی، آپؓ معترضین کے ہاتھوں سخت بے چین رہے۔ اس کی تفصیل بھی ہم مذکورہ کتاب کے صفحہ ۱۳۸ تا ۱۴۱ پر پیش کر چکے ہیں۔

اس کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ اسلامی نقطۂ نظر سے ایک عام شخص بھی دلیل سے صدر کے کسی حکم کو چیلنج کر سکتا ہے۔ حضرت عمرؓ نے خطبہ کے دوران لوگوں کو ہدایت کی کہ وہ حق مہر زیادہ نہ باندھا کریں، اور اس کی حد چار سو درہم مقرر کی تو ایک عورت اٹھ کر کہنے لگی "تم یہ پابندی لگانے والے کون ہوتے ہو، جبکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

"اِنْ اٰتَیْتُمْ اِحْدٰىهُنَّ قِنْطَارًا۔"

"اگرچہ تم ان عورتوں میں کسی ایک کو خزانہ بھر بھی (بطورِ حق مہر) دے چکے ہو۔"

یہ بات سن کر حضرت عمرؓ بے ساختہ پکار اٹھے "پروردگار! مجھے معاف فرما۔ ہر شخص عمرؓ سے زیادہ فقیہ ہے" پھر منبر پر چڑھے اور کہا "لوگو! میں نے تمہیں چار سو درہم سے زیادہ حق مہر مقرر کرنے سے روکا تھا۔ میں اپنی رائے واپس لیتا ہوں۔ تم میں سے جو جتنا چاہے مہر میں دے۔"

یہی وہ فرق ہے جو خلافت کو آمریت سے ممتاز کرتا ہے۔ آمر بغیر کسی دلیل کے محض اپنی مرضی سے شوریٰ یا مشیروں کی رائے کو رد کر سکتا ہے لیکن خلافت میں یہ بات ممکن نہیں اسی طرح

ایک آمر اپنی کسی پالیسی یا حکم پر تنقید برداشت نہیں کر سکتا۔ خواہ وُہ دلیل سے ہو یا بلا دلیل جبکہ خلافت میں تنقید کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔

حیرت کی بات تو یہ ہے کہ ہمارے موجودہ دستور نے بھی، جو خالص جمہوری قدروں پر ترتیب دیا گیا ہے ماسربراہِ مملکت کو مشورہ قبول کرنے کا پابند قرار نہیں دیا ہے۔ یہاں ہم "تحریک آزادی و دستورِ پاکستان" مؤلفہ فاروق اختر نجیب کے چوتھے ایڈیشن سے چند اقتباس پیش کرتے ہیں:

۱۔ "وزراء کا کام حکومت کی پالیسی کی تشکیل میں صدر کو مشورے دینا ہے۔ اس سلسلہ میں صدر جب چاہے ان سے مشورہ طلب کر سکتا ہے مگر وُہ ان کے مشورے کو قبول کرنے کا پابند نہیں۔" (ص ۴۴۴)

۲۔ "صدر سپریم کورٹ کے چیف جسٹس اور اس کے مشورے سے دوسرے ججوں کا تقرر کرتا ہے اسی طرح وُہ سپریم کورٹ کے چیف جسٹس اور متعلقہ صوبہ کے گورنر کے مشورہ سے ہائی کورٹوں کے چیف جسٹس ——— اور سپریم کورٹ کے چیف جسٹس، متعلقہ صوبہ کے گورنر اور متعلقہ ہائیکورٹ کے چیف جسٹس کے مشورہ سے ہائیکورٹ کے ججوں کا تقرر کرتا ہے۔ گویا متذکرہ افراد سے وُہ صرف مشورہ کرنے کا پابند ہے، اس مشورہ کو قبول کرنے کا پابند نہیں۔" (ص ۴۳۴)

بعینہٖ ایک اسلامی مملکت کا صدر اہم معاملات میں شورٰی سے مشورہ کرنے کا پابند ضرور ہے مگر ان کا مشورہ قبول کرنے کا پابند نہیں۔ تمام شورٰی کے دلائل سننے کے بعد آخری فیصلہ کا اختیار صدر ہی کو حاصل ہے۔

۱۸۔ صدر کی نامزدگی برائے انتخاب کے لیے مختص ادارہ!

نامزدگی صدر کے بعد انتخاب کا اختیار

ہمارے خیال میں شورٰی ہی وُہ ادارہ ہے جسے صدر کی نامزدگی کا حق دیا گیا ہے انتخاب حضرت ابوبکرؓ کے وقت حضرت ابوبکرؓ نے خلافت کے لیے حضرت عمرؓ اور حضرت ابوعبیدہؓ بن جراح کا نام پیش کیا۔ یہ تینوں حضرات شورٰی کے ممبر تھے۔ پھر جب حضرت عمرؓ اور حضرت ابوعبیدہؓ بن جراح نے حضرت ابوبکرؓ کی موجودگی میں خلیفہ بننے کو ناپسند کیا تو حضرت عمرؓ نے حضرت ابوبکرؓ کا نام پیش کیا پھر بیعت بھی کر لی۔ تو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ صدر کو نامزد کرنے اور پھر اسے

منتخب کرنے کا کام دراصل اسی شورائی ادارہ کی ذمہ داری ہے۔ حضرت علیؓ کو خلافت کے لیے جب مجبور کیا گیا تو آپؓ نے بھی یہی جواب دیا تھا کہ خلیفہ کا انتخاب دراصل اہلِ شوریٰ اور اہلِ بدر کا کام ہے۔" اور یہ تو ظاہر ہے کہ انتخاب سے پہلے نامزدگی ضروری ہوتی ہے۔

اس کی دوسری صورت یہ ہے کہ اسی شوریٰ میں سے چند اہل افراد کی ایک کمیٹی تشکیل دی جائے جیسا کہ حضرت عمرؓ نے صدر کی نامزدگی اور انتخاب کے لیے ایک چھ رکنی کمیٹی تشکیل دی تھی۔

اور اس کی تیسری صورت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ صدر کے انتخاب کا کام سابقہ صدر کی کابینہ کے سپرد کر دیا جائے۔ ہمارے اس خیال پر موجودہ دور میں دو قسم کے اعتراضات وارد ہو سکتے ہیں۔

۱۔ اگر کابینہ کو یہ حق دیا جائے تو سابقہ صدر جس پارٹی سے تعلق رکھتا ہے وہی پارٹی ہمیشہ کے لیے ملک پر مسلط ہو جائے گی تو اس کا جواب یہ ہے کہ اسلامی نقطہ نظر سے شوریٰ میں جس سے صدر اپنی کابینہ کو نامزد کرتا ہے، حزبِ اختلاف کی کوئی گنجائش نہیں۔ نہ ہی کسی ایسی پارٹی کی گنجائش ہے جس کے نظریات اسلام سے متصادم ہوں۔ اگر یہ دو باتیں ختم ہو جائیں تو کابینہ کو صدر نامزد کرنے کا کوئی خطرہ باقی نہیں رہتا۔

۲۔ جمہوری ملک میں کوئی سرکاری ملازم اس وقت تک اپنا نام صدارت یا اسمبلی کے لیے پیش نہیں کر سکتا جب تک وہ ملازمت سے استعفیٰ نہ دے دے۔ بعد میں وہ خواہ منتخب ہو یا نہ ہو، لیکن اسلام میں ایسی کوئی پابندی نہیں۔ حضرت ابوبکرؓ نے حضرت عمرؓ کو نامزد کیا۔ جبکہ آپ مجلس شوریٰ کے رکن بھی تھے اور منصبِ قضاء پر مامور بھی تھے۔ حضرت عمرؓ نے اپنی وفات کے وقت فرمایا کہ اگر ابوعبیدہؓ بن جراح زندہ ہوتے تو میں انہیں خلافت کے لیے نامزد کر دیتا۔ حضرت ابوعبیدہؓ بن جراح مجلسِ شوریٰ کے رکن بھی تھے اور دورِ نبوی سے بیت المال کے انچارج بھی چلے آ رہے تھے۔ حضرت عمرؓ نے خلیفہ کی نامزدگی اور انتخاب کے لیے جو چھ رکنی کمیٹی مقرر کی اس میں ایک حضرت علیؓ بھی تھے۔ آپؓ شوریٰ کے ممبر بھی تھے اور عہدۂ قضا پر بھی مامور تھے۔ ان واقعات سے ظاہر ہے کہ سرکاری ملازمین ملازمت کے دوران بھی صدارت کے لیے نامزد کیے جا سکتے ہیں لہٰذا اگر صدر کی نامزدگی کا کام کابینہ ہی کے سپرد کر دیا جائے تو بھی ہمارے خیال میں چنداں مضائقہ نہیں۔

۱۹۔ صدارت کے لیے مدت

جمہوری ممالک میں پارلیمنٹ کی ممبرشپ اور ملک کی صدارت ایک سیاسی حق ہے۔ کچھ

حضرات تو یہ "حق" وصول کر لیتے ہیں۔ اب باقی "حقدار" اس انتظار میں رہتے ہیں کہ انہیں یہ حق کب نصیب ہوتا ہے۔ ان "باقی حقداروں" کی دادرسی کے لیے منصب کی مدت معین کرنا ضروری ہوتا ہے۔ لیکن اسلام میں شورای کی ممبرشپ یا مملکت کی صدارت ایک عظیم ذمہ داری ہے۔ ان لوگوں کو خدا کے سامنے جواب دہی کے تصور کو سامنے رکھ کر اپنا فریضہ سرانجام دینا ہوتا ہے۔ حضرت عمرؓ نے جس قدر ایثار اور جانکاہ کوششوں سے اسلام کی خدمت کی، وہ سب جانتے ہیں لیکن اس کے باوجود آپؓ نے وفات کے وقت یہ فرمایا تھا کہ "خلافت کے مقدمہ میں برابر برابر پر چھوڑ دیا جاؤں تو میں یہ غنیمت سمجھتا ہوں، نہ مجھے ثواب ملے نہ عذاب ہو" (بخاری۔ کتاب الاحکام، باب الاستخلاف)

پھر کسی نے حضرت عمرؓ سے کہا کہ "اپنے بیٹے عبداللہ بن عمرؓ کو خلافت کے لیے نامزد کر جائیے" آپؓ نے ناراضی کا اظہار فرمایا اور کہنے والے کو سخت سست کہا اور فرمایا:

"اگر یہ حکومت اچھی چیز تھی تو اس کا مزہ ہم نے چکھ لیا اور اگر یہ بُری چیز تھی تو عمر کے خاندان کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ کل کو خدا کے سامنے ان میں سے صرف ایک ہی آدمی سے حساب لیا جائے" (الطبری، ج ۴ ص ۲۲۷، ۲۲۸)

غور فرمائیے اگر کسی شخص کو صحیح معنوں میں اس ذمہ داری کا احساس ہو تو وہ کسی منصب کی آرزو کر سکتا ہے؟ کون اس بات پر تیار ہو گا کہ سابقہ ذمہ دار کو سبکدوش کر کے اس ذمہ داری کا بوجھ خود اٹھا لے؟ یہی وجہ ہے کہ اسلام میں صدارت کے لیے کوئی مدت مقرر نہیں، وہ تاحینِ حیات صدر رہے گا۔ خلفائے راشدین کے دور میں ہمیں تعین مدت کی کوئی گنجائش نظر نہیں آتی۔ تعیینِ مدت کی ضرورت صرف اسی صورت میں پیش آتی ہے جب احساس ذمہ داری ختم ہو جائے اور منصب کو ایک حق سمجھ لیا جائے۔

۹۔ پارٹی سسٹم اور انتخابات

اس موضوع کو سمجھنے کے لیے مندرجہ ذیل نکات کو ملحوظِ خاطر رکھنا ضروری ہے:

۱۔ ایک اسلامی مملکت میں بنیادی طور پر دو ہی قسم کی پارٹیاں ہو سکتی ہیں۔ ایک وہ جو اسلامی نظریات کی حامل اور اس کے فروغ کے لیے کوشاں ہو۔ یہ پارٹی حزب اللہ ہے اور دوسری وہ جو اسلام دشمن ہو، خواہ وہ غیر مسلموں پر مشتمل ہو یا ایسے مسلمانوں پر جو اسلامی نظریات سے متضاد نظریات رکھتے ہوں۔ قرآن کی اصطلاح میں یہ پارٹی "حزب الشیطان" ہے۔

۲۔ حزب الشیطان نہ انتخاب میں حصہ لے سکتی ہے اور نہ کاروبارِ حکومت میں۔

۳۔ حزب اللہ میں بھی اسلامی احکام کے نفاذ اور ملک کا نظم و نسق چلانے کے سلسلے میں فروعی اختلافات ہو سکتے ہیں اور ایک سے زیادہ پارٹیاں وجود میں آسکتی ہیں تاہم یہ چند ایک ہی ہو سکتی ہیں۔

۴۔ صدرِ مملکت کا انتخاب اگر اسی طرح ضروری ہو تو اس کا طریقہ یہ ہونا چاہیے کہ یہ جماعتیں خود صدارت کے لیے اپنے نمائندوں کے نام پیش کریں اور اُن کی اہلیت اور تجربہ سے متعلق کنویسنگ کرنا جائز ہے۔ نیز ان کی موجودہ املاک کا اعلان بھی کر دیں تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ ان کے سامنے اس منصب سے دنیوی مال و متاع سمیٹنا مقصود نہیں ہے۔

۵۔ انتخاب کے لیے ایک دن مقرر کر دیا جائے اور سپریم کورٹ کا چیف جسٹس عارضی طور پر صدر کے فرائض سرانجام دے اور الیکشن کرائے۔

۶۔ الیکشن میں صرف وہ اشخاص حصہ لیں جو ووٹر کی شرائط پوری کرتے ہیں جن کی تفصیل پہلے گزر چکی ہے۔

۷۔ جس پارٹی کا امیدوار سب سے زیادہ ووٹ حاصل کرے گا وہی صدر منتخب ہو گا۔

مجلسِ شوریٰ اور کابینہ کی تشکیل: فرض کیجیے کہ الیکشن میں چار جماعتوں نے حصہ لیا ہے تو اب منتخب شدہ صدر ان چاروں جماعتوں کے حاصل کردہ ووٹوں کی نسبت سے اپنی شوریٰ اور اسی طرح اپنی کابینہ تشکیل دے گا اور اس کابینہ کی شکل مخلوط ہرگز نہ ہو گی بلکہ یہ ایک قومی کابینہ ہو گی جس کے تمام وزراء قرآنی ارشاد کے مطابق ایک بنیان مرصوص کی طرح کام کریں گے۔ ایسی ہی کابینہ کو بعد میں ہونے والے صدر کے انتخاب کا حق دیا جا سکتا ہے۔

۹۔ یک دیوانی مقننہ یا دو ایوانی مقننہ؟

دورِ نبوی یا دورِ خلفائے راشدین میں بعض معاملات تو ایک ہی مجلس میں حل ہو جاتے تھے، اور بعض معاملات کے فیصلہ کے لیے کئی کئی مجالس منعقد کرنا پڑتیں اور بعض اوقات یہ مجالس پہلے اصحاب سے مختلف دوسرے اصحاب پر مشتمل ہوتی تھیں۔ طاعون زدہ علاقہ میں داخل ہونے یا وہاں سے نکلنے کے متعلق حضرت عمرؓ نے پہلے مہاجرین اولین کو بلا کر ان سے مشورہ کیا پھر انصار کو بلا کر ان سے مشورہ کیا پھر بزرگ قریشی مہاجرین کو بلا کر مشورہ کیا اور انہی کی رائے پر آپؓ نے فیصلہ دیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی نقطۂ نظر سے دو ایوانی مقننہ کی بھی گنجائش ہے تاہم یہ ضروری بھی نہیں۔

۱۰۔ امیدوار کا خود کو پیش کرنا اور کنویسنگ کرنا

اسلامی نقطۂ نظر سے امارت یا اور کوئی منصب طلب کرنا، یا اس کی آرزو کرنا یا اس کے لیے کنویسنگ کرنا ایک مذموم فعل ہے۔ (تفصیل کے لیے دیکھیے مذکورہ کتاب ص ۳۱ تا ۳۳ اور صفحہ ص ۱۰۸ تا ۱۱۳)

خلافت[1] وجمہوریت کے مسئلہ پر

وفاقی شرعی عدالت سے موصولہ سوالنامہ کا جواب

وفاقی شرعی عدالت پاکستان نے مختلف مکاتیب فکر کے علمائے کرام کو خلافت کے قیام اور انتخابات کے موضوع پر ایک سوالنامہ ارسال کیا۔ مولانا عبدالرحمٰن کیلانی حفظہ اللہ (مصنف "خلافت وجمہوریت") کو بھی یہ سوالنامہ ملا۔ مولانا نے اس سوالنامہ پر بحث کے لیے علمائے اہلحدیث کے مختلف اجلاس بلا کر بحث کی اور کتاب وسنت اور سلف کے منہج کے مطابق تفصیلی جواب ارسال کیا جو ہدیہ قارئین ہے۔ جن علمائے سے مجالس کی گئیں ان کے اسمائے گرامی: مولانا حافظ صلاح الدین یوسف، مولانا قاری نعیم الحق نعیمی، مولانا حافظ عبدالرحمٰن مدنی ہیں۔ (ادارہ)

پہلا سوال:۔ اسلامی تصورِ خلافت کے بنیادی اُصول کیا ہیں؟

جواب:۔ اس سوال کو ہم دو حصوں میں تقسیم کرتے ہیں ایک یہ کہ نظامِ خلافت کی امتیازی خصوصیات کیا ہیں وہ جو دیگر نظام ہائے سیاست میں نہیں پائی جاتیں۔ اور دوسرے یہ کہ وہ لازمی اُصول کیا ہیں جو بہرحال کسی نہ کسی شکل میں دوسرے نظاموں میں پائے جاتے ہیں تاہم خلافت میں ضروری ہیں۔

امتیازی خصوصیات

اللہ تعالیٰ کی حاکمیت اللہ تعالیٰ کی حاکمیت سے مُراد یہ ہے کہ قانونی مقتدرِ اعلیٰ صرف اللہ تعالیٰ ہے دوسرے تمام نظاموں میں مقتدرِ اعلیٰ یا تو کوئی ایک فرد ہوتا ہے یا ادارہ۔ ملوکیت میں بادشاہ کی ذات مقتدرِ اعلیٰ ہوتی ہے اور جمہوریت میں قانونی بالادستی

[1] یہ مضمون مجلہ الدعوۃ جمادی الثانی ۱۴۱۰ھ میں شائع ہوا۔

پارلیمنٹ کو حاصل ہوتی ہے۔ خلافت میں یہ بالادستی صرف کتاب و سنّت کو حاصل ہے۔ یہی اس کا آئین ہے اس میں نہ کسی کو ترمیم و تنسیخ کا حق حاصل ہے اور نہ ہی اس کے مقابلہ میں کوئی دوسرا آئین پیش کرنے کا۔

قومیت و وطنیت کی بجائے ملّت کا تصوّر

نظامِ خلافت میں علاقائی، نسلی، لونی، لسانی اور قومی ترجیحات کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِنْ ذَكَرٍ وَأُنْثَىٰ وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ۔ (۴۹/۱۳)

"لوگو! ہم نے تمھیں ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور تمھاری قومیں اور قبیلے بنائے تاکہ ایک دوسرے کی شناخت کرسکو اور خدا کے ہاں تم میں سے سب سے زیادہ عزّت والا وہ ہے جو زیادہ پرہیزگار ہے۔"

یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ باقی تمام نظام ہائے سیاست میں ریاست کے ترکیبی اجزاء چار ہیں۔

ا۔ آبادی ب۔ علاقہ ج۔ حکومت د۔ اقتدارِ اعلیٰ

مگر نظامِ خلافت کے لیے مخصوص علاقہ کی کوئی شرط نہیں ہے۔ یہ کسی مخصوص علاقہ کی شرط سے آزاد ہے اور اس کا مقصد عمدہ عالمی نظام قائم کرنا اور اس کی تعمیر و سربلندی ہے اور دُنیا میں قیامِ امن کے لیے ضروری ہے کہ مقتدرِ اعلیٰ صرف اللہ تعالیٰ ہو۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ملّتِ اسلامیہ کی تنظیم کا جو نقشہ پیش فرمایا اس میں بھی علاقہ یا وطن کا تصوّر یکسر معدوم ہے۔ اسی تصوّر کو علامہ اقبالؒ نے یوں واضح کیا ہے ؎

ہر مُلک مِلک ماست کہ مِلک خدائے ماست

نظامِ اقتدار کے بجائے نظامِ اطاعت

اس نظام میں خلیفہ یا حاکم اور ایک عام انسان قانونی لحاظ سے ایک ہی سطح پر ہوتے ہیں۔ سب کے حقوق و فرائض پہلے سے طے شدہ ہیں جن میں خلیفہ یا کوئی دوسرا حاکم اپنی مرضی سے ردّوبدل نہیں کرسکتا۔ اس نظام میں خلیفہ کی حکمرانی صرف ان معنوں میں ہے کہ وہ خدائی قوانین کی مشترکہ اطاعت کے لیے طریقِ کار وضع کرے اور رعایا میں اس کی تنفیذ کے لیے تدبیری قوانین بنائے اور ان کا

نفاذ کرے۔ وہ اللہ کے احکام پہلے اپنی ذات پر نافذ کرتا ہے۔ پھر دوسروں کو ساتھ لے کر چلتا ہے۔

اس تصورِ حیات کا فائدہ یہ ہے کہ رعایا حکمران کے نافذ کردہ قوانین و احکام کی بسر و چشم اطاعت کرتی ہے کیونکہ اس کا عین مقصود بھی وہی ہوتا ہے۔ اس طرح راعی اور رعایا کے درمیان نفرت انگیز تصورات کی بجائے اخوت، ہمدردی اور مساوات جیسے جذبات فروغ پاتے ہیں۔

دین و دنیا کا حسین امتزاج

اس امتیازی خصوصیت کو اللہ تعالیٰ نے درج ذیل آیت میں واضح فرمایا ہے:-

اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّکَّنّٰهُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْکَرِ۔ (۲۲ - ۴۱)

" یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر ہم انھیں زمین میں اقتدار بخشیں تو نماز قائم کریں زکوٰۃ ادا کریں نیک کام کرنے کا حکم دیں اور بُرے کاموں سے منع کریں۔"

اس آیت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک اسلامی ریاست کی بنیادی ذمہ داریاں یہ ہیں کہ وہ نماز اور زکوٰۃ کا نظام قائم کرے، حکومتی سطح پر مکروہ کاموں کی روک تھام اور نیک کاموں کی حوصلہ افزائی کرے اور جو چیزیں اس نظام کی راہ میں رکاوٹ کا سبب بنتی ہیں انہیں دُور کیا جائے اور اسی کا نام جہاد ہے۔

اس آیت میں معاشرہ میں تقویٰ پیدا کرنے کے لیے نظامِ صلوٰۃ، معاشی ناہمواریاں دُور کرنے کے لیے نظامِ زکوٰۃ اور معاشرے سے فحاشی کے خاتمہ کرنے، عدل اور امن و امان قائم کرنے، نیز معاشرے کو اخلاقی بنیادوں پر استوار کرنے کے لیے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو تجویز فرمایا گیا ہے۔

غیر اسلامی ریاستوں کی ذمہ داریاں محض یہ ہیں کہ پولیس کے ذریعے امن بحال رکھا جائے، انتظامیہ کے ذریعے کاروبارِ حکومت چلایا جائے اور فوج کے ذریعے سرحدوں کی حفاظت کی جائے یہ ذمہ داریاں ایک اسلامی ریاست بھی پوری کرتی ہے اور یہ اسکا ثانوی فریضہ ہے۔ اس کے امتیازی مقاصد وہی ہیں جو اللہ تعالیٰ نے خود بیان فرمادیئے ہیں۔

یہ تو ظاہر ہے کہ ریاست کا آئین خواہ کتنا ہی بہتر ہو اور حکومت خواہ کس طرز کی ہو اگر اس سے اخلاقی اقدار کو جُدا کر دیا جائے تو کبھی مثبت نتائج برآمد نہ ہوں گے۔ یہی وجہ ہے

کہ اسلام نے حکومت کے نظام کو وہ اہمیت نہیں دی جو اخلاقی اور روحانی اقدار کو دی ہے۔ یہی اخلاقی اور روحانی بنیاد نظامِ خلافت کو دوسرے نظام ہائے سیاست سے ممتاز کرتی ہے۔

عدلیہ کی بالادستی

کہنے کو تو سبھی حکومتیں عدلیہ کی بالادستی کا ڈھنڈورا پیٹتی ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ جب تک مقتدرِ اعلیٰ اللہ تعالیٰ کو تسلیم نہ کیا جائے عدلیہ کی بالادستی ناممکن ہوتی ہے اسلام نے عدلیہ کی بالادستی کا جو تصور پیش کیا ہے وہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خود اپنے آپ کو قصاص کے لیے پیش کرتے ہیں۔ نیز فرماتے ہیں کہ اگر محمدؐ کی بیٹی فاطمہؓ بھی چوری کرے تو اللہ کی قسم اس کے بھی ہاتھ کاٹ دوں۔ حضرت عمرؓ اپنے دورِ خلافت میں بحیثیتِ مدعاعلیہ عدالت پیش ہوتے ہیں اور فیصلہ آپ کے خلاف ہو جاتا ہے۔ حضرت علیؓ خود اپنے دورِ خلافت میں ایک یہودی پر چوری کرنے کا دعویٰ عدالت میں پیش کرتے ہیں جو خارج کر دیا جاتا ہے۔

اب دیکھئے جہاں عدالت کسی ممبر اسمبلی کو فوجداری مقدمہ میں عدالت میں طلب کرنے کا اختیار ہی نہ رکھتی ہو یا انتظامیہ کے حکام عدالتِ عظمیٰ کے ججوں کو کوئی طرح سے مرعوب کر سکتے ہوں جہاں بوقتِ ضرورت قوانین میں تبدیلی کر کے عدلیہ کو بے دست و پا کیا جا سکتا ہو تو کیا ایسی حکومتیں بھی عدلیہ کی بالادستی کا دعویٰ کر سکتی ہیں؟

بیت المال یا قومی خزانہ میں تصرّف

نظامِ خلافت میں قومی خزانہ قوم کی ملکیت ہوتا ہے۔ اور خلیفہ محض اس امانت کا امین ہوتا ہے۔ اس بیت المال میں نہ تو ناجائز طریقوں سے مال جمع کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی ناجائز راہوں میں خرچ کیا جا سکتا ہے۔ حضرت عمرؓ کے ارشاد کے مطابق خلیفہ کا اپنی ذات کے لیے بیت المال میں اتنا ہی حق ہوتا ہے جتنا کہ ایک یتیم کے سرپرست کا مالِ یتیم میں حق ہوتا ہے۔ اگر یہ سرپرست غنی ہے تو کچھ بھی نہ لے اور اگر محتاج ہے تو اپنی احتیاج کی حد تک معروف طریقہ پر لے سکتا ہے۔

حضرت ابوبکرؓ جب خلیفہ ہوئے تو آپ کے وظیفہ کی تعیین تین افراد حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ اور حضرت ابوعبیدہ بن الجراحؓ جو اس وقت بیت المال کے خازن تھے، نے کی۔ یہ وظیفہ چار ہزار درہم سالانہ تھا جو ایک متوسط گھرانہ کے اخراجات کو ملحوظ رکھ کر طے کیا گیا تھا۔ حضرت ابوبکرؓ جب فوت ہونے لگے تو وصیت فرمائی کہ میں نے جو دو سال میں آٹھ ہزار درہم بطور

وظیفہ بیت المال سے لیے ہیں میرا مکان بیچ کر یہ رقم بیت المال کو واپس کر دی جائے۔

حضرت عمرؓ نے اپنا وظیفہ متوسط گھرانہ کے بجائے ایک عام آدمی کی گزران کے مطابق خود طے کیا اور یہ حضرت ابوبکرؓ کے وظیفہ کے نصف سے بھی کم تھا۔ آپ اس وظیفہ میں تنگی سے گذارا کرتے رہے۔ تاآنکہ آپ نے بدری صحابیوں کا پانچ ہزار درہم سالانہ وظیفہ مقرر کر دیا جو بدری ہونے کی حیثیت سے آپ کو بھی ملا۔ پھر جب یہ وظیفہ ملا تو آپؓ نے بیت المال سے وظیفہ لینا چھوڑ دیا۔

ایک دفعہ آپ کو اپنی بیماری کے علاج کے لیے شہد کی ضرورت پیش آگئی۔ بیت المال میں شہد موجود تھا لیکن آپ نے پہلے عام لوگوں میں یہ مسئلہ پیش کر کے ان سے اجازت طلب کی پھر بقدرِ ضرورت شہد لیا۔

اب اس کے مقابلے میں بادشاہوں کے ٹھاٹھ باٹھ سے قطع نظر ذرا جمہوری ممالک کے سربراہوں کی تنخواہوں اور سرکاری مراعات پر نظر ڈالیے کہ کیا ان کے ٹھاٹھ باٹھ کہیں بادشاہوں سے کم نظر آتے ہیں؟ جن جمہوری ممالک میں صورتحال یہ ہو کہ سربراہ مملکت تو ایک طرف، تمام گورنروں اور وزیراعظموں کو یہ اختیارات حاصل ہوں کہ وہ اتنی رقم تک محض اپنی صوابدید کے مطابق جہاں چاہیں خرچ کر سکتے ہیں، وہاں یہ دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ قومی خزانہ عوام کی ملکیت ہوتا ہے؟

لازمی خصوصیات

شورائی طرزِ حکومت مشورہ تو بادشاہ بھی اپنے مشیروں سے کیا ہی کرتے ہیں مگر بحیثیت بنیادی اصول یہ چیز خلافت اور جمہوریت میں ہی پائی جاتی ہے اسی بنا پر عموماً یہ سمجھا جاتا ہے کہ جمہوریت، خلافت سے قریب تر نظامِ حکومت ہے۔ اور اسی لیے اس نظام کو اسلام کا لبادہ پہنانے کی کوششیں کی جا رہی ہیں۔ مگر اس اصولِ مشورہ سے متعلق بھی خلافت اور جمہوریت میں بہت سے فرق پائے جاتے ہیں جو درج ذیل ہیں۔

ا۔ جمہوریت میں ہر کس و ناکس کو مشورہ دینے کا مستحق قرار دیا گیا ہے خواہ یہ اسمبلیوں کے اندر کا معاملہ ہو یا بذریعہ ووٹنگ انتخاب کا۔ لیکن خلافت میں مشورہ کے مستحق صرف وہ لوگ ہیں جو اس کے اہل ہوں۔

ب۔ جمہوریت میں فیصلہ ووٹوں کی کثرت کی بنا پر کیا جاتا ہے جبکہ خلافت میں مشورہ کا مقصد

اقرب الی الحق دلیل کی تلاش ہوتا ہے اور مشورہ کے مختلف پہلوؤں پر بحث کے بعد آخری فیصلہ امیر مجلس کی صوابدید پر ہوتا ہے جس میں کثرت یا قلّت رائے کو کچھ دخل نہیں ہوتا۔ کثرت رائے کے مطابق فیصلہ کرنے کا سہارا صرف اس وقت لیا جاتا ہے جب دونوں طرف دلائل برابر وزن کے ہوں یا کسی بھی فریق کے پاس سرے سے کوئی دلیل نہ ہو اور اس کی صورت ایسی ہی ہوتی ہے جیسے قرعہ اندازی کی۔ جس سے وضوحِ حق کا کچھ تعلق نہیں ہوتا۔

یہی وہ فرق ہیں جن کی بنا پر علامہ اقبالؒ نے کہا تھا ؎

گریز از طرزِ جمہوری غلام از پختہ کارے شو

کہ از مغز دو صد خر فکر انسانے نمی آید

ج ۔ خلافت میں مشورہ صرف تدبیری اور اختیاری اُمور میں کتاب وسنّت کی حدود کے اندر رہ کر ہی ہو سکتا ہے۔ لیکن جمہوریت چونکہ ایک لادینی نظام حکومت ہے لہٰذا اس میں ہر چیز کو زیرِ بحث لایا جا سکتا ہے اور عوام کی خواہشات کا لحاظ بہرحال مقدم ہوتا ہے۔

فلاحی مملکت فلاحی ریاست سے مراد ایسی ریاست ہے جس میں عوام کی بنیادی ضرورتوں کا خیال رکھا جاتا ہے اگرچہ جمہوری اور سرمایہ دارانہ نظام بھی اس کا دعویدار ہے مگر جہاں سرمایہ داری پر کوئی پابندی نہ ہو اور اس کو پھلنے پھُولنے کے مواقع خوب فراہم ہوں، جہاں سُودی کاروبار سرکاری اور نجی سطح پر چل رہے ہوں، وہاں کی حکومت کہاں تک فلاحی ہو سکتی ہے؟

نظامِ خلافت میں اسکی اصل فرضی زکوٰۃ اور دوسری قسم کے صدقات کا امیروں سے لے کر غریبوں تک پہنچانا ہے۔ موجودہ دَور میں اشتراکیّت فلاحی ریاست ہونے کی سب سے بڑی دعویدار ہے۔ اسی لیے بعض لوگ اشتراکیت کو خلافت کے قریب تر سمجھنے لگے ہیں حالانکہ ان میں بھی بہت فرق ہے۔ خلافت اور اشتراکیت کے فرق درج ذیل اُمور میں ہیں۔

ا ۔ اشتراکیت چونکہ خدا کی قائل ہی نہیں اس لیے اس کی اخلاقی قدریں صرف حالات کے تقاضے ہیں۔ ضرورت پڑنے پر قتل وغارت، غصب وڈاکہ، مار دھاڑ، جھوٹ اور فریب دہی سب کچھ جائز ہوتا ہے جبکہ خلافت دستورِ الٰہی کی پابند ہے اور اس میں ایسے تمام اعمال وافعال بدترین جرائم شمار ہوتے ہیں۔

ب ۔ اشتراکیت سرمایہ داری تو کجا کسی کے حقِ ملکیّت کو بھی تسلیم نہیں کرتی۔ خلافت میں حقِ ملکیت کے جواز کے علاوہ چند پابندیوں کے ساتھ ہر ایک کو دولت کمانے کے مواقع حاصل ہوتے

ہیں۔ پھر اس کمائی ہوئی دولت کے ایک حصّہ سے غریبوں، قرابت داروں اور ہمسائیوں کے حقوق ادا کرنے کا ہر مسلمان ذمّہ دار ہوتا ہے۔ اس طرح اگر انفرادی توجہ کے بعد بھی کسی کی احتیاج باقی رہ جائے تو اس کے لیے حکومت ذمّہ دار ہوتی ہے۔

ج۔ اشتراکیت ہمیشہ قتل وغارت، فریب کاری اور غصب ونہب کی راہ سے قائم ہوتی ہے وہ تمام لوگوں سے ان کی املاک اور وسائلِ رزق چھین کر انہیں اپنی صوابدید کے مطابق لوگوں میں بانٹتی اور ان سے کام لیتی ہے اس طرح ان کی ضروریات تو کسی حد تک پوری ہو ہی جاتی ہیں مگر انسانی زندگی ایک مجبور حیوان کی سی رہ جاتی ہے۔

اس طرح اشتراکیت عوام میں دولت نہیں بلکہ ایک جیسی غربت کو تقسیم کرتی ہے اور خود سب سے بڑی سرمایہ دار اور آمر بن جاتی ہے۔ وہ سرمایہ داری کے جس مفسدہ کو ختم کرنے کے لیے وجود میں آئی تھی اس کی دوسری انتہا کو پہنچ کر خود سب سے بڑی سرمایہ دار بن جاتی ہے۔ گویا سرمایہ دار ممالک میں تو سرمایہ دار عام لوگ ہوتے ہیں جبکہ اشتراکی ممالک میں ان سب سرمایہ داروں کو ملا کر بھی حکومت کی سرمایہ داری ان سے بڑھ جاتی ہے۔

لہٰذا یہ نظام بھی خلافت کے قریب تو درکنار بلکہ صحیح معنوں میں اس سے متصادم ہے۔

آزادیٔ رائے وخیال یہ قدر خلافت اور جمہوریت میں مشترک ہے مگر اس کے استعمال میں بہت فرق ہے۔ خلافت میں یہ آزادیٔ رائے شریعت کی حدود کے اندر ہی استعمال ہو سکتی ہے اور صرف ان معنوں میں لامحدود ہے جیسا کہ ایک عورت نے حضرت عمرؓ پر حق مہر کی تعیین کے معاملہ میں تنقید کی تو آپؓ نے نہ صرف اسے برداشت کیا بلکہ خود رجوع کیا اور اس عورت کی حوصلہ افزائی کی۔ لیکن جمہوریت میں یہ آزادی لامحدود اور بے لگام ہے اسی وجہ سے کہیں اسلام مُردہ باد اور سوشلزم زندہ باد کے نعرے لگائے جاتے ہیں، کہیں قرآن کو ایک فرسودہ کتاب قرار دیا جاتا ہے اور کہیں جلا دیا جاتا ہے اور کہیں خطبہ حجۃ الوداع کو ضبط کیا جاتا ہے، سُرخ انقلاب اور انتقام کی دھمکیاں دی جاتی ہیں اور کہیں علاقائی اور لسانی تعصبات پھیلا کر اسلام اور نظریۂ پاکستان کی بیخ کنی کی جاتی ہے اور یہ سب کچھ جمہوریت میں اس لیے گوارا کر لیا جاتا ہے کہ اس کی بنیاد لادینیت اور آزادیٔ بے لگام ہے۔

دُوسرا سوال :۔ کیا خلیفہ مقرر کرنے کے لیے بیعت لازمی ہے؟

جواب :۔ خلیفہ کا تقرّر بیعت سے نہیں بلکہ اہل حل وعقد کے مشورے سے ہوتا ہے۔ اس

سلسلہ میں البدایہ والنہایہ کا درج ذیل اقتباس فیصلہ کُن ہے۔

ترجمہ :- تین دن بعد جب حضرت عبدالرحمانؓ بن عوف مسجد میں خلافت کا اعلان کرنے والے تھے تو کچھ لوگوں نے اعلان سے قبل اپنی رائے ظاہر کرنا شروع کر دی تھی۔ حالانکہ یہ لوگ شورای میں سے نہ تھے مثلاً حضرت عمار نے کہا کہ میں حضرت علیؓ کو مستحق خلافت سمجھتا ہوں ابن ابی سرح اور عبداللہ بن ربیعہ نے کہا کہ ہم حضرت عثمانؓ کو زیادہ مستحق و مناسب پاتے ہیں۔ یہ صورتِ حال دیکھ کر حضرت سعد بن ابی وقاصؓ نے حضرت عبدالرحمانؓ بن عوف سے کہا : آپ دیر کیوں کر رہے ہیں ؟ اندیشہ ہے کہ مسلمانوں میں کوئی فتنہ پیدا ہو جائے لہٰذا جلد اپنی رائے کا اظہار کر کے یہ مسئلہ ختم کرو۔ چنانچہ آپؓ نے اعلان کر دیا۔"

(البدایہ والنہایہ ج ۸ ص ۲۷۵)

حضرت عبدالرحمانؓ بن عوف نے یہ اعلان کن الفاظ کے ساتھ فرمایا تھا ؟
یہ تفصیل بخاری کی درج ذیل حدیث میں ملاحظہ فرمائیے۔

امّا بعد ! یا علی انی قد نظرت فی امر الناس فلم ار ھم یعدلون بعثمانؓ فلا تجعلن علی نفسك سبیلا۔ فقال ابایعك علی سنّة الله ورسوله والخلیفتین من بعده فبایعه عبد الرحمٰن وبایعه الناس من المهاجرون والانصار وامراء الاجناد والمسلمون۔

(بخاری کتاب الاحکام باب کیف یبایع الامام الناس)

ترجمہ :- " اما بعد ! اے علیؓ ! میں نے اس معاملہ میں سب لوگوں کا نظریہ معلوم کیا ہے اور تم بُرا نہ ماننا، وہ حضرت عثمانؓ کے برابر کسی کو نہیں سمجھتے۔

پھر حضرت عثمانؓ سے کہا۔ " میں اللہ کے دین، اس کے رسولؐ کی سُنت اور اس کے بعد کے دونوں خلیفوں کے طریق پر بیعت کرتا ہوں" یہ کہہ کر حضرت عبدالرحمانؓ نے بیعت کی اور جتنے مہاجرین و انصار، فوجوں کے سردار اور عام مسلمان وہاں موجود تھے۔ سب نے بیعت کی۔"

ان دونوں روایات سے معلوم ہوا کہ خلیفہ کا انتخاب اہل الرائے کے مشورہ سے طے پاتا ہے۔ بیعت سے فقط اہل الرائے کے فیصلہ کی توثیق مقصود ہوتی ہے۔ اور مملکت کو استحکام نصیب ہوتا ہے۔

حضرت ابوبکرؓ نے حضرت عمرؓ کو نامزد کیا تاہم فرداً فرداً اہل الرائے سے مشورہ کیا اور اگر کسی نے اختلاف کیا تو آپؓ نے اس کی رائے کو بھی ہموار کیا اور اپنا ہمنوا بنانے کے بعد حضرت عمرؓ کی خلافت کا اعلان کرادیا بیعت بعد میں ہوئی۔

حضرت علیؓ کی خلافت کے انعقاد میں چونکہ اہل الرائے کے درمیان مشورہ نہ ہوسکا اور جو کچھ ہوا وہ جبری طور پر اور ہنگامی صورتِ حال میں ہُوا۔ لہٰذا اہل حل وعقد میں سے اکثر نے بیعت بھی نہ کی اور وہاں سے چلے گئے۔ جس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ آپؓ کی خلافت کو کسی وقت بھی استحکام نصیب نہ ہوسکا۔

حضرت ابوبکرؓ کے انتخاب کے وقت بھی حالات ہنگامی تھے اور اہل الرائے کے مشورہ کا وقت ہی نہ تھا۔ لیکن جب حضرت عمرؓ نے اکیلے ہی فیصلہ کرکے آپ کی بیعت کرلی تو سب لوگوں نے حضرت ابوبکرؓ کی بیعت کرلی۔ جس کی وجہ صرف یہ تھی کہ اُمّت میں حضرت ابوبکرؓ کے پایہ کا کوئی دوسرا آدمی موجود نہ تھا۔ لہٰذا آپؓ کی خلافت کو استحکام مِل گیا۔ اس وقت صرف حضرت سعد بن عبادہؓ اور حضرت علیؓ نے بیعت نہ کی تھی لیکن بعد میں ان بزرگوں نے بھی بیعت کرلی تھی۔

ان تمام واقعات سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ خلیفہ کا تقرر تو اہل الرائے کے فیصلے سے ہوجاتا ہے۔ البتہ اس فیصلہ کی توثیق اور استحکامِ مملکت اہل الرائے کی بیعت سے ہوتا ہے اور عام لوگوں کی بیعت خواہ یہ بالواسطہ ہو یا بلاواسطہ، اہل الرائے کے فیصلہ کی مزید توثیق کرتی ہے۔

سابق خلیفہ کے عہد (نامزدگی ولی عہد) سے بھی تقرر ہوجاتا ہے مگر توثیق پھر بھی اہلِ حل وعقد کی بیعت سے ہی ہوتی ہے [1]

تیسرا سوال:۔ کیا اسلام میں خلافت کا قیام ایک لازمی ضرورت ہے؟ یا خلافت کے علاوہ بھی کوئی اور نظامِ حکومت قابلِ قبول ہوسکتا ہے؟

جواب:۔ پہلے سوال کے جواب کی تفصیل سے معلوم ہوجاتا ہے کہ دوسرا کوئی نظامِ سیاست بھی نظامِ خلافت کے امتیازی تقاضے پورے نہیں کرسکتا لہٰذا نہ تو کسی متبادل نظامِ سیاست سے کام چل سکتا ہے اور نہ ہی کسی قسم کی پیوندکاری سے۔ بقولِ اقبالؒ ؎

باطل دوئی پسند ہے حق لاشریک ہے　　　شرکت میانہ حق و باطل نہ کر قبول

---

[1] واضح رہے کہ بیعت کا مطلب خلیفہ کے ساتھ سمع و طاعت کا ایک معاہدہ ہوتا ہے نہ کہ خلیفہ کا انتخاب، جبکہ ووٹ کا مقصد اکثریت کی بناء پر اسمبلی کے ممبران کا انتخاب ہوتا ہے یہی فرق ہے ووٹ اور بیعت میں (ع۔ق۔ سلفی)

رہے اضطراری حالات تو یہ سب کچھ قہراً واضطراراً ہوگا جن کا اُصولی بحث سے کچھ تعلق نہیں۔

چوتھا سوال :۔ سورۂ الشوریٰ کی آیت" وامرھم شوریٰ بینھم" کے تحت مشورہ سے کیا مراد ہے ؟ اور اس کی عملی صورتیں کیا ہوسکتی ہیں ؟

جواب :۔ آیت کے اس ٹکڑے سے مراد یہ ہے کہ مسلمانوں کے معاملات باہمی مشورے سے طے ہونے چاہئیں۔ یہاں معاملات سے مراد ریاست کے تدبیری اور اجتہادی اُمور ہیں۔ مشورہ میں ہرکس و ناکس اور تمام کے تمام لوگوں کو شریک کرنا ضروری نہیں۔ بلکہ صرف اہل الرائے کا مشورہ ہی کافی ہوتا ہے۔

اس پر عقلی دلیل تو یہ ہے کہ آپ کو اپنے کسی ذاتی معاملہ میں مشورہ مطلوب ہو تو آپ ہرکس و ناکس یا سبھی لوگوں سے مشورہ نہیں لیتے بلکہ صرف اس سے لیتے ہیں جسے اس کا اہل سمجھتے ہیں — تو کیا ریاست کے اُمور ہی ایسے گئے گذرے ہیں کہ ان میں ہر ایک کو شریک کر لیا جائے ؟ اور پھر یہ تو واضح ہے ہی کہ معاشرے میں سُوجھ بُوجھ رکھنے والے افراد کی تعداد قلیل ہی ہُوا کرتی ہے۔

اور نقلی دلیل یہ ہے کہ قرآن حکیم نے معاشرہ کی اکثریت کو ظالم، فاسق اور جاہل قرار دیا ہے نیز یہ بھی بتلا دیا ہے کہ عالم اور جاہل یا اہل دانش و بے دانش برابر نہیں ہوسکتے۔ نیز یہ بھی بتلایا کہ اگر آپ اکثریت کے پیچھے لگیں گے تو وہ آپ کو بہکا کے چھوڑیں گے۔ علاوہ ازیں جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بدر کے قیدیوں کے متعلق مشورہ فرمایا تو حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کی رائے میں اختلاف واقع ہوگیا تو اس وقت آپؐ نے فرمایا: لَوِاجْتَمَعَا مَا عَصَيْتُكُمَا۔" اگر تم دونوں کسی ایک رائے پر متفق ہوجاتے تو میں اس کا خلاف نہ کرتا" (درمنثور ج ۲۔ص ۹۴)

پھر آپؐ نے حضرت ابوبکرؓ کی رائے کو قبول کر کے قیدیوں سے فدیہ لے کر چھوڑنے کا فیصلہ کر دیا لیکن بعد میں اللہ تعالیٰ نے جو وحی نازل فرمائی وہ حضرت عمرؓ کے فیصلہ کے مطابق تھی۔

اس واقعہ سے درج ذیل نتائج سامنے آتے ہیں۔

(ا) ہر شخص کی رائے کا الگ الگ وزن ہوتا ہے۔

(ب) فیصلہ کثرت رائے پر نہیں ہوتا۔

(ج) آخری فیصلہ کا اختیار میرِ مجلس کو ہوتا ہے۔

(د) یہ فیصلہ اگر غلط بھی ہو تو اس پر پھر بھی عمل ہوگا۔ اور اس کی وہی حیثیت ہوگی کہ اگر مجتہد ٹھیک نتیجہ پر پہنچے تو اس کے لیے دوہرا ثواب ہے اور اگر ٹھیک نتیجہ پر نہ پہنچے تو بھی اس

کے لیے ایک ثواب تو ضرور ہوگا۔

مشیروں کی تعداد

اس بات کو ذہن میں رکھنا چاہیئے کہ اگر مشورہ کسی منصب یعنی ذمہ داری کے متعلق ہو تو اس میں صرف چند اہل حل وعقد کی شمولیت کافی ہو سکتی ہے البتہ یہ مشیر سرکردہ ضرور ہونے چاہئیں اور معاملہ حقوق سے متعلق ہو تو اس میں سب افراد کی بالواسطہ یا بلاواسطہ شمولیت ضروری ہوگی۔ اب ان کی مثالیں ملاحظہ فرمائیں۔

حضرت عمرؓ نے اپنی وفات سے پیشتر جو کمیٹی نئے خلیفہ کے انتخاب کے لیے تشکیل دی تھی۔ اس کے ارکان کی تعداد صرف چھ تھی لیکن یہ سب کے سب اہل الرائے یا اہل حل وعقد تھے اور سب ہی عشرہ مبشرہ میں سے تھے۔ اس وقت عشرہ مبشرہ میں سے سات افراد ہی رہ گئے تھے۔ ان میں آپؓ نے اپنے رشتہ دار حضرت سعید بن زیدؓ کو اس کمیٹی میں شامل نہیں کیا۔ یہ الگ بات ہے کہ جب انتخاب کرنے کا حق حضرت عبدالرحمان کی طرف منتقل ہو گیا تو آپؓ نے اور لوگوں سے بھی مشورے کیے جنھیں آپؓ مشورہ کا اہل سمجھتے تھے۔

اور حقوق کی مثال یہ ہے کہ فتح حنین کے بعد جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تمام اموالِ غنیمت اور قیدی مجاہدین میں تقسیم کر چکے تو اہلِ حنین آپؐ کے پاس آئے اور اموال کی واپسی اور غلاموں کی آزادی کی درخواست کی تو آپؐ نے فرمایا کہ میں نے بہت دیر آپ لوگوں کا انتظار کیا لیکن آپ نہیں آئے اب میں صرف یہ کر سکتا ہوں کہ دونوں چیزوں میں سے ایک چیز جو تم چاہو اسے تم کو واپس دلا دوں۔ انھوں نے کہا کہ پھر غلام واپس دلوا دیجئے۔ آپؐ نے فرمایا کہ میں نماز ظہر کے بعد غلاموں کی رہائی کا مسئلہ سب مجاہدین کے سامنے پیش کروں گا چنانچہ آپؐ نے یہ مطالبہ لوگوں پر پیش کیا تو ان میں سے چند لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مرضی کے مطابق آمنّا وصدّقنا کہا آپؐ نے اس بات کو کافی نہ سمجھا بلکہ فرمایا کہ ہر قبیلہ اپنا ایک سرکردہ نمائندہ (عریف) میرے پاس بھیجے جو مجھے ان کی مرضی سے مطلع کردے۔ یہ آپ نے اس لیے کیا کہ ممکن ہے کہ کوئی شخص غلام چھوڑنے پر رضامند نہ ہو مگر مجمع کے رُعب یا میرے لحاظ کی وجہ سے کُھل کر اپنی رائے کا اظہار نہ کر سکے۔ پھر جب آپؐ کو ان عُرفاء کے ذریعے معلوم ہو گیا کہ سب لوگ غلاموں کو چھوڑنے پر رضامند ہیں تب آپؐ نے یہ فیصلہ کیا۔ گویا اس مشورہ میں بالواسطہ تمام متعلقہ افراد کو شامل کرنا ضروری سمجھا گیا۔

حقوق کی دوسری مثال عراق کی مفتوحہ زمینوں کو قومی تحویل میں لینا ہے۔ مجاہدین یا فوجیوں

کا اصرار یہ تھا کہ جنگِ خیبر کی طرح اموالِ غنیمت کے ساتھ مفتوحہ زمین بھی مجاہدین میں تقسیم ہونی چاہیئے۔ حضرت عمرؓ نے اموال تو تقسیم فرما دیئے لیکن زمین آپؓ بعض ملکی مصالح کی خاطر قومی تحویل میں لینا چاہتے تھے۔ آپؓ نے اس سلسلہ میں اہل الرّائے سے کئی بار مشورہ بھی کیا لیکن بات ختم ہونے میں نہ آتی تھی۔ آخر آپؓ کو بغرضِ استدلال ایک آیت (والّذین جاء ومن بعد ھم) بھی مل گئی جس کی رو سے بعد میں آنے والے لوگوں کو بھی ان اموال میں شامل کیا جا سکتا تھا۔ چنانچہ آپؓ نے ایک مجمع عام بلایا جس میں سب مستحقین کو شامل کیا گیا۔ ان سب کے سامنے آپؓ نے ملکی مصالح بھی پیش کیے اور قرآن سے دلیل بھی۔ اس پر جب سب لوگ مطمئن اور رضامند ہو گئے تب آپؓ نے مفتوحہ زمینوں کو قومی تحویل میں لینے کا فیصلہ سُنا دیا۔

نوٹ :۔ نظامِ خلافت میں مناصب ایک ایسی ذمّہ داری ہے جس کا مطالبہ سرے سے ہے ہی ناجائز اور مطالبہ کرنے پر ملتی بھی نہیں۔ اس لئے کہ خلیفہ کے انتخاب میں یا دوسرے عہدوں کے انتخاب کے لیے صرف چند سرکردہ اشخاص کے مشورے سے انعقاد ہو جاتا ہے لیکن دوسرے نظاموں میں اور بالخصوص جمہوریت میں منصب ایک حق ہے جس میں متعلقہ علاقہ کے سب لوگوں کی شمولیت کو ضروری سمجھ کر ملکی سطح پر انتخاب کروائے جاتے ہیں۔ نظامِ خلافت میں ایسے انتخابات کی ضرورت ہی پیش نہیں آتی۔

پانچواں سوال :۔ کیا نظامِ حکومت کی تشکیل ایسا معاملہ ہے جس میں وقت اور زمانہ کی رعایت کو مدِنظر رکھتے ہوئے اجتہاد کے ذریعے ردّ و بدل کیا جا سکتا ہے؟

جواب :۔ اس سوال کو ہم دو حصّوں میں تقسیم کریں گے — ایک تو یہ کہ —— خلیفہ یا سربراہ کا انتخاب کیسے ہو؟

اور دوسرے یہ کہ —— انتخاب کے بعد نظامِ حکومت کیسا ہو؟

جہاں تک تو خلیفہ کے انتخاب کا تعلق ہے تو اس کے متعلق کوئی نص قطعی وارد نہیں ہے یعنی اسلام نے کوئی اسکی متعین شکل پیش نہیں کی ہے تاہم حضرت عمرؓ کے آخری عمر کے طویل خطبہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ خلافت کے انعقاد کی موزوں ترین شکل مسلمانوں کے مشورہ سے خلیفہ کا انتخاب ہے لیکن حضرت ابوبکرؓ کا انتخاب حقیقتاً ایک شخص یعنی حضرت عمرؓ نے کیا اور اس کی وجوہ بھی آپؓ نے خود ہی بیان فرمائیں۔ ایک وجہ یہ تھی کہ ہنگامی حالات تھے یعنی اگر ایسا نہ کیا جاتا تو کوئی بہت بڑا فتنہ رُونما ہو سکتا تھا۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ حضرت ابوبکرؓ کے پائے کا کوئی دوسرا شخص ہی موجود نہ تھا۔ اس لیے اکیلے حضرت عمرؓ کے انتخاب پر تمام اُمّت نے اتفاق کر لیا۔

اسی طرح حضرت حسنؓ کی خلافت بھی صرف ایک شخص کے انتخاب اور بیعت کے بعد منعقد ہوگئی۔ حالانکہ اس وقت حالات کچھ ہنگامی بھی نہ تھے۔ مزید برآں آپؓ حضرت علیؓ کے بیٹے بھی تھے جو ملوکیت کا ایک پہلو ہے تاہم یہ بات یہاں بھی موجود ہے کہ آپؓ اس وقت اس منصب کے لیے اہل تر شخصیت تھے۔

حضرت ابوبکرؓ نے جب حضرت عمرؓ کو خلیفہ بنانے کا فیصلہ کر لیا تو اعلان سے پیشتر حضرت طلحہؓ نے آپؓ کے ہاں جاکر کہا کہ "آپؓ کے موجود ہوتے ہوئے حضرت عمرؓ کا ہم لوگوں سے کیا برتاؤ تھا؟ اب وہ خلیفہ ہوں گے تو خدا جانے کیا کریں گے؟ آپؓ کو اللہ کے ہاں جانا ہے یہ سوچ لیجئے کہ اللہ کو کیا جواب دیجئے گا؟ حضرت ابوبکرؓ نے کہا کہ میں اللہ سے یہ کہوں گا کہ میں نے تیرے بندوں پر ایسے شخص کو والی بنایا ہے جو تیرے بندوں میں سب سے اچھا تھا۔

ان تصریحات سے یہ واضح ہوتا ہے کہ اصل مقصد کسی اہل تر شخص کا انتخاب ہے اس کے انتخاب کے لیے کوئی بھی طریقہ اختیار کر لیا جائے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں البتہ یہ طریقہ انتخاب شریعت کے خلاف نہیں ہونا چاہیئے۔

اب رہا یہ سوال کہ اہل تر کون ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ علوم شریعہ میں صاحبِ فہم و بصیرت ہونے کے ساتھ ساتھ جس کی اسلامی خدمات سب سے زیادہ ہوں گی وہی اہل تر سمجھا جائے گا۔

سوال کا دوسرا حصہ یہ ہے کہ اگر کوئی کسی جائز یا ناجائز طریقہ سے برسرِ اقتدار آتا ہے تو کیا اسے قبول کر لینا چاہیئے؟ اس سوال کا جواب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے درج ذیل ارشاد میں ملاحظہ کیجیے۔

اِنْ اُمِّرَ عَلَيْكُمْ عَبْدٌ مُجَدَّعٌ يَقُوْدُكُمْ بِكِتٰبِ اللّٰهِ فَاسْمَعُوْا لَهٗ وَاَطِيْعُوْا۔ (مسلم: کتاب الامارۃ)

"اگر تم پر کوئی نکٹا غلام بھی امیر بنا دیا جائے جو اللہ کے احکام کے مطابق تمہاری قیادت کرتا ہے تو اس کی بات سنو اور اطاعت کرو۔"

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اصل مقصد تو نظامِ خلافت کا قیام ہے، چلانے والا کیسا ہے؟ یہ مسئلہ ثانوی حیثیت رکھتا ہے۔ وہ کوئی شاہزادہ ہو یا غلام زادہ، شریف ہو یا کمتر ذات کا، انتخابات سے آیا ہو یا بزورِ بازو مسلط ہو گیا ہو اگر وہ کتاب اللہ کے مطابق نظامِ حکومت قائم کرتا ہے تو یہ سب گوارا ہے اور اس نظامِ خلافت کے انعقاد کے لیے وہ جیسا بھی نظامِ حکومت بنائے گا وُہ بھی

سب کچھ اس کی اپنی صوابدید پر ہے مثلاً وہ اپنی مجلس مشاورت میں سو مشیر رکھنا پسند کرتا ہے یا صرف دس کو ہی کافی سمجھتا ہے مشیروں کا انتخاب خود کرتا ہے یا مشورہ سے کرتا ہے مجلس مشاورت ہفتہ بعد کرتا ہے یا تین ماہ بعد، ایوان ایک ہی کافی سمجھتا ہے یا دو طرح کے پسند کرتا ہے الغرض جیسا نظام حکومت بھی وہ اصل مقصد کو پورا کرنے کے لیے بنائے گا وُہ درست ہوگا۔

چھٹا سوال :۔ اہلِ حل وعقد سے کیا مُراد ہے؟ کیا مشورہ اہلِ حل وعقد سے لینا چاہیئے یا تمام افرادِ اُمّت کو مشورہ میں شریک کیا جا سکتا ہے؟

جواب :۔ اہل حل وعقد یا بست وکشاد وُہ لوگ ہیں جن میں حکومت کی پالیسیوں پر اثر انداز ہونے کی اہلیت موجود ہو۔ جس طرح کی حکومت ہوگی اس کے مطابق اہل حل وعقد کی خصوصیات بھی مختلف ہوں گی مثلاً نظامِ خلافت کے لیے جو اربابِ حل وعقد درکار ہیں ان میں دینی فہم، بصیرت وتقویٰ کے علاوہ ان کی اسلامی خدمات کا نمایاں ہونا بھی لازمی ہے۔

اب رہا یہ سوال کہ ایسے لوگوں کا انتخاب کیسے ہو؟ تو جواب اس کا یہ ہے کہ ایسے لوگوں کو منتخب نہیں کیا جاتا بلکہ وہ خود ہی معاشرہ کی سطح پر نمودار ہوتے ہیں اور آجکل تو یہ معاملہ اور بھی سہل تر ہوگیا ہے ہر طرح کے معروف اشخاص کی فائلیں حکومت کے پاس ہوتی ہیں ان میں سے خلیفہ اپنی صوابدید کے مطابق مطلوبہ افراد کا انتخاب کر ہی سکتا ہے۔

رہی یہ بات کہ مشورہ صرف اہلِ حل وعقد سے کیا جائے یا اس میں تمام افرادِ اُمت کو شریک کیا جائے؟ تو اس کا جواب گذشتہ سوال نمبر ۴ (متعلقہ مشورہ) میں دیا جا چکا ہے۔

ساتواں سوال :۔ اسلام میں سیاسی جماعتوں کی تشکیل کی کیا حیثیت ہے؟

جواب :۔ موجودہ دَور کے ماہرینِ سیاسیات کی مختلف تعریفوں کا ماحصل یہ ہے کہ کسی سیاسی جماعت میں تین عناصر کا پایا جانا ضروری ہے :۔

ا۔ سیاسی عقیدہ

ب۔ رضاکارانہ تنظیم

ج۔ اور تشکیل کا مقصد اقتدار کا حصول ہوتا ہے۔

اب دیکھئے کہ :۔

ا۔ اسلام اپنا سیاسی عقیدہ خود پیش کرتا ہے لہٰذا اس میں مختلف قسم کے سیاسی عقائد کی گنجائش نہیں۔

ب حصولِ اقتدار بلکہ اس کی طلب یا خواہش بھی نصوصِ صریحہ کے مطابق ممنوع ہے تو جب اصل مقصد ہی مشروع نہ ہو تو اس کی تشکیل کیسے جائز ہو سکتی ہے۔

ج۔ مختلف سیاسی جماعتوں کا وجود افرادِ اُمّت کو کئی حصوں میں بانٹ دیتا ہے اور قرآن کریم کی رُو سے یہ بات شرک ہے۔ ارشادِ باری ہے۔

وَلَا تَكُونُوا مِنَ الْمُشْرِكِينَ ○ مِنَ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيَعًا ○ (۳۰-۳۲)

"اور مشرکوں میں سے نہ ہونا۔ ان لوگوں میں سے جنہوں نے اپنے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور خود فرقے فرقے ہو گئے"

اور دوسرے مقام پر فرمایا:۔

وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللهِ جَمِيعًا وَّلَا تَفَرَّقُوا (۳/۱۰۴)

"اور سب مل کر اللہ کی رسی کو تھامے رہو اور فرقے فرقے نہ ہونا"

اور تیسرے مقام پر فرقہ بازی کو اللہ کا عذاب قرار دیتے ہوئے فرمایا:۔

اَوْ يَلْبِسَكُمْ شِيَعًا وَّيُذِيقَ بَعْضَكُمْ بَاْسَ بَعْضٍ ○ (۶/۵۹)

"یا تمھیں فرقے بنا دے اور آپس میں بھڑا کر لڑائی کا مزہ چکھا دے"

د۔ حزبِ اختلاف — جو جمہوریت کا ایک لابدی عنصر ہے، کا فائدہ یہ بتلایا جاتا ہے کہ وہ حزبِ اقتدار کو راہِ راست پر قائم رکھے۔ لیکن عصبیت کی بناء پر عملاً اس کا نقصان اسکے فائدے سے کئی گُنا بڑھ جاتا ہے۔

د۔ سیاسی جماعتوں کا ایک مفسدہ سیاسی جوڑ توڑ بھی ہے اس جوڑ توڑ کے دوران جن جرائم کا ارتکاب کیا جاتا ہے وہ مستزاد ہیں۔ اندریں صورتِ حال ہمارے خیال میں اسلام میں سیاسی جماعتوں کا جواز ممکن نہیں ہے۔

آٹھواں سوال :۔ کیا ایوان میں حزبِ اقتدار اور حزبِ اختلاف کا تصور اسلام کے مطابق ہے؟

جواب :۔ اس سوال کا مجمل جواب تو اُوپر آچکا ہے تفصیل یہ ہے کہ حزبِ اقتدار ہو یا اختلاف، چونکہ دونوں کے مفادات الگ الگ ہوتے ہیں لہٰذا ان میں تصادم ایک لابدی امر ہے۔ اس تصادم کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ قومی اور ملکی مفادات کے معاملے میں کوئی پارٹی بھی مخلص نہیں رہ سکتی۔ حزبِ اقتدار کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ اپنی اکثریت کے بل بوتے پر ایسے تمام قوانین منسوخ کروا دے

جن کی اس پر زد پڑ سکتی ہے اور ایسے قوانین پاس کروائے جن سے آئندہ الیکشن میں اس کی کامیابی کی راہ ہموار ہو۔ دوسری طرف حزبِ اختلاف کا یہ حال ہوتا ہے کہ اگر حزبِ اقتدار کوئی درست کام کر بھی رہی ہو تو اس کی بھی مخالفت وہ اپنا حق سمجھتی ہے۔ یہ سلسلہ یونہی چلتا ہے حتیٰ کہ پانچ سال بعد جو پارٹی برسرِ اقتدار آتی ہے وہ بھی اپنے ہی مفادات کے دَرپے ہوتی ہے۔ اندریں صورتِ حال مُلک کو جو قانونی یا سیاسی استحکام نصیب ہو سکتا ہے وہ ظاہر ہے۔

جب اسلام میں سیاسی جماعتوں کا وجود ہی جائز نہیں تو حزبِ اقتدار اور حزبِ اختلاف کے تصوّر کا سوال ہی کب باقی رہ جاتا ہے؟

نواں سوال :۔ کیا قانون ساز اسمبلی کو قانون سازی کا اختیار حاصل ہے؟ اور کس حد تک؟

جواب :۔ اگر ہم یہ فرض کریں کہ قانون ساز اسمبلی مجلس شوریٰ کا متبادل نظام ہے تو بھی اسے ایسے اُمور میں قانون سازی کا حق حاصل ہے جن کا تعلق تدبیر یا تنظیم سے ہو۔ مثلاً ٹریفک کے قوانین یا ریلوے کے قوانین یا مارکیٹ کے لیے یا ملازموں کے اوقات اور چھٹیوں کے قوانین، ریاست کی عمومی پالیسی، فوجوں کی نقل و حرکت، اعلانِ جنگ، خارجی معاہدات وغیرہ وغیرہ۔ اختیاری امور میں بھی وہ قانون بنا سکتی ہے بشرطیکہ کتاب و سنّت سے ان کا ٹکراؤ نہ ہو۔ مگر یہ بات تو تب ہی ممکن ہے کہ ممبران اسمبلی کتاب و سنّت کی بھی سُوجھ بُوجھ رکھتے ہوں۔

نیز وہ شرعی قوانین کے نفاذ میں پیش آمدہ رکاوٹوں کو دُور کرنے کے لیے ذیلی قوانین (BYE LAWS) بھی بنا سکتی ہے۔ رہا موجودہ اسمبلیوں اور شوریٰ کا فرق تو وہ درج ذیل اُمور میں ہے۔

(ا) شوریٰ کے ممبران اللہ تعالیٰ کی حاکمیت پر ایمان رکھتے ہیں جبکہ جمہوری طرز کی اسمبلیوں کا ڈھانچہ ہی ایسا ہے کہ اللہ کی حاکمیت کا زبانی اقرار کرنے کے باوجود وہ پارلیمنٹ کی حاکمیّت پر منتج ہوتا ہے۔

(ب) اسمبلیوں کے ارکان کی سب سے بڑی اہلیّت یہ ہے کہ وہ سرمایہ دار ہوں۔ سرمایہ ہی کے بل پر وہ انتخاب لڑ سکتے ہیں یا پھر وہ کسی عدالت سے سزا یافتہ نہ ہوں۔ ان کی تعلیم، کردار اور نظریات پر کچھ قدغن نہیں ہوتی۔ جبکہ شوریٰ کے ممبران کی اہلیّت دینی علم سے واقفیت اور تقویٰ ہے اور ان کے انتخاب (SELECTION) پر کچھ خرچ نہیں آتا۔ لہٰذا ان کا سرمایہ دار ہونا ضروری نہیں۔ ایک نان شبینہ کا محتاج بھی شوریٰ کا ممبر بن سکتا ہے۔

(ج) پارلیمنٹ کا کام عوام کی خواہشات کے مطابق قانون سازی ہے خواہ اس کی زد شریعت پر پڑتی ہو۔ جبکہ شوریٰ کے ممبر کتاب وسُنّت کی حدود میں رہ کر ہی ذیلی قوانین بنا سکتے ہیں (جیساکہ پہلے لکھا جا چکا ہے) کیونکہ آئین تو انکے پاس پہلے ہی کتاب وسُنّت کی صورت میں موجود ہوتا ہے۔

(د) جمہوریت میں اسمبلی کی رکنیت چونکہ ایک حق ہے لہٰذا اس کے لیے مدّت کی تعیین ضروری قرار دی گئی ہے۔ تاکہ دوسرے حقداروں کو بھی اس حق کی وصولی کا موقع ملتا رہے مگر شوریٰ میں یہ منصب ایک ذمّہ داری ہے لہٰذا وہ تاحینِ حیات ممبر رہے گا بشرطیکہ وہ نظامِ حکومت کتاب و سُنّت کے مطابق چلا رہا ہو۔ ورنہ جو شوریٰ اُس کی تقرری کا حق رکھتی ہے وہی اسے معزول کرنے کا حق بھی رکھتی ہے۔

دسواں سوال :۔ کیا صدارتی نظام اسلام کے قریب تر ہے یا پارلیمانی نظامِ حکومت ؟

جواب :۔ یہ سوال تو تب ہی پیش آسکتا ہے جب پہلے موجودہ اسمبلیوں کو درست تسلیم کیا جائے۔ پھر اگر ایسی اسمبلیوں کا وجود ہی اسلامی نکتۂ نگاہ سے محلِ نظر ہو تو یہ سوال ہی کب پیدا ہوتا ہے ؟

ہاں !ـــــــ اگر ہم ان اسمبلیوں کو درست فرض کرلیں۔ جن میں ایک صدر ہوتا ہے اور دوسرا وزیر اعظم اور ان میں اختیارات وحقوق کا تنازعہ پیدا ہوجاتا ہے کہ اختیارات صدر کے زیادہ ہوں گے یا وزیر اعظم کے ؟ اس وقت البتہ یہ سوال پیدا ہوسکتا ہے لیکن مشکل یہ ہے کہ اسلامی نظامِ خلافت میں خلیفہ کے مقابل کوئی دوسرا شخص ہوتا ہی نہیں، تو اس صورت میں اسلامی نقطۂ نظر سے کس چیز کو کس پر ترجیح دی جائے ؟

گیارہواں سوال :۔ کیا سربراہِ مملکت کی مدّت کا تعین از رُوئے اسلام دُرست ہے ؟

جواب :۔ مدّت کی تعیین کا سوال صرف اس وقت پیدا ہوتا ہے جب سربراہی کو حق سمجھا جائے تاکہ دوسرے حقداروں کے لیے بھی ایسا موقع فراہم ہوتا رہے لیکن شریعت میں یہ حق ہے ہی نہیں بلکہ ذمہ داری ہے۔ جس کا مطالبہ بھی درست نہیں۔ لہٰذا مدّت کی تعیین کی ضرورت ہی نہیں ہوتی۔ اس میں صرف اور صرف مَا يَقُودُكُمْ بِكِتٰبِ اللّٰهِ کی شرط ہے۔ ہاں ! اگر وہ یہ شرط پوری نہ کرتا ہو تو اس کے متعلق مناسب اقدامات کیے جاسکتے ہیں۔

بارہواں سوال :۔ اسلامی نقطۂ نظر سے ووٹ کی کیا حیثیت ہے ؟

جواب :۔ ووٹر جب کسی نمائندہ کو ووٹ دیتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنا حق

اقتدار یا حقِ حکومت اس نمائندہ کو تفویض کر رہا ہے اور ہم یہ پہلے ہی بتا چکے ہیں کہ اسلامی نقطۂ نگاہ سے عوام اس کے مکلف نہیں ہیں۔ حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد جب کچھ لوگوں نے حضرت علیؓ کو خلیفہ بنانا چاہا تو آپؓ نے فرمایا :۔

"تمہیں ایسا کرنے کا اختیار نہیں ہے یہ تو اہلِ شوریٰ اور اہلِ بدر کے کرنے کا کام ہے۔ جس کو اہلِ شوریٰ اور اہلِ بدر چاہیں گے وہی خلیفہ ہوگا" (الامامۃ لابن قتیبہ ج ۱۔ ص ۴۱)

اور جو اہلِ شوریٰ انتخاب کرتے ہیں وہ ووٹ سے نہیں بلکہ مشورہ سے انتخاب کرتے ہیں۔ تاہم اگر مشورہ کی بجائے ووٹ ہی کا طریقہ بہتر سمجھا جائے تو ووٹ کی حیثیت بھی مشورہ ہی کی ہو گی۔ اور مشورہ سے متعلق حضورؐ کا ارشاد ہے کہ :۔

اَلْمُسْتَشَارُ مُؤْتَمَنٌ۔

"جس سے مشورہ طلب کیا جائے وہ اس کا امین بنایا گیا ہے" (متفق علیہ)

جس کا یہ مطلب ہے کہ مشورہ دینے والے کو مشورہ اپنی یا کسی دوسرے کی غرض کو شامل کیے بغیر دینا چاہیئے اور اس مشورہ کو بطور امانت اپنے پاس محفوظ رکھنا چاہیئے یعنی ہر کسی کو بتلاتے نہیں پھرنا چاہیئے۔

اب جب کہ یہ معلوم ہو چکا کہ پرائیویٹ مشورہ امانت ہوتا ہے تو امانت کے متعلق ارشادِ باری ہے :۔

اِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمَانَاتِ اِلٰى اَهْلِهَا ۝ (۴ - ۵۸)

"اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ امانتیں ان کے اہل افراد کو دو"

علاوہ ازیں ووٹ ایک شہادت بھی ہے کہ ووٹر واقعتاً اس نمائندہ کو ووٹ دے رہا ہے جسے وہ اس کا اہل سمجھتا ہے۔

تیرھواں سوال :۔ رائے دہندگان اور نمائندگان کی شرائط کیا ہونی چاہیئیں؟

جواب :۔

ا۔ ایک اسلامی حکومت میں صرف مسلمان ہی مشورہ یا ووٹ دے سکتا ہے اور مسلمان کی تعریف یہ ہے کہ وہ کم از کم نماز اور زکوٰۃ کا پابند تو ہو۔ ارشادِ الٰہی ہے :۔

فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَاِخْوَانُكُمْ فِى الدِّيْنِ (۹ - ۱۱)

”پھر اگر وہ توبہ کریں اور نماز ادا کرنے لگیں اور زکوٰۃ ادا کرنے لگیں تو وہ دین میں تمہارے بھائی ہیں“۔

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :۔

اُمِرْتُ اَنْ اُقَاتِلَ النَّاسَ حَتّٰی یَشْهَدُوْا اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَیُقِیْمُوا الصَّلٰوةَ وَیُؤْتُوا الزَّكٰوةَ فَاِذَا فَعَلُوْا ذٰلِكَ عَصَمُوْا مِنِّیْ دِمَاءَهُمْ اِلَّا بِحَقِّ الْاِسْلَامِ وَحِسَابُهُمْ عَلَى اللّٰهِ ۔ (مسلم۔ کتاب الایمان - باب - الامر بقتال الناس)

”مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں لوگوں سے جنگ کروں تاآنکہ وہ گواہی دیں کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ کے رسول ہیں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں تو ان کی جانیں محفوظ ہو جائیں گی، اگر وہ ایسا کریں۔ اِلّا یہ کہ وہ اسلام کے کسی حق کے تقاضے سے اس حفاظت سے محروم ہو جائیں اور ان (کے باطن) کا حساب اللہ پر ہے“۔

(ب) علاوہ ازیں ووٹ چونکہ ایک شہادت بھی ہے لہٰذا اس کا عادل ہونا ضروری ہے نیز اس میں کوئی ایسی بات نہ ہو جو شہادت کو ناقابلِ قبول بنادے مثلاً فاسق کی تحقیق کے بغیر شہادت قبول نہیں۔ قاذف کی شہادت بھی مقبول نہیں جب تک کہ وہ اس گناہ سے توبہ نہ کرلے۔ عدالت میں جھوٹا ثابت ہو جانے والے کی آئندہ گواہی قبول نہ ہوگی۔ اسی طرح زانی، چور، ڈاکو، خائن اور گناہِ کبیرہ کے مرتکب افراد کی گواہی قبول نہیں، یہ سب فاسقین کے زمرہ میں آتے ہیں اور یہ غیر عادل قرار پاتے ہیں۔

(ج) اس میں اتنا شعور ہونا چاہیئے کہ وہ جس کے حق میں ووٹ دے رہا ہے آیا واقعی وہ اس کا اہل ہے؟

نمائندہ کی شرائط نمائندہ میں مندرجہ بالا شرائط کے علاوہ دینی تعلیم کی فہم و بصیرت بھی لازمی ہے اور کردار کے لحاظ سے متقی ہونا بھی ضروری ہے۔

چودھواں سوال :۔ قومی یا صوبائی اسمبلیوں کا کوئی امیدوار اپنے آپ کو انتخابات میں پیش کر سکتا ہے۔

جواب: ۔ اس سلسلہ میں درج ذیل ارشادات نبویؐ ملاحظہ فرمائیے۔

(ا) عن عبد الرحمٰن بن سمرة قال، قال لی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم:
"یا عبد الرحمٰن بن سمرة! لا تسئل الامارة فان اعطیتها عن مسئلة وکلت الیها وان اعطیتها من غیر مسئلة اعنت علیها۔

{بخاری - کتاب الاحکام - باب من سال الامارة
مسلم - کتاب الامارة - باب النہی عن طلب الامارة والحرص علیها}

"حضرت عبد الرحمٰنؓ بن سمرة کہتے ہیں کہ مجھ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اے عبد الرحمٰنؓ بن سمرة! حکومت کی درخواست نہ کیجیو۔ اگر درخواست پر تمہیں ملے گی تو تمام تر ذمّہ داری تمہیں پر ہوگی اور اگر بغیر درخواست کے مل جائے تو اللہ تمہاری مدد کریگا۔"

(ب) "عن ابی موسیٰ قال: ادخلت علی النبی صلی اللہ علیہ وسلم انا و رجلان من بنی عمّی - فقال احد الرجلین: یا رسول اللہ! امّرنا علی بعض ما ولاك اللہ عز وجل وقال الآخر مثل ذلك - فقال: اما و اللہ لا نولی علی هذا العمل احدا یسئله ولا احد حرص علیه"

{بخاری - کتاب الاحکام - باب ما یکره من الحرص علی الامارة
مسلم - ایضاً}

"حضرت ابو موسیٰؓ کہتے ہیں کہ میں اور میرے دو چچا زاد بھائی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس گئے۔ ان میں سے ایک نے کہا: یا رسولؐ اللہ! اللہ عز وجل نے آپ کو جو حکومت بخشی ہے تو اسکے ایک حصے پر ہمیں حاکم بنا دیجئے۔ پھر دوسرے نے بھی ایسی ہی بات کہی۔ آپؐ نے فرمایا: "اللہ کی قسم ہم کسی ایسے آدمی کو حاکم نہیں بنایا کرتے جو اسکی درخواست کرے یا جو اس پر حرص رکھتا ہو۔"

(ج) وفی روایة قال: لا نستعمل علی عملنا من اراده۔

(متفق علیه - حوالہ جات مذکورہ)

"ایک دوسری روایت میں ہے۔ آپؐ نے فرمایا: "ہم اپنے انتظامی امُور میں کسی ایسے شخص کو عامل (حاکم) نہیں بناتے جو اس کا ارادہ رکھتا ہو۔"

(د) عن ابی ذرٍ قال: قلت یا رسول اللہ! "الا تستعملنی؟" قال فضرب بیده علی منکبی ثم قال: یا ابا ذر انك ضعیف وانها امانةٌ،

وانها یوم القیٰمۃ خزی وندامۃ الامن اخذھا بحقھا وادّی الذی علیہ فیھا۔ (مسلم۔ حوالہ مذکور)

"حضرت ابوذرؓ غفاری کہتے ہیں کہ میں نے کہا :" اے اللہ کے رسُولؐ ! کیا آپؐ مجھے حاکم نہیں بنا دیتے ؟" تو آپؐ نے اپنا ہاتھ میرے کندھے پر مارا پھر فرمایا :" اے ابوذرؓ ! " تو ضعیف آدمی ہے اور حکومت ایک امانت ہے جو قیامت کے دن رسوائی اور پشیمانی کا باعث بنے گی مگر جس نے اس کی ذمہ داریوں کو نبا ہا اور اس کے پُورے حقوق ادا کئے۔"

(۳) عن ابی ھریرۃؓ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال :" انکم ستحرصون علی الامارۃ وستکون ندامۃ یوم القیٰمۃ فنعم المرضعۃ وبئست الفاطمۃ۔

(بخاری۔ کتاب الاحکام۔ باب۔ مایکرہ من الحرص علی الامارۃ)

" حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :" عنقریب تم لوگ حکومت کی حرص کروگے اور قیامت کے دن اس کی وجہ سے شرمندگی ہوگی (کیونکہ حکومت ایک انّا کی طرح ہے) دودھ پیتے وقت تو مزہ ہے مگر چھٹتے وقت سخت تکلیف۔"

مندرجہ بالا تمام احادیث حدیث کی معتبر ترین کتب بخاری یا مسلم یا دونوں میں سے ہیں۔ ان کے بعد اپنے آپ کو انتخابات میں پیش کرنے کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی۔

پندرہواں سوال :۔ کیا امیدوار انتخابات میں اپنے آپ پر خرچ کرسکتا ہے ؟

جواب :۔ اگر کوئی امیدوار شرعی نقطۂ نظر سے اپنے آپ کو پیش ہی نہ کرسکے تو اس سوال کی گنجائش ہی کہاں رہ جاتی ہے ؟

سولہواں سوال :۔ اگر امیدوار اپنے پاس سے کچھ خرچ نہ کرے تو کیا سیاسی جماعت یا اس کے حلقے کے لوگ اس کے انتخابی مصارف برداشت کرسکتے ہیں ؟

جواب :۔ اس کا جواب بھی وہی ہے جو پندرھویں سوال کا ہے۔

اس سوالنامے سے بادی النظر میں جو تاثر ملتا ہے وہ یہ ہے کہ اگر ہم تاویلات کا سہارا لے کر اور کچھ جمہوری نظام کی خامیوں کی اصلاح کرکے اس نظام کو مسلمان کرلیں تو بہت مناسب ہوگا مگر جب

ہم شریعت کے ٹھوس دلائل کی طرف نظر اُٹھاتے ہیں تو ہمیں تاویلات کے یہ سہارے ہوا میں اُڑتے نظر آتے ہیں۔

ہمارے خیال میں چھ نکات ایسے ہیں کہ جن کی بنا پر جمہوریت اور خلافت میں نہ تو پیوند کاری ممکن ہے اور نہ ہی جمہوریت کو مشرف بہ اسلام کیا جا سکتا ہے حالانکہ اگر جمہوریت میں ان چھ نکات میں سے ایک بھی کم ہو جائے تو جمہوریت کی گاڑی چل نہیں سکتی۔ وہ چھ نکات یہ ہیں :-

(ا) اللہ کی حاکمیت کی بجائے عوام کی حاکمیت۔

(ب) سیاسی پارٹیوں کا وجود۔

(ج) حق بالغ رائے دہی بشمول خواتین (سیاسی و جنسی مساوات) جس کے تحت عورت صدر تک بھی منتخب ہو سکتی ہے۔

(د) درخواست برائے نمائندگی اور اس کے جملہ لوازمات، خرچ اخراجات اور دوسرے جرائم۔

(ر) ہر ووٹ کی یکساں قیمت۔

(س) کثرتِ رائے کی بنیاد پر فیصلے۔

میں یہاں مختصراً صرف ایک مثال پیش کروں گا اور وہ بھی پہلے نقطہ پر جس پر پہلے ہی اسلام کی طرف کافی پیش رفت ہو چکی ہے۔ ہمارے پہلے آئین کے دیباچے میں اللہ کی حاکمیت کو تسلیم کیا گیا تھا۔ اب یہ الفاظ متن میں شامل کیے جا چکے ہیں لیکن اس کے باوجود ہم شریعت بل کی منظوری کیلئے پارلیمنٹ کے محتاج ہیں۔ پھر بالادستی پارلیمنٹ کی ہوئی یا شریعت کی؟ اور ہماری انتہائی کامیابی اور خوش قسمتی یہ ہوگی کہ پارلیمنٹ اس بل کو منظور کر لے۔ اب خدا را بتلایئے کہ اس انداز سے نافذ ہونے والی شریعت میں بھی بالادستی پارلیمنٹ کی رہے گی یا شریعت کی؟

یہی تو ہم کہتے ہیں کہ جمہوریت کا ڈھانچہ ہی کچھ ایسا ہے کہ اگرچہ اللہ کی حاکمیت کا ورد سو بار کیا جائے لیکن ہر بات گھوم پھر کر پارلیمنٹ کی بالادستی یا عوام کی حاکمیت پر ہی منتج ہوگی۔ اور اگر اس سے عوام کی حاکمیت یا پارلیمنٹ کی بالادستی کے سوا کوئی اور نتیجہ نکلتا ہے تو یقین جانیے کہ یہ جمہوریت ہرگز نہیں ہو سکتی کوئی اور ہی نظام ہوگا۔ کیونکہ جمہوریت کی تعریف ہی "عوام پر، عوام کے ذریعے اور عوام کی حکومت" ہے۔

بالفاظ دیگر اگر نتیجہ کسی صورت اللہ کی حاکمیت پر منتج ہو تو وہ خلافت ہوگی اور پھر وہ خالص ہو کر رہے گی اور جمہوریت کے سب مفاسد کی اصلاح کیے بغیر نہ رہے گی۔

یہی حال جمہوریت کے باقی پانچ نقاط کا ہے پھر ان سے مزید جو خرابیاں پیدا ہوتی ہیں اور جن شرعی احکام کی خلاف ورزیاں ہوتی ہیں ان کی تفصیل ایک قصہ طولانی ہے جس کا یہاں موقع نہیں۔

دینی رہنماؤں سے چند سوالات

۱۔ کیا شرعی نقطۂ نظر سے کرسی کی آرزو کرنا، پھر اس کے لئے درخواست دینا اور اپنی کامیابی کے لئے کنویسنگ، لمبے چوڑے اخراجات اور دوسرے جائز و ناجائز ذرائع استعمال کرنا جائز ہے ؟

۲۔ کیا اسلام میں سیاسی پارٹیوں بالخصوص حزبِ اقتدار اور حزبِ اختلاف کی گنجائش ہے جبکہ مغربی جمہوری نظام کی گاڑی ان کے بغیر چل ہی نہیں سکتی۔

۳۔ نیز کیا یہ سیاسی پارٹیاں اسی تفرقہ بازی کی تعریف میں نہیں آتیں، جو علاقائی اور لسانی تعصبات کی بنیاد پر قائم ہوتی ہیں اور جن سے سختی سے منع کیا گیا ہے اور اس کام کو کفر و شرک تک کے الفاظ سے تعبیر کیا گیا ہے؟

۴۔ کیا ایک فاسق اور بے دین آدمی ایک اسلامی ریاست کے کسی منصب کے انتخاب میں ووٹ دے سکتا ہے ؟ نیز کیا وہ خود اس انتخاب میں حصہ لے سکتا ہے ؟

۵۔ کیا ایک جاہل آدمی اور ایک عالم دین متقی اور دیندار کے ووٹ کی قیمت برابر ہو سکتی ہے ؟

۶۔ کیا آپ اپنے ذاتی معاملات میں ہر کس و ناکس سے رائے لیتے یا مشورہ کرتے ہیں؟ اگر اس کا جواب نفی میں ہو تو ملکی امور میں یہ کیسے گوارا کر لیا جاتا ہے ؟ بالخصوص اس

صورت میں کہ قرآن کی رُو سے بھی اور ہمارے مشاہدہ کی رُو سے بھی معاشرہ کی اکثریت جاہل اور فاسق لوگوں پر مشتمل ہوتی ہے۔

۷۔ کیا عورت کو سیاسی سرگرمیوں میں از روئے شرع حصّہ لینے کی اجازت ہے کہ وہ انتخاب لڑکر اسمبلیوں تک بھی پہنچ سکتی ہے بالخصوص ایسے حالات میں جبکہ اختلاطِ مرد و زن پر بھی کوئی پابندی نہ ہو ؟ بلکہ اسے ناروا اور عورت کا حق چھیننے کے مترادف قرار دیا جا رہا ہو اور اس اختلاط اور فحاشی کی ہر سطح پر سرپرستی کی جا رہی ہو ؟

۸۔ کیا قرنِ اوّل میں کوئی ایسی مثال ملتی ہے کہ عورتیں کسی قابلِ ذکر منصب پر فائز رہی ہوں ؟

۹۔ کیا اسمبلیوں میں غیر مسلموں کی شمولیت از روئے اسلام برداشت کی جا سکتی ہے ؟

۱۰۔ موجودہ جمہوری نظام میں صدر اور وزیر اعظم کے اختیارات میں جو کمی بیشی اور تصادم ہوتا رہتا ہے اس کی مثال خلافتِ راشدہ کے دَور میں کہیں ملتی ہے ؟ بالفاظِ دیگر اس دَور میں امیر کے علاوہ کسی اور منصب کا بھی کبھی انتخاب ہوا ہے ؟

۱۱۔ کیا اکثریت کی بنیاد پر فیصلہ کرنا ضروری ہے ؟ اگر یہ ضروری ہے تو خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیبیہ کے مقام پر صلح کرنے کا اور صدیقِ اکبرؓ نے سریۂ اسامہ کی روانگی اور مانعینِ زکوٰۃ سے جنگ کرنے کا فیصلہ کس بنیاد پر کیا تھا۔ جبکہ شوریٰ میں سے کوئی بھی ان کا حامی نہ تھا ؟

۱۲۔ بعض جمہوریت پسند اسمبلی کو شوریٰ کا نعم البدل قرار دیتے ہیں۔ جبکہ شوریٰ میں غیر مسلموں اور عورتوں کی شمولیت کے علاوہ ان ہر دو کے ممبران کی اہلیت، طریقِ مشورہ اور اور طریقِ فیصلہ میں فرق اور تضاد ہے۔ ان تمام اُمور کی موجودگی میں کیا ہم پارلیمنٹ کو شوریٰ کا متبادل یا نعم البدل قرار دے سکتے ہیں ؟

۱۳۔ جمہوری نظام کا ڈھانچہ ہی ایسا ہے جو عوام کی حکومت پر منتج ہوتا ہے۔ کیا اس ڈھانچہ کو تبدیل کئے بغیر اللہ کی حاکمیت کا تصوّر کیا جا سکتا ہے؟ اور اگر کیا جا سکتا ہے تو کیسے؟

۱۴۔ فرض کیجئے ہماری اسمبلی شریعت بِل کو جوں کا توں اور پورے کا پورا منظور کر لیتی ہے۔ اس صورت میں بالادستی اسمبلی کی ہوگی یا شریعت کی؟ کیا آپ یہ پسند فرمائیں گے کہ شریعتِ اسلامیہ اپنے نفاذ کے لئے اسمبلی کی محتاج ہو؟

۱۵۔ اسلام سے پیشتر دنیا میں جمہوریّت کا تجربہ ہو چکا تھا۔ اگر یہ کوئی اچھی چیز تھی تو اسلام نے اس کی سرپرستی کیوں نہیں کی؟ اور عوام پر عوام کی حکومت کی بجائے اللہ کی حاکمیّت پر کیوں زور دیا گیا ہے؟

کتابیات

١۔ قرآن کریم — تراجم و تفاسیر حسب ضرورت

٢۔ بخاری، مسلم، مشکوٰۃ اور دیگر کتبِ احادیث حسب ضرورت

٣۔ تاریخ طبری — حافظ ابن جریر طبریؒ

٤۔ البدایہ والنہایہ — حافظ ابن کثیرؒ

٥۔ کتاب الخراج — امام ابو یوسفؒ

٦۔ تاریخِ اسلام — اکبر شاہ خاں نجیب آبادیؒ

٧۔ الفاروق — شبلی نعمانیؒ

٨۔ اصولِ سیاسیات — پروفیسر صفدر رضا

٩۔ تحریک آزادی و دستورِ پاکستان — فاروق اختر نجیب

١٠۔ کتابِ شہریت — پروفیسر محی الدین

١١۔ تعارفِ مدنیت — پروفیسر محمد امین جاوید

١٢۔ اسلام میں خلیفہ کا انتخاب — ڈاکٹر محمد یوسف پی۔ایچ۔ڈی

١٣۔ خلافت و ملوکیت — ابوالاعلیٰ مودودیؒ

١٤۔ خلافت و ملوکیت — حافظ صلاح الدین یوسف

١٥۔ جمہوریت کے تقاضے — ابوالکلام آزادؒ

١٦۔ اسلام میں مشورہ کی اہمیت — مفتی محمد شفیع۔ کراچی

مولانا عبدالرحمٰن کیلانی رحمہ اللہ کی دیگر تصنیفات

تیسیر القرآن (اردو) : سلفی منہج کے عین مطابق، منکرین حدیث اور دیگر عقائد باطلہ کا مکمل رد، اور تمام آیات کی صحاح ستہ کی صحیح احادیث کی روشنی میں تفسیر۔ (4 جلدیں)

مترادفات القرآن: مترادفات القرآن کے ذیلی فرق کو مستند کتب لغت اور قرآنی آیات سے واضح کیا گیا ہے۔اس موضوع پر قرآن کریم کی اردو میں پہلی لغت ہے۔

آئینہ پرویزیت: پرویزیت کے جواب میں ایک مدلل اور لاجواب کتاب ہے۔

شریعت وطریقت: تصوف کی تاریخ پر بحث کی گئی ہے، نیز وحدت الوجود، وحدت الشہود اور حلول کیا ہے؟ اور طریقت، کا باطنی نظام کیا چیز ہے؟ اور کیا طریقت شریعت کے تابع ہے یا اس کے متوازی اور اس سے متصادم ایک الگ دین ہے؟

الشمس والقمر بحسبان: اس کتاب میں علم ہیئت، ہجری اور عیسوی تقویم میں دن معلوم کرنے کے طریقے اور 622ء (1ھ) سے لے کر 2522ء (1680ھ) تک کی تقابلی تقویم پیش کی گئی ہے۔

خلافت وجمہوریت: جمہوریت عصر حاضر کا سب سے بڑا بت ہے۔کتاب وسنت سے ثابت کیا گیا ہے کہ اسلام اور جمہوریت دو متضاد چیزیں ہیں جن میں اتحاد ناممکن ہے۔

تجارت کے احکام ومسائل: لین دین کے معاملات میں کئی ایسے امور شامل ہو گئے ہیں جو شرعاً ناجائز ہیں اکل حلال کی اہمیت واضح کرنے کے بعد دور حاضر کے جدید معاشی مسائل پر کتاب وسنت کی روشنی میں محاکمہ کیا گیا ہے۔

عقل پرستی اور انکار معجزات: قرآن مجید میں مذکور معجزات کا عقل کی بنیاد پر رد کرنے والوں کی تاویلات اور ان کے عقائد پر بحث کی گئی ہے۔

عذاب قبر اور سماع موتیٰ: متعلقہ موضوع پر نہایت اہم اور معلوماتی کتاب ہے۔مختلف مکاتب فکر کے افکار ونظریات کا مدلل جواب دیا گیا ہے۔

احکام ستر وحجاب: اس کتاب میں تہذیب حاضر کا پس منظر، ستر وحجاب کا فرق، چہرہ اور ہاتھوں کا پردہ اور مستشرقین کے اعتراضات کے جوابات پر بحث کی گئی ہے۔

اسلام میں دولت کے مصارف: اس میں زائد از ضرورت دولت کی جائز اور ناجائز صورتیں نیز جاگیرداری کی کہاں تک گنجائش اور مزارعت کن صورتوں میں جائز ہے، کی تفصیل ہے۔

ناشر: مکتبۃ السلام سٹریٹ 20 وسن پورہ لاہور
فون: 7280943

خلافت و جمہوریت

آج کل دُنیا کے بیشتر ممالک میں جمہوری نظام رائج ہے اور جمہوریت عصرِ حاضر کا سب سے بڑا بُت ہے جسے توڑے بغیر اقامتِ دین کا فریضہ بجا لانا ممکن نہیں مگر مشکل یہ ہے کہ ہم نفاذِ اسلام کی نیک آرزوؤں کے ساتھ ساتھ جمہوریت کو بھی گلے لگائے رکھنا ضروری سمجھتے ہیں۔ اِس کتاب میں کتاب و سُنّت سے یہ ثابت کیا گیا ہے کہ اسلام اور جمہوریت دو ایسی متضاد چیزیں ہیں جن میں سمجھوتہ ناممکن ہے۔ آخر میں اسلامی نظریاتی کونسل اور وفاقی شرعی عدالت کے سوالنامو ں کے جوابات اور دینی رہنماؤں سے چند سوالات بطورِ ضمیمہ شامل کئے گئے ہیں۔

ڈسٹری بیوٹر

دارالسلام
پبلشرز اینڈ ڈسٹری بیوٹرز
الریاض ہیوسٹن لاہور